

۱۰۶۶  
اسلام

# ایک نظریہ۔ ایک تحریک

تصنیف

مریم حمید

مترجم

آبادشاہ پوری ایم اے

مکتبہ یوسفیہ

سنت نگر۔ لادسور

(جمہ حقو ق بحق ناشر محفوظ ہیں)

مکتبہ یوسفیہ سنت نگر لاہور

DA-1

RED

محمد یوسف خان

طابع

ایڈگریں پریس - لاہور

مطبع

۳۰۰۰

اکتوبر ۱۹۶۹ء

اشاعت اول

۱۰/- روپے

قیمت اعلیٰ ایڈیشن

۷/- روپے

ستا ایڈیشن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## تعلیمات قرآنی

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَعْلَمُ  
تَتَّقُوا الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ  
مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ  
تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ: ۲۱-۲۲)

”اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور ان سب کو جو تم سے پہلے ہو  
گزرے ہیں پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہاری خاطر زمین کا فرش  
بچھایا اور آسمان کی چھت بنائی اور اوپر سے پانی برسایا، اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی  
پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا، پس ان باتوں کے علم کے بعد کسی کو اللہ کا مد مقابل  
نہ ٹھیراؤ۔“

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّنْكُمْ ثُمَّ  
يُخَيِّبْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (البقرہ: ۲۸)

”تم لوگ اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اُس  
نے تم کو زندگی عطا کی پھر وہی تم پر موت طاری کرے گا، پھر وہی تم پر دوبارہ زندگی عطا کریگا،



پھر تم اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ خَيْرًا لِّدِينِهِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ  
مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (آل عمران: ۸۵)

”جس نے اسلام کے سوا کسی اور دین (نظامِ حیات) کو اختیار کرنا چاہا، اُس کا وہ  
دین (نظامِ حیات) ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔  
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ أَوْلَى الْكِتَابِ لَئِنْ كَانَ خَيْرًا لَّهُمْ  
مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَ أَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

”تم (اے مسلمانو!) وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے برپا کیا گیا  
ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اگر اہل کتاب  
(یہودی اور عیسائی) بھی ایمان لے آتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ  
تو مومن بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ  
الْمُؤْمِنِينَ أَنْ تَجْعَلُوا بِاللَّهِ عَيْنَكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا۔

(النساء: ۱۴۴)

”اے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست نہ بناؤ۔  
کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کی صریح حجت اپنے خلاف قائم کر دو۔“

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى  
الدِّينِ كُلِّهِ وَكَوْكَرَ الْمُشْرِكُونَ۔ (التوبة: ۳۳)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ  
اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ  
مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ  
تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

(النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں  
کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر کسی معاملے میں تمہارا آپس میں نزاع  
ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور رسول پر  
ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ عمل ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔  
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ

أَمْرًا أَنْ يَتَكُونُوا لَكُمْ خَيْرٌ مِنْ أَمْرِهِمْ وَأَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ  
وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔ (الاحزاب: ۳۶)

”کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس  
کا رسول کسی کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنی رائے کو اس میں دخل دیں اور جو اللہ اور اس  
کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

الْيَوْمَ يَجِيءُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ  
فَخَشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ  
رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدہ: ۳)

آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے، لہذا تم ان سے  
نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی  
نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر  
لیا ہے۔

## فُرُودَاتِ رُسُولٍ

حضرت ابو ہریرہ رضی روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ أَطَاعَنِي وَخَلَّ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ آبَى۔ (بخاری)

”جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے جنت میں جانے سے انکار کیا۔“

حضرت جابر رضی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُخَدَّعَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ

ضَلَالَةٌ۔ (مسلم)

”بلاشبہ بہترین ذکر اللہ کی کتاب ہے اور بہترین رہنمائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی رہنمائی ہے۔ بدترین امور دین میں اختراع کردہ باتیں (بدعات) ہیں اور ہر

بدعت گمراہی ہے۔“

حضرت عائشہ رضی کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ أَخَذَ ثَمَرًا فِي أَمْرٍ هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہ)



”جس نے ہمارے اس کام (اسلام) میں کوئی نئی بات داخل کی، جس کا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ مردود ہے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (مسند ابن حنبل۔ سنن ابوداؤد)

”جس نے دوسرے لوگوں (یعنی کافروں) کی مشابہت اختیار کی، اُس کا شمار انہی میں ہوگا۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً  
وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عَمِيَّةٍ يَغْضَبُ لِعَصْبِيَّةٍ أَوْ يَدْعُو لِعَصْبِيَّةٍ  
أَوْ يَنْصُرُ عَصْبِيَّةً فَقَتْلٌ فَقَتْلٌ جَاهِلِيَّةٌ (مسلم)

”جس نے قلاوۃ اطاعت اپنی گردن سے اتارا اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے۔ اور جس نے اندھی قومی عصبیت کا پرچم اٹھایا اور اس کے نیچے لڑتا ہوا مارا گیا تو اُس کا قتل جاہلیت کا قتل ہوگا۔۔۔۔۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اسْتَعُوا وَآطِعُوا وَإِنْ اسْتُعِلَّ عَنْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَانَ

وَأَسَدُ زَيْنَبَةَ (مسلم)

”سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا حکمران کسی حبشی غلام کو بنا دیا جائے جس کا سر انگور کی مانند چھوٹا ہو۔“

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةٌ حَقٌّ عِنْدَ سُلْطَانٍ تَجَارِيْرٍ  
(ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

”بہترین بہادور ملکہ حق ہے جو کوئی شخص کسی ظالم حکمران کے سامنے کہتا ہے۔“  
حضرت نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

لَا طَاعَةَ لِمُتَغَلُّوثٍ فِي مَعِيَّةِ الْخَافِقِ -

”خافق کی مصیبت میں کسی غلوثی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُلَیْجُ الْفَارَ وَجِلٌ بَلْكَ مِنْ تَعْقِیْبَةِ اللَّهِ حَتَّى يَعُوذَ اللَّبِیْثُ فِي الْمَقَرِّحِ وَلَا يَجْتَمِعُ عَلَى عَابِیْ خُبَارٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَدَفَائِ جَهَنَّمَ -

دترمذی)

”جو شخص خشیت الہی سے روٹتا ہے اُسے اُگ میں نہیں ڈالا جائے حتیٰ کہ وہ ہاتھ اور  
دورہ تصق میں واپس چلا جائے اور کسی شخص پر اللہ کی راہ میں اُڑنے والا گرد و مٹی اور  
جہنم کا دھواں جمع نہیں ہو سکتا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا -

لَا يُؤْذِیْ مَنْ أَحَدٌ كَرَّحَتْهُ أَكْوَافُ أَحَبِّتِ الْیَدِ مِنْ وَالِیْہِ وَدَلِیْہِ

والنَّاسِ أَجْمَعِیْنِ - (بخاری)

”تمہاری سے کوئی شخص اُس وقت صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس

کے نزدیک اُس کے باپ، اُس کے بیٹے اور تمام ذریعہ انسانی سے زیادہ محبوب نہ بن

جاؤں۔“



# مندرجات

۱۳	دیباچہ
۱۵	۱۔ تعارف
۱۷	یہودیت سے اسلام تک
۳۱	مسیحی لادینیّت اسلامی اقدار کی روشنی میں
۴۱	”محمدی دنیا“ — اسلام کے متعلق ایک مثالی غلط بیانی
۵۱	۲۔ اسلام — ایک نظریہ
۵۳	مسلمان ذہن
۶۳	اسلام اور ذہنی صحت
۸۳	اسلام اور صفائی پسندی
۹۳	اسلامی اور مسیحی آداب کا تقابل
۱۰۷	اسلام اور عرب تہذیب
۱۱۱	اسلام اور فتنی کاوش
۱۲۱	مسلمان عورت — معاشرے میں اس کا کردار
۱۲۹	مسلمان عورت کی آزادی اور اسلام
۱۳۹	مسلمان ماں کے فرائض
۱۴۵	اسلامی جماعت کے لوازمات
۱۵۷	۳۔ اسلام — عمل کے میدان میں

علماء کون ہیں ؟

۱۵۹ ۱۶۳ - ۱۶۲ ۱۹۱ ۱۹۶ ۲۰۳ ۲۱۹ ۲۳۱ ۲۳۶ ۲۴۵ ۲۵۳ ۲۶۶ ۲۸۱ ۲۹۹ ۳۲۹ ۳۴۴ ۳۴۹ ۳۸۵ ۳۸۹

۱۶۳ - سنوسی تحریک

شاہ ولی اللہ

سید احمد شہید

شہزادہ سعید حلیم پاشا

بدیع الزماں سعید نورسی

سید جمال الدین افغانی

سید رشید رضا اور تحریک منار

شیخ حسن البنا

الاخوان المسلمون

محمد علی جوہر

پیغام اقبال

مولانا سید ابوالاعلیٰ امجدادی

جماعت اسلامی پاکستان

۲- حاصل بحث

اسلام اور دنیا کے مغرب میں تبلیغی جدوجہد

اہل علم کا فرض

اسلامی نشاۃ ثانیہ کے امکانات

— وہ مضامین جو باقیہ بالکل نئے لکھے گئے ہیں یا ان میں اضافہ کیا گیا ہے۔





اسلام محض ایک گزرا ہوا تاریخی اتفاق نہیں ہے جس کی صورت گری ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بنجر اور دیران ماحول نے کی تھی، بلکہ وہ زمان و مکان سے ماوراء ایک عالمگیر ابدی الہامی صداقت ہے۔ اسلام نہ تو دوسرے مذاہب کی طرح کوئی مذہب ہے اور نہ وہ ان پرانی تہذیبوں کے مانند کوئی طریق زندگی ہے جو مدت گزری اپنی سماجی افادیت کھو چکی ہیں، بلکہ کل کی طرح آج بھی وہ ایسی واحد شاہراہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا میں بھی صحت مند اور توانا زندگی اور خوش حالی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور آخرت میں بھی۔



۴



## پیش لفظ

زیر نظر کتاب از مسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ کی ایک قابل قدر تصنیف

(Islam in Theory and Practice)

کا ترجمہ ہے۔ موصوفہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہو کر اہل علم اور اربابِ نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب وقت کے ایک اہم ترین موضوع سے بحث کرتی ہے۔ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنفہ نے اپنے اُس اعتقادی سفر کی داستان بیان کی ہے جو انہوں نے یہودیت کی تاریکی سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آنے کے لیے کیا۔ ساتھ ہی مسیحی لادینیت کا اسلامی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور عالم اسلام اپنے فکر و عمل سے اسلام کی جو غلط نمائندگی کر رہا ہے اور اس کے جو نتائج مرتب ہو رہے ہیں اُس پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

دوسرے حصے میں انہوں نے اسلام کے نظریاتی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اسلام انسان کے ذہن و عقل پر کس طرح صحت مندانہ اثر ڈالتا ہے، کیسی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے، کس نوعیت کے آداب و اطوار دیتا ہے، اُس کی تہذیب و ثقافت کا حقیقی رنگ کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں کس قسم کی رہنمائی دیتا ہے، مسلمان عورت کو معاشرے میں کون سا مقام عطا کرتا ہے اور اسلامی معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے کن امور کو ضروری قرار دیتا ہے؟ ان سوالات پر بڑی فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں دنیا سے اسلام کی ان تمام تحریکوں کا جائزہ لیا ہے جو اٹھارہویں صدی سے اب تک اسلام کو عملاً برپا کرنے کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ ان

اسلامی شخصیتوں کی جدوجہد کا تجزیہ بھی کیا جنہوں نے اس مقصد کے پیش نظر کام کیا اور مسلمان معاشرے کے فکر و ذہن پر گہرے اثرات ثبت کیے۔

آخری حصے میں مغربی دنیا میں اسلام اور مشنری تحریکوں کی سعی و جدوجہد کا جائزہ لیا ہے۔ اہل علم مسلمانوں پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے، اس کا ذکر کیا ہے اور اس بات سے بحث کی ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات کس حد تک ہیں۔ مختصر یہ کہ پوری کتاب اپنے اندر فکر انگیز مباحث رکھتی ہے۔ مصنفہ کی راست فکری اور غیر معمولی ذہن بجاتے خود ان یقینی مسلمانوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے جو اسلام کا مطالعہ اور اس کا دفاع و سخت مددگار ذہنیت سے کتے ہیں۔ مصنفہ کا دل اس جوش و جذبے اور عقیدت سے پوری طرح معمور ہے جو ہر زمانے میں نو مسلموں کی سب سے بڑی خصوصیت رہی ہے اور اس کا اظہار ان کی اس کتاب میں بھی ہوتا ہے۔ فکر و نظر کی طرح مصنفہ کا انداز بیان بھی واضح، مؤثر اور دل نشین ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ بنیادی طور پر ترجمہ ہی رہے، لیکن زبان و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصل تحریر میں جو تین اور جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ ترجمے میں بھی برقرار رہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ ایک اور مقامات پر ناگزیر سمجھتے ہوئے خواہشی بھی دے دیے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

آباد شاہ پوری

۲۹ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ

مطابق

۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ

یہ کتاب مختلف مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ان تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے لیے قلمبند کیے گئے ہیں جو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سچا مسلمان اسلام کو کس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک اپنے دین کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ نیز ان مقالات کا مقصد ان نسلی مسلمانوں کو صحیح اسلام سے رُوشناس کرنا ہے جو اپنی مغربی تربیت کی بدولت بے آمیزش یقین و اعتقاد سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اسلامی تعلیمات کی کسی جامع و وسیع تحقیق پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ یہ کام بہت سے مسلمان علماء و علما نے کیا ہے۔

۱۱/۱۱/۱۱  
۱۱/۱۱/۱۱  
۱۱/۱۱/۱۱



اس طرح یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جو نظام حیات دیتا ہے وہ محض ایک "ازکارِ رفتہ طاقت" نہیں ہے جس کی اختراعیت ایک ہزار برس پہلے ختم ہو چکی ہے، بلکہ اس کے

(۴) برعکس اسلامی نشاۃ ثانیہ کا شوق و جذبہ روز بروز قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ "حرفِ آخر"

میں دنیا بھر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے امکانات اور ان تدابیر کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس مشن کو حقیقت کا روپ عطا کرنے کی جدوجہد میں انتہائی مدد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا انگریزی ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں اس پر نظر ثانی کی گئی، بعض نئے مقالات لکھے گئے اور بعض میں حذف و اضافہ کیا گیا۔ اردو ترجمہ اسی دوسرے ایڈیشن کا پیش کیا جا رہا ہے۔

مریم جمیلہ

(سابقہ مارگریٹ مارکس، نیویارک)

لاہور

۲۵ جمادی الاول ۱۳۸۷ھ

مطابق

یکم ستمبر ۱۹۶۷ء

فیصلہ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ ایک اور مقامات پر ناکزیر جھٹے ہوئے حواسی جی دے دیے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

آباد شاہ پوری

۲۹ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ

مطابق

۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

~~ARAF~~



*Shame*  
21.12.11  
AD





## یہودیت سے اسلام تک

بہت چھوٹی عمر ہی سے مجھے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ یہودی ہونے سے کیا مراد ہے۔ یہ اشتیاق پہلے پہل غالباً ایسٹر کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ایسٹر کے دن آتے تو میرے مسیحی ہم جماعت مجھے ”مسیح کی قاتل“ کہنا شروع کر دیتے۔ ایسٹر گزرتے ہی گویا معجزہ رونما ہو جاتا۔ وہ لوگ یکسر بدل جاتے اور سال کے باقی دن بڑے خوش گوار اور دوستانہ ماحول میں گزرتے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک چھوٹے سے رومن کیتھولک ہم جماعت سے اس طرزِ عمل کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں پادری صاحب نے کہا تھا۔

اسی زمانے میں اخبارات میں اور ریڈیو پر جنگ کی خبریں پے درپے آئے لگیں دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو میں پانچ برس کی تھی اور جب ختم ہوتی تو گیارہویں برس میں بارہی تھی۔ ہٹلر کی نازی حکومت کے ہاتھوں لاکھوں یہودیوں کے استیصال کی خبریں بڑی ہی وحشتناک اور روح فرساتھیں اور کم سنی کے باوجود میرے ذہن پر ایک مستقل نقش چھوڑ گئیں۔ پھر میری اور دوسری غیر یہودی ہم جولیوں کی ظاہری شکل و صورت میں بھی خفیف سا مگر نمایاں فرق تھا۔ ان ساری باتوں نے مجھے یقین دلادیا کہ یہودی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں سے ”مختلف“ ہیں اور ہمارا اس معاشرے سے فی الواقع کوئی تعلق نہیں ہے جس کا ہم



ہمارے کالی سیاہ وارھی والے استاد بڑے سخت گیر تھے۔ نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک لمبا موٹا ڈنڈا ان کے ہاتھ میں ہوتا اور سست اور کام چور شاگردوں کی خبر لینے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔ پھر سینا گانگ کے ماتمی گیت تھے جنہیں ہم ہمیشہ اندوہ گیس لے میں گایا کرتے تھے۔ یہ سارے تجربات ہر چند میرے بچپن کا اہم حصہ بن چکے تھے، لیکن میرا گھرانہ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ میں ایک کٹرنڈ ہی گھرانے میں نہیں، "اصلاح یافتہ" گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جو مسیحی معاشرہ میں بڑی حد تک جذب ہو چکا تھا۔ میرے والدین یہودی شریعت پر عمل کرتے تھے نہ میرے قریبی رشتہ دار۔ امریکہ میں بسنے والے یہودیوں کی غالب اکثریت اصلاحی ہے، مگر ان کے برعکس ہمارا گھرانہ جرمین تھا۔ ہم لوگ دسیوں کی طرح جبر و تشدد اور قتل عام کے نکلے ہوتے نہ تھے بلکہ سو سو سال پہلے اقتصادی ترقی کی تلاش میں اپنی مرضی سے امریکہ چلے آئے تھے۔ مشرقی یورپ کے یہودیوں کی طرح جرمنی کے یہودی غیور کی الگ تنگ زندگی سے نکل کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ مسیحی معاشرہ میں ضم ہو چکے تھے میری پڑائی جو شکل و صورت میں جرمین خواتین کی طرح حسین، دراز قامت اور گورے رنگ کی تھیں، اگر مس ہمیشہ بڑی دھوم دھام سے مناتی تھیں۔ اس تقریب پر وہ اپنے بیٹے بیٹیوں اور ان کے بچوں کو بڑے اہتمام سے تحفے تحائف دیتیں اور بڑا سا شجرہ سعید آراستہ کرتی تھیں۔

ہم اصلاح یافتہ یہودی اپنے عبادت خانوں کو "سینا گانگ" (Synagogue) نہیں ٹپیل (Temple) کہا کرتے تھے۔ ان ٹپیلوں میں عبادت پر ڈسٹنٹ عیسائیوں کے طرز پر ہوا کرتی۔ تربیت یافتہ پیشہ ور مرد و زن کا مخلوط طائفہ مشہور و معروف مسیحی مناجاتیں بڑی سرٹلی دھن میں گاتا۔ اس طائفے میں متعدد مسیحی بھی ہوتے۔ مناجاتوں کے وہ سارے الفاظ بدل ڈالے گئے تھے جن سے یہودی حاضرین اجتماع کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ ہماری دعائیں تقریباً سب کی سب انگریزی زبان میں تھیں۔ ان میں عبرانی کے الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو احکام راسخ الاعتقاد یہودیوں کے نزدیک واجب العمل تھے ان کی پابندی ہمارے لیے لازمی نہ تھی۔ اصلاح یافتہ رہنا انہیں فرسودہ اور جدید زندگی



کے لیے بیکار سمجھتے تھے۔ ہمارے گھر کی فضا پڑوس کے مسیحی گھروں سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ ہم بھی راسخ الاعتقادی سے اتنے ہی بیگانہ تھے جتنا کہ ہمارے پڑوسی۔ بس ایک چیز نے ہمارے یہودی تشخص کو معدوم ہونے سے بچا رکھا تھا اور یہ بات بجا تے خود حیران کن تھی۔ مسیحی معاشرہ میں "انضمام" کے باوجود ہم لوگوں میں مسیحیوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج نہ تھا۔ اسی طرح ہمارے معاشرتی تعلقات بھی اپنی ہی نسل و قوم تک محدود رہتے۔

مجھے اصلاح یافتہ یہودیت سے سخت نفرت تھی۔ میرے نزدیک وہ جدید مغربی زندگی کا رنگ و حنک اختیار کرنے کی کوشش میں کھوکھلی اور بے معنی باتوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ مقدس شریعت سے کلیتہاً اعراض کے نتیجے میں اس کے پیرو محض برائے نام یہودی تھے۔ تحریک اصلاح نے فی الحقیقت یہودیت کو اس کی روح اور معنویت سے عاری کر دیا تھا اور نام کے سوا اس کے دامن میں کوئی شے باقی نہ چھوڑی تھی۔ اکثر اصلاح یافتہ یہودی، جنہیں میں جانتی تھی، ملحد تھے۔ یہ لوگ چند ایک یہودی رسوم سے محض عادات، خاندانی روایات یا معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر چپے ہوئے تھے۔

تحریک اصلاح کا مقصد ان یہودیوں کو گردیدہ بنانا اور سنبھالنا تھا جو بصورت دیگر مسیحی معاشرہ میں اس طرح مدغم ہو جاتے کہ یہودی تشخص کا کوئی نشان باقی نہ رہتا، چنانچہ یہودیت کو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ہم عصر امریکی زندگی کے مطابق بنا دیا گیا۔ تحریک اصلاح کے اس تصور کا جلتی بودا پن مجھ پر جلد ہی آشکارا ہو گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ تحریک یہودیوں کے ثقافتی انضمام کو روکنے میں نہ صرف ناکام رہی ہے بلکہ اس نے اٹل اس عمل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ تارک وطن یہودیوں کی پہلی پود، خصوصاً وہ جو مشرقی یورپ سے تعلق رکھتی تھی، اپنے عقائد میں بڑی پختہ، پر جوش اور مخلص تھی تاہم ان کے بچوں کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے پبلک سکولوں میں تعلیم پائی تھی اور امریکی طرز زندگی کو اپنایا تھا۔ یہودی قانون اور

مذہبی مراسم عام فضا میں اس قدر اجنبی بن گئے تھے کہ جب بزرگوں نے ان قوانین و رسوم کو اپنی نوخیز نسل پر بھرنافذ کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے قوانین و رسوم اور بزرگوں کے اقتدار دونوں کے خلاف بغاوت کر دی، تاہم "یہودی ہونے" کے تصور سے اُن کی وابستگی بڑی گہری تھی اس لیے یہودیت کو کامل طور سے خیرباد کہہ دینے کے بجائے وہ اصلاح یافتہ ٹیل کے رکن بن جاتے۔ اس سے اُن کی معاشرتی حیثیت بھی قوم کی نظریں خاص بڑھ جاتی کیونکہ اصلاح یافتہ ٹیل میں شرکت کے لیے روپیہ درکار تھا اور رکنیت صرف بالائی طبقات تک محدود تھی۔ تیسری نسل نہ صرف یہودیت کی روح اور اس کے مضمرات بلکہ نام کو بھی ترک کر دینے کے لیے بے قرار تھی، چنانچہ جب میں جوانی کی عمر کو پہنچی تو میرے والدین اُس آخری رکاوٹ کو بھی رفع کر چکے تھے جو انہیں غیر یہودی قوم سے الگ کرتی تھی۔ وہ ایک لاادری (Agnostic) انسان دوست تنظیم ایتھیکل کلچرل سوسائٹی (Ethical Cultural Society) میں شامل ہو گئے۔ چند سال بعد وہ اس تنظیم سے اس لیے غیر مطمئن ہو گئے کہ اس کے ارکان کی غالب اکثریت یہودی نژاد تھی، چنانچہ ایک نواحی یونیٹریں چرچ (Unitarian Church) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اگرچہ اس چرچ نے مسیحیت کی ظاہری سچ و سچ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا تاہم اس کے تصورات ایتھیکل کلچرل سوسائٹی سے مماثل تھے۔ میری بڑی بہن نے جب دیکھا کہ امی اور ابا یونیٹریں بن کر بے حد مطمئن اور مسرور ہیں تو اس نے بھی فوراً اپنے شوہر سمیت ان کی پیروی کی۔ اس کے دو بچے غالباً اب اپنا شمار کبھی یہودیوں میں نہ کریں گے حتیٰ کہ ان کے نام سے بھی ظاہر نہ ہوگا کہ وہ ایک یہودی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح جذب و انضمام کا عمل مکمل ہو گیا۔

اصلاح یافتہ یہودیوں میں یہ مفروضہ عام ہے کہ یہودی مظلوم و ستم رسیدہ قوم اس لیے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے "مختلف" ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس اختلاف

کو رفع کر دیا جائے تو ساری عداوت اور آویزش جاتی رہے گی۔ میں نے اس طرز استدلال کو کبھی موثر نہ پایا۔ خصوصاً جب کہ مجھے خوب علم تھا کہ ہٹلر کی نازی حکومت کے تحت انسانی باڑوں (concentration camps) میں جو ۶۰ لاکھ سے زائد یہودی مارے گئے تھے ان کی اکثریت اسی طرح کا ملاء ضم شدہ "مٹی جس طرح کہ ہم۔

یہودیوں اور عربوں کی باہمی قرابت میرے لیے بچپن ہی سے مسحور کن تھی۔ یہودی کتابوں میں میں نے پڑھا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ان دونوں قوموں کے باپ ہیں۔ یہودی ان کے بیٹے اسحاق (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اور عرب اپنا سلسلہ نسب اُن کے بڑے بیٹے اسمعیل (علیہ السلام) کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک افسانہ تھا یا حقیقت؟ امریکہ میں "سامی دشمنی" کی اصطلاح یہودیوں سے نفرت اور بغض و عناد کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ اس لفظ کا اطلاق کبھی عربوں کے سلسلے میں نہیں ہوا، تاہم جغرافیہ خصوصیات، طبعی میلیت اور تہذیب و ثقافت کی اصطلاح میں عرب کہیں زیادہ خالص "سامی" ہیں۔

یورپ میں صدیوں اقامت کی وجہ سے یہودیوں کی ارتقی خصوصیات کی طرح عربوں کے ساتھ رشتہ داری کا رنگ بھی اگرچہ پیکا پڑ چکا ہے تاہم اساسی طور پر یہ یک جدی قرابت اب تک باقی ہے۔ میں بہت سے یہودیوں کو جانتی ہوں اور ان میں سے بعض میرے اپنے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو خد و خال کے اعتبار سے بالکل عرب نظر آتے ہیں۔ ایسے عرب جو اگرچہ

بطور مفروضہ ہی سہی، خالص یورپی نژاد ہوں۔ ۱۶۲۰۹

۱۹۴۸ء کی جنگِ فلسطین کے دوران امریکہ میں صہیونی پروپیگنڈا اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے صہیونیوں کے حق میں راستے عامہ کو ہموار کرنے کیساتھ ساتھ عربوں کے کینحلاف نفرت کی آگ بھڑکانے کی منظم مہم انتہا پر تھی۔ میں نے صہیونی پروپیگنڈے کی فریب کاری اور بڑے پن کو خود بخود بھانپ لیا۔ عربوں کے ساتھ میری روز افزوں ہم آہنگی سے میرے گھر والے دہشت زدہ ہو گئے۔ عربوں کی تاریخ اور ان کی تہذیب و ثقافت



سے متعلق سپیک لائبریری میں جس قدر کتابیں طبع میں نے پڑھ ڈالیں۔ باوجودیکہ ان کتابوں کے اکثر مصنفین کاتب و لہجہ غیر ہمدردانہ بلکہ بڑی حد تک معاندانہ تھا۔ ان کے مطالعے سے مجھے یقین ہو گیا کہ عربوں کے خلافت صہیونیوں کا پروگینڈا یکسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ ان دنوں میں عربوں کے متعلق جو بات بھی پڑھتی اس سے از حد متاثر ہوتی حتیٰ کہ ٹیک و خصوصیات جو ایک عام یورپی اور امریکی کو ناگوار گزرتی ہیں مجھے دل کش معلوم ہوتی تھیں۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ اس عرصے میں بتدریج یہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہو گئی کہ عربوں نے اسلام کو سہ بلند نہیں کیا بلکہ اسلام نے عربوں کو عظمت عطا کی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو عرب آج قطب شمالی کے سیکمہ اور جنوبی افریقہ کے زولو قبائل کی طرح گمنام اور پردہ تاریکی میں مستور ہوتے۔ اسی طرح قرآن کریم عربی زبان میں نازل نہ ہوتا تو آج عربی اگر ناپید نہیں تو دنیا کی غیر اہم اور بے مایہ زبانوں میں شمار ہوتی۔ چونکہ ہمارے رسول پاک عرب تھے اور قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اس لیے دنیا کا ہر مسلمان خواہ وہ کسی قوم اور نسل سے تعلق رکھتا ہے، ثقافت کے اعتبار سے عرب ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

”عربوں سے تین امور کی بنا پر محبت کرو۔ میں عرب ہوں، قرآن

کریم عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔“ (بیہقی)

ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلام کی ان ہدایات کو رد کر دیتے ہیں جو عرب ماخذ کی مظہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہدایات مقامی نوعیت کی ہیں اور اس خاص دور کی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بود و باش رکھتے تھے۔ اُس سوسائٹی کے لیے تو یہ معقول اور صحیح تھیں، لیکن اب فرسودہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے انہیں ترک کر دینا چاہیے، تاہم سچے اور مخلص مسلمانوں کے نزدیک حضور کا

✓ عرب ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ اللہ چاہتا تو ہمارے نبی آخر الزمانی، رومی یا انگریز بھی ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں کو چھوڑ کر اگر ایک عرب کو خاتم القبیلین بنایا تو اس کی اس مشیت کے پیچھے یقیناً کوئی معقول سبب کار فرما تھا۔

یہودیت اور اسلام کے درمیان روحانی رشتہ اسلام اور عیسائیت سے زیادہ مستحکم اور گہرا ہے۔ یہودیت اور اسلام دونوں توحید کے قائل ہیں اور اس میں کسی قسم کی مصالحت یا دھننت روا نہیں رکھتے۔ دونوں شریعت الہی کی کڑی پابندی کو نہایت اہم سمجھتے ہیں اور اسے خالق کائنات کی اطاعت و محبت کا نشان قرار دیتے ہیں۔ دونوں پر وہیت گری، تجرد اور رہبانیت کو مسترد کرتے ہیں۔ اسی طرح عبرانی اور عربی دونوں زبانوں میں بڑی نمایاں اور مؤثر مشابہت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ روایاتی راسخ الاعتقاد یہودیت اور اسلام جو ثقافتی فضا اور ماحول پیدا کرتے ہیں وہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

نبویارک کی ربانوی درس گاہ میں تو رانت اور تلمود کی تلاوت کرنے والے ننھے لڑکے اپنے آپ کو کسی مسجد کے مکتب میں اجنبی محسوس نہیں کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس مقدس قانون پر بحث و تمحیص کرنے والے فاضل علماء کی مجلس میں ایک ربی خود کو اپنے گھر میں محسوس کرے گا۔

یہودیت میں مذہب قوم پرستی کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو چکا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ یہودیت کا لفظ "یہودا" سے ماخوذ ہے جو ایک قبیلے کا نام ہے۔ ایک یہودی یہودا قبیلے کا فرد ہوتا ہے۔ اس مذہب کے نام سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کوئی عالمگیر پیغام اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ کوئی یہودی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے اُس کے نازل کردہ پیغام پر ایمان رکھنے اور اُس کی پیروی کو تقاضائے ایمان سمجھنے کی بنا پر یہودی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے یہودی ہے کہ یہودی ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ اب چاہے

گھلے بندوں محمد بن جاسے اپنے یہودی بھائیوں کی نظر میں یہودی ہی رہے گا۔  
 اس فسادِ کامل نے قوم پرستی کے ساتھ بل کر یہودی مذہب کو روحانی طور پر مفلس و  
 قلاش کر دیا ہے۔ خدا پوری نوعِ انسانی کا خدا نہیں ہے بلکہ صرف اسرائیل کا خدا ہے۔  
 کتابِ مقدس اللہ کی نازل کردہ وحی نہیں ہے جو پوری نوعِ انسانی کی طرف بھی گئی  
 ہے بلکہ بنیادی طور پر یہودیوں کی تاریخ ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان  
 علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول نہ تھے بلکہ محض یہودی بادشاہ تھے۔ یہودیوں  
 کی نجات کا انحصار آخرت میں کامیابی پر اتنا نہیں ہے جتنا کہ فلسطین کی واپسی پر ہے۔  
 یہودی جس قدر تہوار مناتے ہیں، مثلاً: حنوکہ، پورم اور پساخ وغیرہ، سب مذہب  
 سے زیادہ قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ صرف ایک تہوار خالص مذہبی نوعیت کا ہے  
 اور وہ ہے یومِ کپور (یومِ کفارہ)۔ اس قوم پرستی ہی کی بنا پر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ  
 اور حضرت یحییٰ علیہما السلام پر ایمان لانے سے انکار اور انہیں بدعتی قرار دے کر  
 ذیل در سوا کیا، کیونکہ یہ حضرات جو عالمگیر پیغام دے رہے تھے وہ یہودیوں میں عام  
 پھیلے ہوئے قومی جذبے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے  
 بنی اسرائیل سے رسالت کا منصب لے لیا اور ان کے یک جدی قرابت داروں یعنی  
 عربوں کو عطا کر دیا۔

توقع کے عین مطابق یہودیوں نے ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان  
 کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا اور تشدد و دہشت سے مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول  
 ایک اُمّی عرب کو منتخب کر لیا تھا۔ یہ یہودیوں کی قومی خود پسندی پر ناقابلِ برداشت  
 ضرب تھی۔ اس ضرب کی شدت کا اندازہ آج بھی یہودیوں کی تحریروں سے کیا جاسکتا ہے:

(The Pictorial History of the Jewish People) کا مصنف  
 (Nathan Ausbel) لکھتا ہے:



مسیحیت کی طرح مذہب اسلام بھی، جس کی بنیاد محمدؐ نے ہاتھوں میں رکھی تھی، یہودی مذہب کی ایک شاخ تھا۔ یسوع کی طرح محمدؐ کے پیش نظر بھی کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنا نہ تھا۔ درحقیقت انہوں نے ”یہودی پیغمبر“ ہونے کا اعلان کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ یقین و اذعان تھا یا مصلحت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک محرک جس سے وہ کسی صورت بیگانہ نہ تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمدؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے آغاز میں عرب کے یہودی ان کی دعوت کے خصوصی مخاطب تھے۔ انہوں نے قرآن کے لیے بیانیہ مواد اور اصول و مبادی تلمود اور بدیش سے مستعار لیے، لیکن بڑے عجیب مسخ شدہ انداز میں۔ شعری دلفنوں سے بھرپور، سورتیں تالیف کرتے وقت انہوں نے آدم، ابراہیم، نوح، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، ایلیاہ، ایوب اور یونس وغیرہ کے قصص تواریث سے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جب مدینہ کے یہودیوں نے جو اپنی مقدس کتابوں سے اچھی طرح واقف تھے، ان کی تورات کا پُر فریب پردہ چاک کرنا چاہا تو محمدؐ نے پہلے تو ان کے ربوں سے زبردست بحث و تکرار کی اور پھر ان سے منہ موڑ لیا۔ فرشتہ جبریل دوبارہ ان کے پاس آیا اور قبلہ یرושلم سے مکہ تبدیل کر دینے کا حکم دیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ محمدؐ نے یہودیوں کی توہین آمیز زبانی باتوں کا انتقام قتل و غارت کی صورت میں لے لیا۔ عرب میں اگرچہ یہودیوں کی کثیر التعداد بستیاں تھیں اور سب کی سب بیحد مستحکم تھیں، لیکن انہوں نے ہوشیاری اور پے بہ پے خونخوار حملوں سے کام لے کر ان پر قبضہ کر لیا۔ ہزاروں یہودیوں کی گردن مار دی اور ہزاروں کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے۔“

چنانچہ اسلام اور اسلامی افکار و تصورات کے ساتھ میری روز افزوں ہم خیالی کو دیکھ کر میرے واقف کار یہودی غضب ناک ہو گئے۔ ان کے نزدیک میں نے اُن سے سخت دغا کی تھی۔ وہ مجھے بے غیرت قرار دیتے اور کہتے کہ میرا یہودیت سے انکار اپنی آبائی میراث اور یہودی قوم سے شدید نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھے متنبہ کرتے کہ میں نے مسلمان ہونے کی کوشش کی تو اہل اسلام مجھے کبھی دل سے قبول نہیں کریں گے۔ یہ خدشات کلیتاً بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آج تک کسی مسلمان نے مجھ پر یہودی النسل ہونے کی بنا پر انگشت نمائی نہیں کی جب میں مشرق باسلام ہونی تو مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے میرا خیر مقدم کیا اور اس طرح پیش آئے گویا میں انہی میں کی ایک فرد تھی۔

آج یہودی سب سے زیادہ اس بات پر سہمراقتدار بلند کرتے ہیں کہ وہ صدیوں مسلسل جبر و ظلم کی چکی میں پسے اور بے دردانہ ذبح کیے جانے کے باوجود پچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ یہ لاف زنی کرتے ہوئے بھی نہیں تھکتے کہ دوسری بے شمار قومیں جو دولت اور تعداد میں اُن سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں، صفحہ ہستی سے مٹ گئیں، لیکن اُن کا وجود بڑے ناتحانہ انداز میں باقی رہا۔ چونکہ یہودیت کا مذہبی پہلو کمزور پڑ چکا ہے اور خود یہودی بھی لادینییت اور مادہ پرستی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک یہودی پچ نکلے ہیں، مگر کس مقصد کی خاطر؟ میری مرز بوم میں ایک یہودی بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس سوال کا جواب دینا تو درکنار کبھی اپنے آپ سے پرچھنے کی زحمت بھی گوارا کی ہو۔ جیسا کہ ہر کہیں نئی روشنی کے یہودیوں کا نقطہ نظر ہے وہ لوگ بھی محض جیاتیاقی اور لادینی سیاسی مفہوم میں زندہ پچ رہنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسے ستم ظریفی ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ”ربانیوں“ ”خادمانِ دین“ اور ”خدا کے برگزیدہ بندوں“ کی رہ قوم ہے جس کا مقصد حیات دنیا کو خدا کی وحدانیت کے علم اور اس کے مقدس فرامین کے نور سے منور کرنا تھا۔





تھا۔۔۔۔۔ وہ راستہ جو ایک ایسی دنیا سے جو میری نہ تھی اُس دنیا  
کی طرف جاتا ہے جو فی الحقیقت میری اپنی تھی۔۔۔

---



---

— *The Road to Mecca*, Muhammad Asad (formerly  
Leopold Weiss), Max Rheinhart, London, 1954,  
pp. 49-50



# مسیحی لادینیت اسلامی اقدار کی روشنی میں

✓ مسیحیت نے لادینیت کو اصولاً اپنایا ہے اور یہی نہ پٹ سکے والی خلیج مسیحیت کو  
 (ج) اسلام سے الگ کرتی ہے۔ لادینیت سے مراد وہ فلسفہ ہے جو انسانی زندگی کے صرف  
 چند متفرق اجزاء پر مذہب کا حق اختیار تسلیم کرتا ہے اور اجتماعی زندگی سے متعلق معاملات  
 کو بالخصوص اس کے فیصلہ کن اثر سے خارج کر دیتا ہے۔ لادینیت جو مذہب کو انسان کے  
 خالص نجی اور انفرادی معاملے تک محدود رکھتی ہے، موجودہ مغربی تہذیب کی بنیاد اور اسلامی  
 اصول و مبادی سے مسیحیت کے ہر تجاویز اور انحراف کا سرچشمہ ہے۔

یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ شریعت الہی کے محافظ ہونے کا دعویٰ  
 کرتے ہیں یا کم از کم ان کے ہاں شریعت الہی کی اطاعت کا تصور باقی ہے۔ ان سے عظیم ترین  
 مہلک غلطی یہ سرزد ہوتی کہ انہوں نے اس شریعت کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ یہ نسل  
 پرستی اپنے نقطہ انتہا کو اس وقت پہنچی جب بائبلوں میں جلا وطنی کے بعد، نارس کے  
 کریم النفس بادشاہ سائرس کے زمانے میں یہودیوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی اور



ان کے رہنا غدرانے سامریہ کے ان یہودیوں کو یہودی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو فلسطین میں پیچھے رہ گئے تھے۔ سامریہ کے یہ یہودی تورات پر ایمان صادق رکھتے تھے، لیکن غدرانے انہیں صرف اس لیے کافر قرار دے دیا کہ انہوں نے غیر یہودیوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اگرچہ یسوع مسیح علیہ السلام کے پیروکار حقیقتاً ایزدی کو پوری نوع انسانی پر حاوی سمجھتے تھے، لیکن آخر کار ان کے اندر یہ تصور عام ہو گیا کہ یہودی قوم اور اغیار (gentile) کے درمیان مائل شدہ رکاوٹوں کو زائل کرنے کے لیے موسوی شریعت کو مسترد کر دینا لازمی ہے؟ چنانچہ انہوں نے پیغام کو فراموش کر دیا اور پیغمبر کی پوجا شروع کر دی۔

یہ فیصلہ کہ مسیحیت اپنے دور کی غالب تہذیب کا رخ متعین نہیں کرے گی، بلکہ وہ تہذیب مسیحیت کو خاص رخ پر چلائے گی، بڑے دور رس اثرات کا حامل تھا۔ اس نے مسیحیت میں لامحدود بدعتوں اور تحریفات کا دروازہ چرچٹ کھول دیا۔ نئے نئے عقائد مسیحیت میں داخل ہونے لگے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کا ذات باری میں متحد ہونے کا عقیدہ، یہ عقیدہ کہ خدا نوع انسانی کو اپنی رحمت و شفقت سے نوازنے کی خاطر اپنے بیٹے یسوع مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ عقیدہ کہ یسوع مسیح نے مصائب جھیل کر اور صلیب پر جان دے کر تمام

نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، حضرت آدم اور حوا کے ابتدائی گناہ کی بنا پر یہ عقیدہ کہ انسانی فطرت وراثتاً بدھے، تمام انسان گناہ گار پیدا ہوتے ہیں اور یسوع مسیح کے نجات دہندہ ہونے پر سچپتہ و کاملی ایمان انہیں نجات سے ہمکنار کر سکتا ہے، یہ سب مسیحی عقائد یہودی روایات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، چنانچہ مسلمان علماء کہتے ہیں کہ یہ عقائد کافروں کی ان مذہبی رسوم اور طور طریقوں سے ماخوذ ہیں جو رومی سلطنت کے طول و عرض میں عام طور پر مروج تھے۔ تصویروں اور مجسموں کی حرمت کے بارے میں موسوی فرمان کو یونان کی فنی روایات کے حق میں مسترد کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یسوع مسیح (علیہ السلام) کی الوہیت کے عقیدہ میں اور

زیادہ شدت اور غلو پیدا ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مسیحیوں کا عہد نامہ جدید  
 یسوع مسیح (علیہ السلام) کی اپنی زبان آرامی میں روحانیک اور سامی زبان ہے اور عبرانی اور  
 عربی سے گہرا رشتہ رکھتی ہے، کبھی قلم بند نہیں کیا گیا۔ یہ عہد نامہ پہلی مرتبہ یونانی زبان میں  
 مرتب ہوا۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ عہد نامہ جدید کے موجودہ تراجم میں یسوع مسیح  
 علیہ السلام کے تمام حواریوں کے نام یونانی اور لاطینی ہیں۔ گویا وہ اپنے عبرانی ناموں پر نام و  
 شرمسار تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ساؤل نے اپنا نام بدل کر پال  
 رکھیا تھا۔ گویا اُس نے اسرائیل کی عبرانی روایات کو مسترد کرنے اور یونانی اور رومی ثقافت  
 کو اپنانے کا واضح مظاہرہ کیا۔ اسی طرح عہد نامہ جدید کا ادبی اسلوب عبرانی صحائف کی اثر انگیز  
 سادگی سے عاری ہے۔ اس کے برعکس وہ اُس متصوفانہ سوفسطائیت سے ملبوس ہے جو  
 یونانی فلسفہ کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ مسیحیوں کے دو بڑے تہوار ————— کرمس  
 اور ایسٹر ————— اصلاً تمام تر کافر (PAGAN) تہوار ہیں۔ حتیٰ کہ نام نہاد مسیحی  
 کیلنڈر بھی اپنے کافر ماخذ کا پتہ دیتا ہے۔ یہی نہیں دنوں اور ہفتوں کے نام تک یونانی  
 اور رومی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ کلیسائی نظام حکومت بھی براہ راست  
 کافر رومی شہنشاہ ڈائیوکلشین کی انتظامی اصلاحات کے خطوط پر استوار کیا گیا اور آج تک  
 انہی پر قائم چلا آتا ہے۔ عالمی مسیحیت کی بھاری اکثریت کا مقدس ترین شہر یروشلم  
 نہیں کافر دما ہے۔ رومن کلیتہاً چرچ کی اصطلاح سے بڑھ کر بھی کوئی متناقض اصطلاح  
 ہو سکتی ہے؟

پرنسٹن تحریک اصلاح و تجدید کے بعد مسیحیت کا لادینی نظریہ یہودی ردایا  
 کی محدود مقامی قوم پرستی کے ساتھ مل جل گیا اور اس سنجوگ کے نتیجے میں جدید مغربی تہذیب  
 پیدا ہوئی۔ (Wilfred Cantwell Smith) لکھتا ہے:

”جدید مغربی تہذیب انسان کی عظیم الشان تہذیبوں میں واحد





کو وجود میں لانے کے لیے اُگے بڑے اور جب تاریخ کی روانی میں وہ  
اقتدار اور ذمہ داری کے مقامات بلند پر پہنچے تو انہوں نے رائج الوقت  
معاشرتی نظام کو جو کاتوں اپنا لیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس نظام کا ان  
کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں، اسے برقرار رکھا۔ مسیحی ہونے کی حیثیت  
میں وہ زیادہ سے زیادہ اُس کی اصلاح و ترقی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُس کی  
جگہ کوئی نیا معاشرتی نظام لانا کبھی ان کے پیش نظر نہ رہا۔

چونکہ اسلام کامل طور سے خود کفنی اقتدار کے مرت ایک مجموعہ اور حق و صداقت کے  
واحد معیار کو رکھتا ہے اور اہل ایمان کو حکم دیتا ہے کہ وہ زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے  
کے بجائے ایک سالم اکائی کی حیثیت میں بسر کریں اور صرف وہی باتیں قبول کریں جو اس  
عقیدہ زندگی سے ہم آہنگ اور براہ راست متعلق ہوں، اس لیے مسیحیت ایک مسلمان  
مہن کو پیچیدہ، پر آگندہ، بے ربط، غیر حقیقی اور بالکل ناقابل عمل نظر آتی ہے؛ تاہم  
مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جن امور کو ہم ناقص گردان کر رکھ دیتے ہیں مسیحی  
انہی کو سب سے بڑی خوبی قرار دیتے ہیں۔ مسٹر کینیڈہ کریگ (Kenneth Cragg)  
لکھتے ہیں:

”ماضی اور حال کے اکثر مسلمان مصنفین مسیحیت کو مطعون کرتے ہیں

کہ وہ مغربی تہذیب کی تربیت و تادیب اور اس کا محاسبہ کرنے میں ناکام رہی

ہے۔ اُس نے نہ تو سارا جیت کی روک تھام کی اور نہ استحصا کا توڑ کیا۔ اس

کے برعکس اُس نے دنیا پر مغربی اقتدار کا جو تسلط کرنے میں اس کی امداد و

اعانت کی ..... عہد نامہ جدید میں کلیسا کو معاشرہ کے اندر معاشرہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ اُسے تاریخ میں کسی پورے انسانی معاشرہ کا متہا نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بنیاد نجات باکفارہ کے تصور اور حقیقت نفس الامری پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ وہ قرار دیتا ہے کہ انسانی فطرت گناہ گار اور تلون مزاج ہے۔ انسان اپنی فطرت میں گندھے ہوئے جذبہ سرکشی کی بنا پر فطری ہے اور اصلاح یابی اور عفو کی بنیاد پر روحانی۔ انسان کی اصلاح کے متعلق مسیحی نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ شخصی عمل اور ایمان و اعتقاد کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ نیکی، صداقت اور محبت فطری انسان کے نہیں نو ساختہ انسان کے اوصاف ہیں۔ تغیر کی یہ کیفیات شخصی ہونے کی بنا پر اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مسیحیت ان افراد کی ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور انہی کا جزو لاینفک ہے۔ وہ کسی خاص سوسائٹی اور تہذیب کے ساتھ محدود (co-terminous)

نہیں ہے۔ مسیحیت کا آخری محل (locus) چیزیں نہیں افراد ہیں۔ مذہب عیسوی کے نزدیک انسان قانون کے ذریعے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ مسیحی ذہن کا ایمان یہ ہے کہ نجات یافتہ سوسائٹی کا مقام ہمیشہ قوم کے اندر ہوگا اور وہ پورے معاشرہ سے مماثل (identical) نہ ہوگی۔ اس پورے معاشرہ

\_\_\_\_\_ لادینی دنیا \_\_\_\_\_ کو اپنا نظام استوار کرنے میں آزادی ہونی

چاہیے۔ ہم قانون سازی یا اودعا کے ذریعے اسے مسیح کے ساتھ نہیں ملا سکتے۔

یہ ہے وہ اصولی استدلال جس کی بنا پر مسیحی مذہب کلیسا اور ریاست کے

درمیان واضح خط امتیاز کیسٹا اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتا

ہے۔ مسیحیت اس امر میں اسلام سے متفق ہے کہ خدا کے مطالبات قطعی

ہیں اور کوئی معاملہ بھی ان سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن اُسے اس

بات سے اتفاق نہیں ہے کہ ان مطالبات کو خارجی طور پر ایک مذہبی سیاسی نظام قائم کر کے ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔

مسیحیت کے جدید ترجمان خصوصاً "آزاد خیال" پروٹسٹنٹ فرقے اب اس لادینی انسان دوست نظریہ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جب تک کوئی شخص اپنے پڑوسی کو آزار نہیں پہنچاتا اُسے کھلی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس عقیدے کو پسند کرتا ہے اُس پر ایمان لائے اور جو طرزِ عمل مناسب سمجھتا ہے اختیار کرے۔ انفرادی آزادی کا یہ فلسفہ جو انگلستان اور امریکہ میں مروج جمہوری طرزِ حکومت کی اساس ہے۔ محض اس لیے کارگر ہے کہ مذہب سے بے اعتنائی عام ہو چکی ہے۔ حالات اگر مختلف ہوتے تو سوسائٹی مایوس گن انتشار کا شکار ہو جاتی۔ چونکہ انسان فطرۃً اجتماعیت پسند ہے اس لیے جس بات کو وہ حق جانے لگا، دوسروں کے سامنے اس کی اشاعت و تبلیغ کی سعی کرے گا اور اپنے مخصوص عقائد کو پھیلانے کے لیے اپنے حریفوں کے خلاف لڑے گا۔ آخر کار عقائد کے کسی ایک مجموعہ کا فتح یاب ہونا اور غالب آنا لازمی ہے۔ لہذا یہ نقطہ نظر محض ایک فریب ہے کہ مذہب ایک خالص شخصی اور انفرادی معاملہ ہے۔ کوئی فرد معاشرہ سے الگ تنگ اور اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک فرد کے کردار و عمل کا اثر یقیناً ان لوگوں پر پڑتا ہے جن کے ساتھ وہ رہتا سہتا ہے۔ اسی طرح اُس کے پڑوسی جو طرزِ عمل اختیار کریں گے اُس کا فوری اثر اُس پر پڑے گا۔ پھر انفرادی مسائل کو اجتماعی مسائل سے کیسے الگ کیا جاسکتا ہے؟

چونکہ انسان فطرۃً اجتماعیت پسند ہے اس لیے کوئی نظریہ کسی اجتماعی ادارہ میں صورت گر ہوئے بغیر نہ تو فروغ پا سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے؛ چنانچہ مسیحی کلیسا کے

The Call of the Minaret, Oxford University Press,  
New York, 1956. PP. 327-7



ساتھ کلیسائی نظام مراتب کا قیام اور شہنشاہ کانٹنٹائن کے عہد (۱۸۱۳ء) سے پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح تک کلیسے کے روحانی اقتدار اور قیصر کے دنیوی اقتدار میں تصادم اسی حقیقت پر شاہد ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ رومن کیتھولک یورپی تاریخ کے اس دور کو غارت سے مسترد نہیں کریں گے، مگر جب اس پر نظر ڈالیں گے تو اس کی طرف لڑنے کی خواہش اپنے دل میں مچلتی ہوئی پائیں گے۔ یہی نہیں وہ اسے ایک مثالی دور قرار دیں گے اگرچہ رومن کیتھولک چرچ نے لادینیت کو اصول تسلیم کر لیا ہے، تاہم آزاد خیال پروٹسٹنٹوں کی طرح وہ اس کی وکالت نہ درود شہور اور کٹراندا میں نہیں کرتا۔ رومن کیتھولک اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ مسیحی دینیوی اقتدار کا معاشرتی و دستوری زوال اور انحسار مادہ پرستی کا عروج ایک ہی وقت میں شروع ہوا اس لیے آزاد خیال پروٹسٹنٹوں کے برعکس، وہ فرد کی غیر محدود آزادی پر یقین نہیں رکھتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ کسی مذہب کے پیروان باوجود حریفوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے جو اُس کی تخریب اور بربادی پر تلے ہوئے ہوں۔ صداقت اپنی قیمت پر جھوٹ اور مکرو فریب کی اشاعت و ترقی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور نہ اُس سے بے اعتنائی برت سکتی ہے۔ فرد کی غیر محدود آزادی کو برداشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بدی کے مقابلے میں عدم مزاحمت کا رویہ اختیار کر رہے ہیں اور اس مفروضہ کو تسلیم کر رہے ہیں کہ صداقت، ہماری کسی جدوجہد کے بغیر، خود بخود کامیاب ہو جائے گی۔

اس مرحلہ پر ایک ناگزیر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرد اور معاشرہ کی صلاح و بہبود باہم دیگر اس قدر مربوط ہے تو پھر مذہبی اور غیر مذہبی امور کے درمیان ایک واضح

خطِ امتیاز کیسے کھینچا جاسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر مذہبی اقتدار کو کس مقام پر یہ فیصلہ کرنا  
ہوگا کہ کون سی چیز قیصر کی ہے اور کون سی خدا کی؟

---

۲۰

# ”محمدی دنیا“

## اسلام کے بارے میں ایک مثالی غلط بیانی

مجلہ (Holiday) (فلاڈلفیا) کے مارچ ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں مشہور ایٹکوانڈین امریکی مصنفہ ابری مین کا ایک خصوصی مقالہ شائع ہوا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اسلام کی صدیوں سے جو غلط تصویر پیش کی جا رہی ہے، یہ مقالہ اُس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ اس مقالہ میں جو غلط بیانی کی گئی ہے، قبل ازیں بے شمار مرتبہ کی جا چکی ہے اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی۔ مقالہ کا عنوان ”محمدی دنیا“ بجائے خود اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ ہم محمدی نہیں مسلمان ہیں۔ ”محمدی“ اور ”محمدیت“ کی اصطلاحات صلیبیوں نے ایجاد کی تھیں اور ان کا مقصد سارے یورپ میں اسلام کے خلاف یہ جھوٹ پھیلا کر نفرت پیدا کرنا تھا کہ ہمارے رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور مسلمانوں کو اپنی پرستش کا حکم دیا تھا۔ اسلام ابتداء سے زمانہ ہی سے موجود رہا ہے۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سمیت تمام انبیاء اور رسول پچھے مسلمان تھے۔ اسلام کے معنی ہیں اللہ کی مرضی کے آگے مطاعت خم کر دینا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ لہذا ہم مسلمان اپنے مذہب کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام گرامی پر رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔



اسلام کے تمام مثالی دشمنوں کی طرح اکبری مینن نے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد و ازدواج کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حضور عورتوں کے ساتھ حد اعتدال سے متجاوز رغبت رکھتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اور اپنی حیات طیبہ کے آخری عشر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو وجوہ کی بنا پر نکاح کیے۔ ان بیوہ خواتین کی دیکھ بھال اور محافظت کے لیے جن کے شوہر اسلام کی خاطر جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے اور مختلف قبائل اور خاندانوں کے ساتھ یگانگت اور اتحاد و اتفاق کے روابط کو مضبوط کرنے کے لیے پچیس برس کا ایک نوجوان جس کا مقصد وحید جسمانی حفظ و تسکین کا سامان فراہم کرنا ہو، کبھی ایک ایسی چھل سالہ خاتون سے شادی نہ کرتا جو دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھی، پھر اس کے انتقال تک مکمل پچیس برس تک وفاق و شادی کی زندگی بسر نہ کرتا اور اس کی یاد اپنے آخری وقت تک عزیز نہ رکھتا۔ خاصتنا نفسانی حظ کے لیے شادی کرنے والے شخص کی نگاہ انتخاب کبھی بے نوا، ادھیڑ عمر اور بوڑھی بیوہ خواتین پر نہیں پڑتی۔

مقالہ نگار نے 'حسب توقع' مسلمان خواتین کے نام نہاد 'پست مرتبہ' پر بڑا زور بیان صرف کیا ہے۔ جب میری مسیحی سہیلیوں کو پتہ چلا کہ میں نے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو وہ میرے گھر پر ٹوٹ پڑیں، نیز ٹیلیفون پر میرا تاک میں دم کر دیا۔ ہر ایک کی زبان پر بس یہی غیبیہ تھی کہ میں ہوش کے ناخن لوں، اسلام میں عورتوں کی حالت نہایت زار و زبوں ہے اور مسلمان سوسائٹی میں انہیں ذلیل و خوار اور پست مرتبہ سمجھا جاتا ہے، مجھے خوف ناک رنج و مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن جب میں مسلمان ممالک میں پہنچی تو مجھے خوشگوار حیرت نے آن لیا۔ میری سہیلیاں جس چیز سے ڈراتی رہی تھیں، وہ کہیں نظر نہ آئی، بلکہ مسیحی مشنری اور ان کے ہمدرد غیر مسلم دنیا کو نسل بعد نسل جو کچھ بتاتے چلے آتے ہیں، اس کے برعکس میں نے کسی ایک مسلمان گھر میں بھی مسلمان عورت کی ذلت و خواری کے نہ

کوئی آثارِ پائے اور نہ اُس کے ساتھ کسی قسم کا ظالمانہ اور اہانت آمیز سلوک روا دیکھا۔ مصر، سوڈان، سعودی عرب، پاکستان غرض عالمِ اسلامی میں میں جہاں کہیں گئی اور جس مسلمان گھرانے میں وہاں ٹھہری، معاشرتی یا اقتصادی مرتبہ سے قطع نظر، ہر جگہ میں نے دیکھا کہ مرد، مسلمان خواتین کے ساتھ ہر شفقت، عزت و احترام اور پاس و التفات سے پیش آتے ہیں، اور اب میں خود ایک بیوی، ماں اور ایک وسیع پیمانہ خاندان کی ایک رکن کی حیثیت میں ویسا ہی تجربہ کر رہی ہوں۔

آبری مینن آگے چل کر بڑے شوخ و شنگ انداز میں دعویٰ کرتی ہے کہ ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گرویدہ کرنے کے لیے حسی (sensuous) جنت کی تعلیم دی۔ اُس کے نزدیک یہ ایک فطری بات تھی۔ صحرائے عرب کے رہنے والوں کو اسی قسم کی کوئی چیز متاثر کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام نہاد حسی جنت صرف کفار کے بگڑے ہوئے اذہان تک محدود ہے۔ ایک سچے مسلمان کے حاشیہ خیال میں بھی کہیں اس کا تصور نہیں آیا۔ کیا یہ بات معقول اور قابلِ تسلیم ہے کہ ہمارے لائقِ داد و دیار اور شہداء نے ایک ایسی جنت کی خاطر جانیں دیں جس کے دامن میں مادی جنس کے سوا کچھ نہیں ہے؟ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ ایک شخص اپنا سارا مال و متاع، عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنی جان تک محض جسمانی مسرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے قربان کر دے گا۔ اگر یہ نفسانی مسرت و تسکین ہی انہیں مطلوب تھی، تو اس دُنیا ہی میں بڑے مرنے سے بافراط مل سکتی تھی۔ مجھے آج تک ایک مسلمان بھی ایسا نہیں ملا اور نہ اسلامی طریقہ میں کوئی ایسی کتاب میری نظر سے گزری ہے جس نے آخرت کی وہ مادی یا نفس پرستانہ تعبیر بیان کی ہو جو سچی مشنری قرنِ ہاقرن سے بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارا قرآنِ کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند احادیث، اپنے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ، ہمیں یہ تعلیم دیتی ہیں کہ جنت کی پُر مسرت زندگی رُوحانی بھی ہوگی اور جسمانی بھی ①

اور خدا سے برتر کا دیدار اور اس کے حضور میں حاضر باطنی سب سے بڑھ کر مایہ شادمانی ہوگی۔  
یورپ اور امریکہ کے مسیحی مشنری صدیوں سے اسلام کا ایک نفس پرست مذہب قرار دے رہے ہیں یہاں تک کہ پوری غیر مسلم دنیا اسے ایک بدیہی بات سمجھنے لگی ہے۔ بنابرین اگر آبروی منین بھی اسی دام کا شکار ہو گئی ہے تو کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ وہ اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتی کہ اسلام ایک نفس پرست مذہب ہے، اس کے اخلاقی معیار نہایت پست ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان شہوت پرست اور عشرت پسند ہیں۔ یہ ایک سفید جھوٹ ہے جو مسیحی مشنریوں نے اسلام کے متعلق گھڑ کر مسلسل پھیلا یا ہے۔ وہ مذہب جو اپنے ہر ماننے والے کو رات دن میں پانچ وقت، متعین وقفوں کے ساتھ، نماز ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، جو متواتر ایک ماہ کے روزے رکھنے کی سخت تاکید کرتا ہے، بلوغت کے بعد مردوں اور عورتوں کے اختلاط باہمی کو روکتا ہے اور ہر قسم کی منشیات، قمار بازی، قسمت آزمائی کے کھیلوں، تصاویر، موسیقی اور رقص و سرود کو ممنوع قرار دیتا ہے، ناجائز جنسی تعلق رکھنے کی انتہائی سخت سزا نافذ کرتا ہے، کیا اسے شہوت پرست مذہب کہا جاسکتا ہے؟ کیا مسیحیت سمیت کوئی دوسرا مذہب اتنا سخت گیر ہے جتنا کہ اسلام؟ اسلام اپنے نظریات کے ساتھ منسک رہنے کا شدید مطالبہ کرتا ہے اور انتہادہی کا (puritanical)

”بدیسی رسوم“ اور ”مشرقی ممالک“ کی سحر طراز دل کشیوں سے مسحور ہو کر مغربی مسیحیوں اور معتنفین نے ایک اور مسلمان ملک کی سوسائٹی کے بعض انتہائی زوال پذیر پہلوؤں کو لیا اور اسے تمام مسلمانوں کا حقیقی امتیازی خاصہ قرار دے کر ان کے سرچسپک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے وسیع لٹریچر میں سے، جو عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں پایا جاتا ہے، ایک عام یورپی اور امریکی کو یا تو اعلیٰ لیبہ کے انگریزی ترجمے، مترجمہ رچرڈ برٹن، کی خبر ہے یا رباعیات عمر خیام کے انگریزی ترجمے، فٹز جیرالڈ کی۔ یہ کتابیں



انگریزی بولنے والے ملکوں میں اس قدر مقبول ہیں کہ انگریزی زبان کے کلاسیکی ادب میں شمار کی جاتی ہیں۔ اہل مغرب کو یہ سن کر اچنبھا ہو گا کہ عربی بولنے والی دنیا میں یہ نام نہاد (*Arabian Nights*) کوئی ادبی مقام نہیں رکھتی، اسے نقش نگاری کے ایک مرقع سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح عمر خیام خود اپنے ملک میں بلند گردانا جاتا ہے اور اس کی شاعری ترمیم و تحسین سے زیادہ تحارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس مثال سے کسی شخص کے ذہن میں یہ الجھن باقی نہیں رہنی چاہیے کہ زیر بحث دونوں تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب نظریاتی اعتبار سے افضل و برتر ہے۔

اپنے متعدد پیشروؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اُبری مین نے بڑے جوش و مسرت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کی وحدانیت نئی نہیں ہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصور یہودیوں سے لیا ہے۔ یہودی اہل علم کا یہ عام دستور بن گیا ہے کہ وہ اسلام کی جس چیز کو یہودیت سے ہم آہنگ پاتے ہیں، اُسے وہ اپنے سے مستعار لیا ہوا قرار دے دیتے ہیں۔ یہودی علماء اپنے وقت، فکری و علمی صلاحیتوں اور عملی قوت کا بڑا حصہ یہ طے کرنے میں ضائع کر چکے ہیں کہ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم "مرتب کرتے" وقت، تورات، تلمود اور بدارش سے کیا کچھ لیا ہے۔ قرآن کریم اور یہودی یا مسیحی کتب مقدسہ میں جو کچھ متناقض پایا جاتا ہے، اُسے وہ حضور کی ناقص یادداشت اور ناقص علم سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہودی اور مسیحی مفسرین صدیوں سے یہ ثابت کرنے کے لیے سر مار رہے ہیں کہ ہمارا قرآن پاک الہامی کتاب نہیں ہے، بلکہ دوسری عام کتابوں کی طرح خلیوں سے بھرپور ایک عام کتاب ہے۔

اب امر واقع یہ ہے کہ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اپنی مقامی زبان عربی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے۔ پھر حضورؐ یہودی یا مسیحی کتب مقدسہ سے کوئی چیز کیسے مستعار لے سکتے تھے جب کہ آپؐ پڑھنا ہی نہ جانتے تھے اور ان کتابوں



تک رسائی ایک اجنبی زبان کے سوا کسی اور زبان میں ممکن نہ تھی۔

مقالہ نگار نے قرآن کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اس کی جہالت بڑی طرح آشکارا ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ قرآن کریم کی آیات بھڑکی بھڑکیوں پر الگ الگ قلم بند کر لی گئی تھیں، جنہیں بعد ازاں کسی نظم و ترتیب کا لحاظ کیے بغیر نہایت لاپرواہی سے ایک صندوق میں ڈال دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے سامنے یہ پریشان کن مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ قرآن کو کس طرح مدون کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اختیار تمیزی سے کام لیتے ہوئے مختلف سورتوں کو مکان کی انداز میں ترتیب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ طویل سورتیں پہلے رکھ دیں اور چھوٹی آخر میں۔ مقالہ نگار کے اس دعویٰ کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم جیسے جیسے نازل ہوتا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان آیات کو ٹھیک متعلقہ مقام پر رکھتے چلے گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور کی ہدایت کی اتباع نہایت وفاداری سے کی۔ کوئی چیز ظن و تخمین پر نہیں چھوڑی گئی۔

اگر بری مینن بیان کرتی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کی نوخیز نسل کو دمشق کی جامع مسجد اور قاہرہ کی جامعہ الانبیا میں قرآن کریم پڑھتے دیکھا ہے۔ اس طرح وہ اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ مسلمانوں کا ذہن کس طرح "مقید" ہو کر رہ گیا ہے۔ دودھ حاضر کے مادہ پرستانہ ذہن رکھنے والے تمام افراد کی مانند وہ بھی یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ ہم مسلمانوں کا یہ ایمان ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو نوع انسانی کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی۔ اس لیے کہ ایک مرتبہ صداقت آشکارا ہو جائے تو اُسے بدلائیں نہیں جاسکتا۔ تبدیلی کی خاطر تبدیلی تمام جدت پسند نظریات کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے۔ ابدی صداقت اور بدیہی اقدار کو "قرون وسطیٰ کے تصورات" قرار دے کر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صداقت کو ایسی پراسرار شے سمجھنا آج کا دستور بن چکا ہے، جو کبھی آشکارا نہیں ہو سکتی؛

معزلی طرز عمل

چنانچہ یہ لازمی خیال کیا جاتا ہے کہ لوگ اخلاق و صداقت کے معیار خود بنائیں تاکہ وہ جس نئی صورت حالات سے دوچار ہوں اس پر پورا اتر سکیں۔ اس طرز فکر و عمل کا نتیجہ وہ مکمل اخلاقی اور روحانی انتشار ہے جس سے آج ہم دوچار ہیں۔

قرآن کریم کبھی تقویم پارینہ نہیں بن سکتا۔ بنا بریں موجودہ دور کے مادی مفاسد کے غلام اس سے بڑھ کر فصیح و موثر حجت اور کوئی نہیں۔ اگر اسلام کلی طور پر نافذ ہو جائے تو ہم ایک ایسے انقلاب کا تجربہ کریں گے جس کے آگے دوسرے تمام انقلابات پیچ ہو کر رہ جائیں گے۔ ہر قسم کا ظلم و ستم اور جبر و تشدد اس طرح غائب ہو جائے گا گویا کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ جو نہی انسان اپنے جیسے انسانوں کے آگے جھکنا بند کر دیں گے اور صرف خدائے واحد سے خوف کھائیں گے یہ دنیا سچ مچ تہ دبلا ہو جائے گی۔ اوپر کی بگڑی ہوئی اور ظلم و نا انصافی سے معمور دنیا نیچے ہو جائے گی اور نیچے کی راست رو اور حق و انصاف کی دنیا اوپر۔

تاہم ابری سین موجودہ مسلمانوں کی کمزوری کو اسلام کی کوتاہی کے ثبوت میں پیش کرے گی۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی متنازعہ اکثر کسی مریض کے لیے کوئی تیر بہدت دوا تجویز کرتا ہے، لیکن وہ مریض اس دوا کو استعمال کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟

یہاں یہ اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی مصنفین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے آخری حد تک چلے جانے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں؟ ہماری طرف سے غصے کے عالم میں محض زبانی مذمت پر انحصار کرنا اور ترک کی بہ ترک کی جواب دینا بالکل بے سود ہوگا۔ ان کے اس طرز عمل کے پیچھے جو محرکات کار فرما ہیں، ہمیں ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ولفریڈ کینٹویل سمجھتے ہیں:

”مغرب اسلام کو سمجھنے کی جو سنجیدہ اور سرتوڑ مساعی کر رہا ہے دنیا بھر میں اسلام





سے دیکھتا ہے، آئیے ہم اس پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ لا اوری مذہب انسانیت کے پرکاروں کے نزدیک اسلام کی دقیق دینی بنیادیں اور اخلاقی مطلقیت (absolutism) ایک جامد رجعت پسند اور قرون وسطیٰ کا فرسودہ نظام وجود میں لاتی ہیں۔ یہ نظام نشوونما اور ارتقاء کی صلاحیتوں سے محروم ہونے کی بنا پر اپنے پرکاروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی قدیم تہذیب میں مقید رکھتا ہے اور اس طرح انسان کی "ترقی" کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کی ہر پہلو پر عادی ہمہ گیری، جس کے تحت مذہب اور حکومت متحد ہو جاتے ہیں، جدید لادینیت کے معتقدین کی نظر میں "کلّیت پسند" ہے اور ذہنی ذوق تجسس کی آزادی اور حق عمل کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اخلاق اور عبادت کے لازم و ملزوم ہونے اور ایک مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو کی نگرانی کرنے والے کثیر التعداد قوانین کو وہ "محض بیکار سی ٹوشگانی اور بے روح رواج" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پردہ یا مرد و زن کی علیحدگی اُن کے نزدیک "عورت کی ذلت دہشتی" کے ہم معنی ہے اور آزادی نسوانی کے جدید علمبردار اسے "عورتوں کو قومی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے اور بیرون خانہ معاشرتی ترقی میں بے روک ٹوک شریک ہونے کی آزادی عطا کرنے سے انکار" کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ تصویروں، مجسموں، موسیقی اور رقص و سرود کی اسلامی ممانعت میں ایک تہذیب مغربی کو "انسان کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کی بربادی نظر آتی ہے۔"

ایک مغربی مستشرق اور سچے منہ سے مسلمان کے نقطہ نظر میں غالباً سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ اَدل الذکر اسلام کو محض اس مخصوص ماحول کا تشکیل کردہ تاریخی منظر قرار دیتا ہے جس میں ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سکونت پذیر تھے۔ اس کے برعکس مؤخر الذکر کا ایمان و اعتقاد یہ ہے کہ ان تاریخ ساز سالوں میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا۔ اس کی نوعیت کائناتی، عالمگیر اور الہامی صداقت کی ہے اور وہ زمان و مکان سے ماورا



قیامت تک تمام قوموں اور ملکوں کے لیے یکساں طور پر واجب العمل منابطہ ہے۔ تاہم  
مستشرقین اسلام کو دوسرے مذاہب کی طرح محض ایک مذہب اور تاریخ کی متعدد  
دوسری تہذیبوں کی طرح ایک تہذیب قرار دیتے ہیں۔ جو صرف اپنے دنیوی عروج کے  
دور میں اہم اور وقیع تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اب مغربی تہذیب و ثقافت نے اُس کی  
جگہ لے لی ہے اور اسلام قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ اُسے پھر سے رواج نہیں دیا جاسکتا۔

(۴)

یہ ہیں وہ چند اسباب جن کی بنا پر دنیا تے مغرب کے لیے اسلام کا معروضی  
مطالعہ ناممکن ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک چڑھالے تو جب تک  
وہ اسے نہیں اتارتا اس کی نظر مسخ شدہ ہی رہے گی۔ علیٰ ہذا القیاس جب تک مغربی  
تہذیب کے پورے کے پورے کردار کی قلب باہیت نہیں ہوتی دچند لاکھ لاکھ افراد کی  
امکانی مستثنیات کے ساتھ ہم مسلمان ان سے کسی اور طرز عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔

(۲)

اسلام — ایک نظریہ

۵۲

## مسلمان ذہن

مسلمان ہونے کے تقاضے عبادات کی پابندی سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر چند عبادات ناگزیر ہیں، لیکن جب تک ایک نو مسلم کا پورا ذہن، اخلاقی اور روحانی نقطہ نظر بدل نہیں جاتا عبادات کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مشرت باسلام ہونے کے بعد میرے اندر اہم ترین تبدیلی یہ آئی کہ میرے ذہن کی کاپیا پلٹ ہو گئی۔ وہ ایک کافر ذہن سے مسلمان ذہن میں تبدیل ہو گیا۔ مسلمان ذہن کس طرح کام کرتا ہے؟ دنیل کے بارے میں ایک مسلمان کا تصور کیا ہے؟ زندگی کو وہ کس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا دین و ایمان اس کے کردار، اخلاق اور امنگوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں دوں گی۔ بہت سی باتیں ایک غیر مسلم کے لیے حیران کن ہوں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض باتوں پر دہل کر رہ جائے، لیکن جب حقیقی اسلامی اقدار کے داخلی مفہوم اور اصلی حسن و خوبی پر اس کی نظر کافی مدد تک گہری ہو جائے گی تو یہ ساری حیرت و دہشت خود بخود جاتی رہے گی۔

(اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ تصور ہے کہ انسان اللہ کا بندہ ہے۔ عربی میں اللہ کے بندے کو عبد اللہ کہتے ہیں۔ یہ نام مسلمان ملکوں میں عام پایا جاتا ہے۔ اسلام کے حقیقی معنی



ہیں اللہ کی مرضی کے آگے جھک جانا۔ وہ سب لوگ جو اللہ کی اطاعت و رضا کی اس زندگی کو اختیار کرتے ہیں مسلمان کہلاتے ہیں۔ چونکہ اللہ کی ذات برتر و بالا ہے اور وہی ساری کائنات کی فرمانروا ہے اس لیے مسلمان ذہن کو کلیسا اور ریاست کی تفریق کا مسیحی تصور بالکل غیر منطقی نظر آتا ہے۔ اسلامی حکومت کا مقصد اللہ کے قانون کا نفاذ ہے، جو قرآن و سنت میں محفوظ ہے۔ مسلمان حکمران نہ تو خود قانون کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، نہ وہ اپنے طور پر کوئی نیا قانون بنانے کا حق رکھتا ہے۔ شریعت الہی کو کبھی بدلا نہیں جاسکتا۔ ہاں، اس کی تفسیر کی جاسکتی ہے۔ وہ بھی کڑی حدود کے اندر۔ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ کعبۃ اللہ تعالیٰ کا دستِ نگر ہے۔ ہر وہ شے جو انسان کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ حتیٰ کہ اُس کا جسم بھی۔ اللہ تعالیٰ نے محض مستعار دی ہے تاکہ وہ اسے حتیٰ الامکان انتہائی معقول طریقے سے کام میں لائے۔ اگر کوئی شخص اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرتا ہے تو وہ عبرت ناک سزا پائے گا۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے بوقت ضرورت ہر شے اپنی ذاتی مسرت، اپنا عیش و آرام، اپنی خواہشات، آسائشیں، دولت، مال و متاع حتیٰ کہ زندگی تک راضی خوشی قربان کر دے۔ بچے اور مخلص مسلمان کو کسی عظیم تربیتی اور تعلیمی کی خاطر اپنی ساری چند روزہ مسرتیں قربان کر دینے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ اس کا اجر اُسے ابدی مسرت اور قلبی اطمینان کی صورت میں ملے گا۔ اللہ کا بندہ“ ہونے کا مطلب انسانوں کے جوہر و استبداد سے آزادی ہے۔ سچا مسلمان کسی انسان سے نہیں ڈرتا وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔

مسلمان دنیا کو دو مخالفت کیمنوں دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم کرتا ہے۔ فروع انساں کی بدترین مصیبت غربت، بیماری یا ناخواندگی نہیں گھر ہے۔ نوعِ عالمہ کو لہنیں، کنواری مائیں، امراضِ خبیثہ، استقلاطِ حمل، زنا بالجبر، حرامی بچے، لاوارث ثمرائی اور جنگ جوئے و وطن پرستی سب کفر کے منطقی نتائج اور تلخ ثمرات ہیں۔ جو کچھ اسلامی تعلیم

سے ہم آہنگ ہے سب سے بڑی نیکی اور بھلائی اُسی سے عبارت ہے۔ اس کے برعکس کفر اللہ تعالیٰ کے خلاف کھلی بغاوت ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مسلمان اپنے دوسرے ہم چشم انسان کی سیرت کا اندازہ اُس کے عقیدہ کی صحت اور روزمرہ زندگی میں اس کے عملاً نفاذ کی اساس پر کرتا ہے۔ کسی شخص کی نسل، قومیت، دولت یا معاشرتی حیثیت کا اسی کے حقیقی انسانی وصف سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک شخص جس چیز پر ایمان لانے کا مدعی ہے، اگر اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ محض ایک منافق ہے، فی الحقیقت وہ دوسرے سے ایمان ہی نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان کے نزدیک انسان کے کسی فعل کا دار و مدار اُس کے عقائد پر ہے۔ کیونکہ فوق الفطرۃ دینی بنیادوں کے بغیر وہ حسنِ عمل اور اخلاقیات کے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سچا مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ موت وہ گھاٹی ہے جس سے گزر کر ایک مسلمان ابدی زندگی سے ہمکنار ہوتا اور قریب الہی حاصل کرتا ہے۔ مسلمان جب بیمار ہوتا ہے تو صحت یاب ہونے کے لیے ہر ممکن علاج معالجہ کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر تمام طبی وسائل اس کی صحت بحال کرنے اور زندگی بچانے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ اُس کا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی زندگی کی مدت پہلے ہی سے مقرر کر دی ہے۔ کوئی شخص نہ تو اس مقررہ وقت سے پہلے مر سکتا ہے نہ دنیا بھر کی دوائیں اور طبیب مل کر اس کی موت کو آگے دھکیل کر اسے بچا کر رکھ سکتے ہیں۔

سچا مسلمان متعصب نہیں ہوتا۔ ہمارا قرآن پاک تحسّس اور غیبت کی ممانعت کرتا ہے۔ وہ اہل بدعت کے شکار پر یقین نہیں کرتا۔ کوئی مسلمان چاہے کتنا ہی غلط کاریوں نہ ہو جیتا تک وہ اپنے دین کو علانیہ نہیں چھوڑ دیتا، اُسے دوسرا مسلمان دینی و معاشرتی حقوق سے محروم نہیں کر سکتا۔ مسلمان نہ تو دوسرے مذاہب پر دستِ جور و تعدی دراز کرتے

ہیں اور نہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے سامنے ہیں مذہبی اقلیتیں خود مختار اور سالم گرد ہوں کی صورت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے، اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق تعلیم دینے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو دوام بخشنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مزید برآں انہیں جان و مالی کا مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق وہ بحیثیت انسان مساوی انصاف اور عمدہ سلوک کے مستحق ہوتے ہیں؛ تاہم شریعت اسلامی کے ان تمام عطا کردہ حقوق کے باوجود کسی غیر مسلم کو مسلمان کا ہمسر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسلامی حکومت کے سایہ میں بسنے والے غیر مسلم فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اسلام کی دعوت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس کی خاطر جنگ کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی غیر مسلم کو حکومت کے کلیدی مناصب پر بھی فائز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مسلمان نسلی و قومی اختلاف کے باوجود دوسرے مسلمانوں کے ساتھ گہری قربت محسوس کرتا ہے، لیکن غیر مسلموں کے درمیان وہ اپنے آپ کو ہمیشہ اجنبی پاتا ہے۔

(۱) اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اُس کے دروازے تمام نوع انسانی پر کھلے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کو اپنی آغوشِ رحمت میں لانے کے لیے سرگرم جدوجہد کرتا ہے۔ مسیحیوں کے برعکس ہمیں ہمیشہ و رہبر متبعین کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان بجائے خود ایک مبلغ ہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اپنی امکانی حد تک، اُس کا مقدس فریضہ ہے۔ بہت سے غیر مسلم یہ جان کر درطہ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ دنیا کے وسیع و عریض علاقوں میں ————— خصوصاً جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ میں ————— اسلام عام عرب اور ہندوستانی تاجروں کے ذریعے پھیلا۔ اس مقصد کے لیے نہ تو جبر و تشدد اور قوت سے کام لیا گیا نہ ان ممالک کو سیاسی طور پر کبھی محکوم بنایا گیا۔ یہ نتائج صرف اس لیے رونما ہوئے کہ ان تاجروں اور بیوپاریوں نے پہلے اسلام کو پیش کیا اور پھر کاروبار کی طرف توجہ دی۔

ph - D



صحیح راسخ الاعتقاد یہودیوں کی طرح مسلمان بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا تقرب اُس کے مقدس قوانین کی تعمیل اور پابندی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بنابرین وہ عبادات اور اخلاقیات کے درمیان کوئی نمایاں خط امتیاز نہیں کھینچتے، جو ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک طور پر مربوط ہیں۔ مسلمان روح کو اُس کے خارجی قالب سے الگ نہیں کرتے کیونکہ ان کا ايقان ہے کہ کوئی عقیدہ اپنے محسوس منظر کے بغیر موثر اور کارگر نہیں ہوتا۔

وضو اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے عین مطابق ادا کرنا لازمی ہے۔ نماز ایک مسلمان کے اندر حساس ضمیر اور بلند کردار کو نشوونما دیتی اور اسے سختگی عطا کرتی ہے۔ اس لیے کہ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یہ دیکھنے والا نہیں ہوتا کہ اُس نے یہ فرض ٹھیک ٹھیک انجام دیا ہے یا نہیں۔ شخصی حفظانِ صحت اور طہارت و پاکیزگی کی ضرورت پر اور کوئی مذہب اس قدر زور نہیں دیتا۔ جسمانی طہارت روحانی پاکیزگی کو متاثر کرتی ہے اور خارجی انسان داخلی انسان کا منظر ہوتا ہے۔

قرآن و سنت کا تعزیری قانون وہ اہم ترین موضوع ہے جس پر غیر مسلموں نے نکتہ آفرینی کی اور غلط فہمی پھیلاتی ہے۔ اسلام جن امور کو معاشرہ کے خلاف بدترین جرائم قرار دیتا ہے مغربی ممالک میں انہیں شاید ہی جرم سمجھا جاتا ہے اور چوری کے سوا کسی جرم پر شاذ و نادر ہی قانون تعزیرات نافذ کی جاتی ہیں۔ مسلمان نہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ قانون کی خوبی اور فضیلت کا انحصار اس کی نرمی پر ہے اور نہ اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ مجرم معاشرہ سے زیادہ ہمدردی اور شفقت کے سزاوار ہیں۔

مسلمانوں کی نظر میں قرآن و سنت کا تعزیری قانون ساتویں صدی عیسوی کے قدیم عرب کا ظالمانہ اور وحشیانہ حاصل نہیں ہے اور نہ وہ آج کی دنیا سے غیر متعلق ہے۔ اس کے برعکس ان کا ايقان یہ ہے کہ یہ قانون ہمارے جدید قید خانوں کی اخلاقی سیکیوریوں



اور انتہائی نفسیاتی تخریب کاریوں سے زیادہ مجرموں کا شفیق و ہمدرد اور ایک حقیقی اسلامی معاشرہ کو جرائم سے پاک صاف رکھنے میں انسان کے خود ساختہ قوانین سے زیادہ مؤثر ہے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ایک صحت بخش معاشرہ وجود میں لانے کے لیے مردوں اور عورتوں کی علیحدگی نہایت ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مسلمان مخلوط معاشرتی تقریبات، مخلوط درس گاہیں یا رٹ کون اور لڑکیوں میں شادی سے پہلے عشق و محبت کی پیکیں دکورٹ شپ، برداشت نہیں کر سکتا۔ لازم ہے کہ نہ تو مرد غیر عورتوں کی طرف دیکھیں نہ عورتیں غیر مردوں کی طرف۔ ہر وقت حیا دار لباس زیب تن رہے۔ عورتوں کو کسی کام سے باہر جانا ہو تو اپنا پورا جسم پردہ میں ڈھانپ کر نکلیں اور حتی الامکان سیدھے سادے غیر نمایاں انداز میں چلیں پھریں۔ عورت کا حسن و جمال صرف اس کے اپنے لیے ہے۔ اُس کا جسم کسی حالت میں بھی بے پردگی اور آوارہ نگاہوں کا ہدف نہیں بننا چاہیے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان عشق و محبت کے کھلے عام مظاہرے سخت تعزیر کے لائق ہیں۔ اسلام مرد کو گھر سے باہر کے معاشرتی فرائض سونپتا ہے اور عورت کو درون خانہ کے تمام معاملات کا ذمہ دار بناتا ہے۔ بنا بریں کاروبار یا سیاست کے میدان میں مردوں کے ساتھ مسابقت عورتوں کا کام نہیں ہے۔ مسلمان خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ عورت جب ایک دفعہ گھر کو چھوڑ دیتی ہے تو گھر باقی نہیں رہتا۔

تجربہ کی زندگی کو قرآن و سنت مذموم قرار دیتے ہیں۔ ہر نارمل مرد اور عورت سے ازدواجی زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اگرچہ مرد کو چار بیویاں کرنے کی اجازت ہے تاہم نہ تو اسلام تعددِ ازدواج کا حکم دیتا ہے اور نہ مسلمان معاشرہ میں اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بس یہ ایک اجازت ہے جس سے خال خال لوگ فائدہ اٹھاتے

ہیں۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت ہمیشہ یک زوجگی پر عامل رہی ہے۔

اسلام کی طرف سے محدود تعدد و ازدواج کی اجازت ناجائز جنسی تعلقات کو بڑی حد تک ختم کر دیتی ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کرنے کا خواہشمند ہے تو اس کے لیے پہلے اس عورت کے ساتھ شادی کرنا، اس کی کفالت کا بار اٹھانا اور ربوہیت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اسلام بھی قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر خاندانی منصوبہ بندی کے اتنا ہی مخالف ہے جتنا کہ رومن کیتھولک چرچ، اور اس مخالفت کے اسباب بھی تقریباً یکساں ہیں۔ ایک مسلمان کے نزدیک اس سے بڑھ کر مفسدہ اور دین و مذہب سے انحراف اور نہیں ہو سکتا کہ انسان ازدواجی تعلقات بھی قائم رکھے اور ان کی اصل غرض و غایت کی راہ میں رکاوٹ بھی ڈالے۔ مانع حمل ادویات وغیرہ استعمال کرنے کی اجازت صرف غیر معمولی انفرادی صورتوں میں ہے اور وہ بھی محض طبی بنیادوں پر۔ بچوں کی تعداد میں تخفیف کی عمدہ کوشش کرنے کے لیے اقتصادی دھجہ کا عذر نا کافی ہے، کیونکہ آدمی کا رازق خود آدمی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔

اسلام "فنون لطیفہ" کی حوصلہ شکنی کرتا اور اس سلسلے میں تمام دیگر مذاہب سے مختلف رائے رکھتا ہے۔ ایک مسلمان قوم میں کسی میناٹیلنگو، ریمبرانٹ، بیتھوون یا شیکسپیر کو اپنے اد پر بچھاؤ کرنے کے لیے تحسین و آفرین کے پھول نہیں ملیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان شہروں میں سمفنی سرود گاہوں، اد پراگھروں، تھیٹروں اور فنی عجائب خانوں کا نمایاں فقدان ہے۔ اسلامی فن کی تخلیقی قوت نے اپنا کامل اظہار عربی خطاطی کی صورت میں کیا ہے یا طرز تعمیر میں، جس سے آج تک کوئی قوم سبقت نہیں لے جاسکی۔

ساز و سرود کو ہر جگہ مذموم قرار دیا جاتا ہے۔ مساجد میں تو وہ بالکل ممنوع ہے۔ پیشہ ور مطرب اور سازندے پوری دنیا سے اسلام میں معاشرتی لحاظ سے پست اور ذلیل

سمجھے جاتے ہیں۔ ساز و سرود انسان کے قلب و ذہن کو اپنے اللہ سے غافل کر دیتے ہیں اور بالآخر اسے شہوت پرستی کی پستیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے جذبات کے اظہار پر بے حد مجبور ہو جاتے تو اسے گانے کی اجازت ہے، لیکن احتراز و احتیاب اولیٰ تر ہے۔ کوئی عقیف اور پاکدامن شریف مسلمان خاتون کھلے عام نہیں گائے گی۔ قرآن پاک کی قرأت، اذان اور قوالی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کوئی واحد نغمہ و سرود ہے جسے مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ رقص ناجائز جنسی تعلقات کا نہایت طاقتور محرک ہے اس لیے اسلام میں اس کی مکمل ممانعت ہے۔ شاید عید الفطر اور عید الفی کے تہوار، جب کہ لوگوں کو جہاد کے لیے جوش میں لانا مقصود ہو، یا شادی کی تقریبات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس قسم کے جشن کبھی مخلوط نہیں ہوتے۔ مرد مردوں کے ساتھ مل کر رقص کرتے ہیں اور عورتیں صرف عورتوں کے ساتھ۔

شیخ، سینما یا ٹیلی ویژن کے پردوں پر سوانگ بھرنے کی بھی اسی بنا پر حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ کھیل، تماشے، خواہ ان میں کوئی شخص ایک کردار کی حیثیت میں شریک ہوتا ہے یا تماشاخانہ کی، نہ صرف فسق و فجور کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ لوگوں کو اپنے ذاتی تصورات میں اس حد تک گم کر دیتے ہیں کہ حقیقی زندگی سے اُن کی دلچسپی جاتی رہتی ہے۔

لٹریچر، فکشن، خواہ ڈرامے کی شکل میں ہو یا ناول کی، کسی مسلمان ملک سے کوئی فطری تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ خطابت اور شاعری کو بے حد ترقی دی جاتی ہے اور فصیح تقریروں کو مسلمان ہر جگہ بڑی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ حیات بدیہی اقدار پر مبنی ہے۔ اخلاق و صداقت مطلق ابدی اور عالمگیر ہیں۔ انہیں انسان نے نہیں اللہ نے جاری کیا ہے۔ بنا بریں انسان ان میں



دفعل دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں، اللہ کی کتاب ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ حقیقی معنوں میں سچا ہے اور اس کی اطاعت لازمی ہے۔ قرآن کریم علم کل کا منبع ہے اور اس کے کسی جزو کے متعلق شک و شبہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔ حدیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سنت ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ——— قرآن کریم کی صحیح تعبیر و تشریح کے لیے لازمی ہیں۔ دوسرے کے بغیر تنہا کسی ایک پر انحصار بے معنی ہے۔ چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی خطا سے مبرا ہے، مکمل اور آخری وحی ہے جو انسان کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے، اس لیے اسلام کی نہ تو تہذیب و اصلاح کی جاسکتی ہے، نہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ اس کو "ترقی دینے" کی ضرورت کبھی پیش نہیں آسکتی۔ اسلام ایک مکمل اور خودمکفی دین ہے۔ اخذ و انتخاب کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمان کے نزدیک "ترقی" یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآن کریم کے الفاظ اور روح کے عین مطابق ڈھالیں۔ اُن کا دنیاوی مقصود مادی کامیابی نہیں آخرت کی زندگی کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا ہے۔

( اسلام مسلمانوں سے کامل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسلمان شب و روز کے ہر لمحے میں مسلمان رہتا ہے۔ اسلام کی ضابطہ پسندی کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے لیے ناقابل تصور ہے۔ اس کے قوانین ایک مسلمان کی پیدائش سے لے کر موت تک، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔ وہ بیداری کے عالم میں ہو یا خوابیدہ، اسلام ہر وقت مسلمان کے ساتھ رہتا ہے۔ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی اسلامی حیثیت کو فراموش کرنے کی اجازت نہیں۔





## اسلام اور ذہنی صحت

جدید معاشرہ جن انتہائی سنگین مسائل سے دوچار ہے، ان میں سے ایک مسئلہ اعصابی و دماغی عارضہ کی ہمہ گیر وبا ہے۔ عجیب الٹا معاملہ ہے۔ مائنس اور ٹیکنالوجی جس قدر تیزی سے ترقی پذیر ہیں اور امریکہ و یورپ کے نام نہاد ”ترقی یافتہ“ ممالک اقتصادی خوش حالی سے جتنا زیادہ بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، دماغی ریفینوں کی تعداد میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ذہنی امراض کے نئے نئے شفا خانے تعمیر ہوتے اور گنجائش سے زیادہ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ نیز خودکشی کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ دنیا بھر کے سنجیدہ مفکرین پر اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار، بڑی حد تک، وہ مادہ پرستانہ فلسفہ ہے جو پوری دنیا میں اختیار کیا جا چکا ہے۔

مروجہ ہم عصر فلسفہ کی رُوسے کائنات اور اس کی جاندار مخلوقات کی تخلیق محض ایک حادثہ کا نتیجہ تھی۔ نسلِ انسانی ارتقاء کے میکانیکی عمل کی بدولت حیوانی حالت کے پست تر مدارج سے بتدریج گزرتی ہوئی ہزاروں سال میں مرتبہ انسانیت کو پہنچی ہے۔ چونکہ قانونِ فطرت لا شخص ہے اس لیے اُس کا نہ تو کوئی تعلق اخلاقی قانون سے ہے نہ افراد کی ذاتی زندگیوں سے۔ پھر چونکہ زندگی کا انحصار نامیاتی مادہ پر ہے اس لیے رُوح کو دوام حاصل

نہیں ہو سکتا۔ شعور و احساس و مانع کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور انسان کی انفرادی شخصیت کو مرنے کے بعد کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی؛ چنانچہ انسان جو عدم سے وجود میں آیا ہے، مرنے کے بعد فطرۃً اسی طرح نیست ہو جائے گا جس طرح کہ وہ اپنی ماں کے رحم میں حمل کی صورت اختیار کرنے سے پہلے تھا۔ بنا بریں آخرت کے متعلق کسی قسم کا تصور محض خوش خیالی ہے۔ انسان کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ کسی مافوق الفطرت ہستی کی مدد کے بغیر اپنی زندگی کے احوال کو اس طرح ڈھالے کہ انتہائی راحت و مسرت اور مادی فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو جائے۔

ذہنی صحت کے سلسلے میں سیگمنڈ فرائیڈ (۱۸۵۹ء — ۱۹۳۹ء) کو عصر جدید کا امام سمجھا جاتا ہے۔ آج ذہنی و اعصابی امراض کا جو نفسیاتی علاج رائج ہے وہ زیادہ تر اسی شخص کے نظریات پر مبنی ہے۔ فرائیڈ نے اپنا بنیادی نظریہ کافر یونانیوں کی دیومالا سے اخذ کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ انسانی کردار زیادہ تر ذہنی لا شعور کے جبری اور جبلی میلانات کا نتیجہ اور اپنی اصل کے اعتبار سے تقریباً تمام تر جنسی اور شہوانی ہوتا ہے۔ اس کی راستے میں دماغی عوارض کا سبب انسان کی وہ تشنہ تکمیل جنسی خواہشات ہوتی ہیں جنہیں کوئی مہذب معاشرہ برداشت نہیں کرتا۔

فرائیڈ کا نظریہ کہتا ہے کہ انسان کا ذہن بالکل خورد سالی ہی سے ایسے جذبات سے معمور ہوتا ہے جو اس کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ نسل انسانی کے تمام روحانی اور مادی کارنامے جنسی میلان کے ارتقاع و تہذیب کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ جیسا کہ فرائیڈ لکھتا ہے:

”یہ بات درست نظر نہیں آتی کہ کائنات میں کوئی ایسی طاقت موجود ہے جو پدرانہ فکر و تردّد کے ساتھ ایک ایک فرد کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی اور اپنے حلقہ شغقت میں شامل سبھی لوگوں کو مبارک و مطمئن انجام سے

ہمکنار کرتی ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے نصیبے انصاف کے کسی بھی عالم گیر اصول سے متضاد و متباہن ہیں۔ یہ بات بھی کسی طرح درست نہیں ہے کہ نیکی کا صلہ ملتا ہے اور بدی کی سزا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبردست، عیار اور بے ایمان لوگ دنیا کی خاطر خواہ منفعتوں پر چھین جھپٹ کر قابض ہو جاتے ہیں اور نیک اور خدا ترس تہی دست رہ جاتے ہیں۔ خدائی انصاف کے اس تصور کا کہیں وجود نظر نہیں آتا، جو مذہب کے بموجب دنیا بھر میں حکمران ہے۔ نائنس کی عظمت کو گھٹانے کی کوئی کوشش اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی کہ وہ ہمیں حقیقی خارجی دنیا پر انحصار کرنا سکھاتی ہے، جب کہ مذہب محض ایک طفلانہ وہم ہے اور اپنی قوت ان اتفاقات سے اخذ کرتا ہے جو ہماری فطری آرزوئیں پوری کرنے کے لیے ناگہاں پیش آ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس صورت حالات سے غیر مطمئن ہیں اور اپنے ذہن کے وقتی اطمینان کے لیے کسی اور چیز کی جستجو میں ہیں۔ انہیں یہ چیز جہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے اس طرف رجوع کرنا چاہیے، ہم ان کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علم اور مادہ پرست لوگ مذہبی عقیدہ کو محض منفی نظریات کے بل پر رو کرتے ہیں۔ نیز ان کے پاس انسان کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایسی کوئی شے نہیں ہے جو مذہب کی جگہ لے سکے۔ یہ بات مشکوک ہے کہ سیگمنڈ فرائیڈ کے نظریات نے انسانی مصائب کی تخفیف میں کوئی تعمیری حصہ لیا ہے۔ ان نظریات کے مقبول اور موثر قوت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادہ پرستانہ فلسفہ کے اس عام رجحان کو تقویت بخشتے ہیں جو انسان کو مرتبہ انسانیت سے گرا کر جانور کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذہنی نظریہ کو اپنانے کے بعد کسی آفت و کبت کے مار سے ہونے شخص کے لیے خود کشی کے سوا اور کیا چارہ کار رہ جاتا



ہے؛ اگر مذہب ایک طفلانہ وہم ہے تو مادہ پرستوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انسان کو اگر سلامتی عقل و ہوش مطلوب ہے تو پھر اس کی ان جہلی خواہشات کو کس طرح پورا کیا جاسکتا ہے، جو زمان و مکان سے ماوراء پوری نوع انسانی میں عالم گیر بنیادوں پر پائی جاتی ہیں۔

دماغی تعطل کے چند بڑے اسباب حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اپنے آپ سے نفرت۔

۲۔ مصیبت کو برداشت نہ کر سکرنا۔

۳۔ دنیاوی کامیابی کے حصول میں ناکامی۔

۴۔ مستقبل کے متعلق خوف اور پریشانی۔

۵۔ یہ دوسرے کہ انسان کی زندگی کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتی۔

موت اپنے وقت پر بجائے خود ایک عمدہ اور کارآمد شے ہے۔ کبھی کبھار یہ نوجوان صحت مند، خوش نصیب اور نافع افراد کے لیے بھی قرین مصلحت ہوتی ہے۔ بوڑھوں، بیماروں، دکھیوں اور امید ورجاء سے محروم زندگی بسر کرنے والوں کے لیے تو واقعی نہایت تنفیق ہے۔ بنابرین وہ شخص جو بعض خاص حالات میں اپنی موت کا وقت خود منتخب کرتا اور بڑے شاندار طریقے سے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، ہمارے افسوس و تاسف اور لعنت و ملامت کے بجائے عزت و احترام کا مستحق ہے۔

اسلام "ذاتی تحفظ" کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ صحیح معنوں میں ایک مسلمان فرد خود مجسم اسلام ہے اس لیے اس کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسلمان کا فرض ہے

کہ وہ اپنے جسم و جان کی حفاظت کرے اور اس مقصد کو بنیادی اہمیت دے۔ اس سلسلے میں صرف ایک استثنائی صورت ہے۔ جب مسلمان کی انفرادی بہبود معاشرہ کی اجتماعی فلاح سے اس طرح متصادم ہو جائے کہ ایک کا حصول دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہ ہو۔ اُس وقت مسلمان مجبور ہے کہ وہ اپنی ذات پر معاشرہ کو ترجیح دے اس لیے کہ وہ اس معاشرہ کا ایک جزو ہے اور کسی چیز کے جزو کو اُس چیز سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی اچنانچہ جب جہلو کے لیے مسلمان کو پکارا جائے تو اُس وقت اُسے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے گھر میں بیٹھ رہے۔ اس ایک استثنائی کے علاوہ وہ نہ تو اپنے آپ کو ارادہ کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے جس سے اطلاق ذات کا اندیشہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو لحم خنزیر ایسی نجس اور غلیظ غذائیں کھانے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ اس کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی صحت کے لیے مضر ہیں۔ اسی طرح زہریلے مشروبات یا منشیات مثلاً مخدرات یا الکوحل وغیرہ پینے کی ممانعت کر دی گئی ہے، جو انسان کے جسم اور ذہن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مزید برآں اُسے کسی قسم کی بے اعتدالی کا عادی ہونے کی بھی اجازت نہیں کیونکہ ان سب کا نتیجہ اطلاق جان کی صورت میں نکلتا ہے۔ اُسے حکم ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے محبت کرے اور اُن کا ہاتھ بٹائے تاکہ لوگ بھی اس سے محبت کریں اور بوقت ضرورت اُس کو سہارا دیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے ہر حالت میں خود کشی سے روکا گیا ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

الَّذِي يَخْنُقُ نَفْسَهُ يَخْنُقُهَا فِي النَّارِ وَالَّذِي يَطْعُنُهَا يَطْعُنُهَا

فِي النَّارِ (بخاری)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا

گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر مرجائے گا دوزخ میں بھی وہ

اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔

اسلام خودکشی کو بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ خودکشی کا فعل درحقیقت یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے مرتکب کا نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور نہ آخرت کی زندگی پر۔ یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمانوں کا معاشرہ خودکشی سے فی الواقع بالکل بیگانہ رہا ہے۔

معاشرتی انتشار جو آج کے نام نہاد "ترقی یافتہ" ممالک کا امتیازی خاصا بن چکا ہے، لاتعداد ذہنوں کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم اپنے مضمون "فلاحی ریاست کی دوہری مشکل" — بہتات کے درمیان تنہائی میں لکھتے ہیں:-

جدید معاشرہ انفرادیت پر جس طرح حد سے زیادہ زور دے رہا ہے اس سے خاندانی روابط ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمسایوں، بلکہ دوستوں اور رشتہ داروں تک کی حالت سے اعراض و غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تنہائی کی مصیبت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے سیکرٹری، سرکاری ملازمین، استاد، نرسیں حتیٰ کہ ڈاکٹر تک تنہائی کے شاکا ہیں۔ ان کا پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ فطری اعتبار سے وہ تنہائی پسند بھی نہیں ہیں، لیکن شہر میں انہیں ذاتی تعلقات قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ چنانچہ وہ یکا دو تنہا رہنے پر مجبور ہیں۔ نوجوانوں اور بوڑھوں کی تنہائی کی جڑیں یکساں نوعیت کی بے کیفی میں پہناں ہیں۔ ایک برسرِ کار ہے دوسرے کو نیشن ملتی ہے، لیکن انہیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے، اس کے متعلق کسی کو کوئی فکر و تردد نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ سن رسیدہ لوگوں کی حالت تو بے حد قابلِ رحم ہے۔ گھٹھے یا وجعِ مفاصل کے مریض، اکثر کانوں سے بہرے اور بعض اوقات بینائی سے محروم ایک کمرے یا فلیٹ



میں بڑی بے بسی کے عالم میں پڑے رہتے ہیں۔ بچے اور یار دوست عموماً پہلے ہی مرچکے ہوتے ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ بیمار ہو جائیں یا چل بسیں اور کسی کو خیر تک نہ ہونے پائے۔ بے مونس و غم خوار لوگوں کی تعداد برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک بلکہ امریکہ تک میں گزشتہ بیس برس سے برابر بڑھ رہی ہے اور وہ ملک جن کی حرکت پذیری کی صلاحیت جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے لا شخصیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کے عام ڈاکٹروں، امراض دماغی کے ماہروں اور سماجی کارکنوں کے لیے یہ ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ انگلستان کے ہسپتالوں میں ایک تہائی مریض دماغی امراض کا شکار ہوتے ہیں اور سینکڑوں تنہائی کی زندگی کا تادبرداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ اسلام شادی بیاہ اور محبت بخش خاندانی زندگی کی فیصلہ کن اہمیت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے وہ اپنے چھوٹوں پر شفقت کریں اور بزرگوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں۔ ایک مرتبہ ایک بددور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اقبال کیا کہ میرے دس بچے ہیں، مگر میں نے کبھی کسی کو نہیں چوما، حضور نے اُسے سخت سرزنش کی۔ اسلام مسلمانوں کو اپنے خاندان کے افراد ہی سے محبت کرنے اور ان کا ہاتھ بٹانے کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور دوسرے دینی بھائیوں کے ساتھ باہمی اشتراک و معاونت کے گہرے تعلقات قائم رکھیں۔ انعام و اخوت کا یہ قومی شعور ذہنی صحت کو محفوظ رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔



اسلام کی رُوسے دنیا کی زندگی کوئی تفریحی سفر نہیں ہے بلکہ بڑی ہی شدید آزمائش ہے جس کے نتائج آخرت میں حقیقت کا جامہ پہنیں گے۔ بنا بریں انسان اس دنیا میں جن بد بختیوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، وہ قطعی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کے ذریعے تو یہ جانچا جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ایمان کے دعوے میں کس حد تک سچا اور ثابت قدم ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ  
مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔

(البقرہ: ۱۵۵)

”اور ہم ضرور تمہیں خوف و ہراس، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصان اور  
پیسوں کی کمی سے تمہاری آزمائش کریں گے اور (اے پیغمبر) صبر کرنے والوں کو  
خوش خبری دے دو۔“

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ  
خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُّوا حَتَّى  
يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ  
أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ (البقرہ: ۲۱۴)

”کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے،  
حالانکہ ابھی تم اُن واقعات سے دوچار نہیں ہوئے جو تم سے پہلے ایمان لانے  
والے لوگوں کو پیش پہنچے ہیں۔ اُن پر ہر طرح کی سختیاں گزریں، مصیبتوں  
کے پہاڑ ٹوٹے، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے مومن ساتھی  
پکارا اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔“ — اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ

ہاں اللہ کی مدد قریب ہے ۱

كُتِبَتْ لَكُمْ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ - (آل عمران: ۱۸۵)

”تمہیں جان و مال کی آزمائش میں ضرور مبتلا کیا جائے گا۔“

أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ

لَا يُفْتَنُونَ - (العنکبوت: ۲)

”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ مرنے سے پہلے

سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کو آزمائش کی بھٹی میں نہیں ڈالا جائیگا“

قرآن و حدیث ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں اہل ایمان کو اس لیے مصائب میں

مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ اُن کے گناہ و محل جائیں۔ وہ موت کے بعد سزا سے پرچ جائیں اور آخرت کے عظیم تر انعامات سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

من یدر اللہ بہ خیرا یصیب منہ (بخاری)

”ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

جب کسی شخص کے ساتھ بھلائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بھلائی حاصل

کرنے کے لیے مبتلائے مصیبت ہو جاتا ہے۔“

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا

أَرَادَ اللَّهُ تَعَالَى بَعْدَ الْخَيْرِ عَجَلَ لَهُ الْعُقُوبَةُ فِي الدُّنْيَا

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بَعْدَ الشَّرِّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتَّى

يُؤَانِيَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ - (ترمذی)

”انسؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ

اپنے کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دنیا ہی میں جلد سزا

دے دیتا ہے اور جب وہ کسی بندہ کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا روک لیتا ہے تاکہ قیامت کے دن وہ اسے پوری پوری سزا دے۔“

کسی افتاد کو پرسکون ذہن کے ساتھ صبر سے برداشت کرنا ہی سچے مسلمان کا نشان ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ - (البقرہ: ۱۵۳)

”اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔“

وَلَنَجْزِيَنَّهُ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا

يَعْمَلُونَ - (النحل: ۹۶)

”اور ان لوگوں نے جنہوں نے صبر سے کام لیا، ہم ضرور ان کے اعمال کا

بہترین اجر دیں گے۔“

وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا

عَلَى الْخَاشِعِينَ - (البقرہ: )

”اور صبر اور نماز سے مدد لو، یقیناً یہ ایک سخت مشکل کام ہے مگر عاجز و

خاکسار بندوں کے لیے (کچھ مشکل) نہیں۔“

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ - (العمر: ۳)

”یقیناً انسان گھٹنے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور جو ایک دوسرے کو حق کی پیروی کرنے

اور صبر سے کام لینے کی تاکید کرتے رہے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَرَاةٍ

تَبَكَ حِينَ قَبْرِ فَقَالَ اتَّقِ اللَّهَ وَاصْبِرْ قَالَتْ إِلَيْكَ عَنِّي فَأَنْتَ  
 لَمْ تُصَبِّ بِمَصِيبَتِي وَلَمْ تَعْرِفْهُ فَقِيلَ لَهَا اللَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى  
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَتْ بِأَبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بِتَوَابِينَ فَقَالَتْ لَمْ أَعْرِفْكَ فَقَالَ أَنَا الصَّبْرُ  
 عِنْدَ الْمُتَدَمِّمَةِ الْأُولَى (بخاری و مسلم)

”انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس  
 سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپؐ نے اُس سے فرمایا: ”اللہ  
 سے ڈر اور صبر کر۔“ اس عورت نے حضورؐ کو نہ پہچانا۔ شدتِ غم سے پکار اُٹھی،  
 ”جس مصیبت میں میں مبتلا ہوں تو اس میں گرفتار نہیں ہوا، رنجے اس کا  
 کیا احساس؟“ اس سے کہا گیا کہ (بد بخت!) وہ تو حضورؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ  
 وسلم تھے، چنانچہ وہ حضورؐ کے دروازے پر پہنچی، وہاں اسے کوئی حاجب و  
 ودبان نظر نہ آیا۔ حاضر خدمت ہو کر عرض کی: ”اے اللہ کے رسولؐ، میں  
 نے آپؐ کو پہچانا نہیں تھا۔“ فرمایا: ”صبر تو بس وہی ہے جو صدمہ کے آغاز  
 میں کیا جائے۔“

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:  
 الصَّبْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ - (ابو نعیم)

”ابن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صبر آدھا  
 ایمان ہے۔“

مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کی طرف سے عاید  
 کردہ فرائض کو اس یقین و اعتماد کے ساتھ انجام دیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے اور  
 حصولِ مقصد تک اس یقین و ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہیں کہ — ہمارے لیے



اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (آل عمران ۷۲)  
 سچا مسلمان خاصاً اللہ کی رضا کے لیے نیک کام کرتا ہے اس لیے کہ جو کام دنیا کی  
 خاطر کیے جاتے ہیں مذہب کی رُو سے اُن میں کوئی حُسن و خوبی نہیں ہے۔ بنا بریں اگر دنیا میں  
 لوگ اُس کے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں پر تحسین و آفرین کے پھول پھاڑ نہیں کرتے تو وہ  
 ذرا بھی مایوس نہیں ہوتا:

إِنَّمَا نُنْعِمُكُمْ لِيُوجِبَ اللَّهُ لَكُمُ الْكِرَامَ مِنْكُمْ بجزاءً وَلَا شُكُورًا۔

(الدھر: ۹)

”کہتے ہیں کہ ہم تو محض اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے  
 بدلے کے خواہاں ہیں نہ شکر گزاری کے۔“

جو شخص اپنے اللہ پر اعتماد کامل رکھتا ہے اور قرآن کریم اور سنت رسول کی پیروی  
 میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے، اگر دنیا کی زندگی میں اس کی مساعی بار آور نہیں ہوتیں۔  
 تب بھی وہ کسی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتا، اُسے اپنی ناکامی کا احساس تک  
 نہیں ہوتا۔

مَنْ أَسْلَمَ وَجَمَعَهُ اللَّهُ وَهُوَ مُعْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ

رَبِّهِ۔ (البقرہ: ۱۱۲)

”جو بھی اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً  
 نیک روش اختیار کرے اس کے رب کے ہاں اُس کے لیے اجر ہے۔“  
 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ  
 الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔ (الکہف: ۱۰۷)

”بے شک جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے رہے ان کی جائے قیام  
 جنت فردوس ہوگی۔“

لَيْسَ بِدِينَانِ إِلَّا مَتَاعٌ - ر

”انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے دو جہاد جہد کرتا ہے۔“  
صحیح احادیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ نہ کسی شخص کی دنیوی کامیابی پر فریفتہ نہ ہوں، کہے خبر ہے کہ موت کے بعد اُس کی قسمت میں کیا ملے گا ہے:

عن عمر قال دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم  
فاذا هو مضطجع على رمال حمير ليس بيته وبينه فراش  
قد أثر الرمال بجانبه متكئا على وسادة من آدم حشوقا ليل  
قلت يا رسول الله ادع الله فليوسع على أمتك فإني  
فارس ودروم قد وسع عليهم وهم لا يعبدون الله  
فقال آذني هذا انت يا ابن الخطاب اولئك قوم عجلت  
لهم طيباتهم في الحياة الدنيا وفي رواية اما ترضى ان  
تكون لهم الدنيا ولنا الآخرة (متفق عليه)

”عمرؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں  
”مزہوا آپ اُس وقت کھجور کے پتھوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔  
چٹائی کے اوپر کوئی بوریا بستر نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نشان  
سے پڑ گئے تھے۔ حضور کے سر ہانے چڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور کی چال  
بھری ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اللہ سے دُعا  
فرمائیے، وہ آپ کی اُمت کو بھی فراخ دستی و خوش حالی عطا فرمائے۔  
فارس و دروم کے لوگ کس قدر خوش حال ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی  
عبادت نہیں کرتے۔“ حضورؐ نے فرمایا: ”خطاب کے بیٹے، کیا تم بھی اسی

خیال میں ہو؟ اُن لوگوں کو تو دنیا ہی کی زندگی میں حیش و آرام کے سامان دیدیے گئے ہیں، کیا تم مطمئن نہیں ہو کہ اُن کے لیے دنیا ہے ہمارے لیے آخرت؟

و ما غنی صحت کے سب سے بڑے دشمن دو ہیں۔ خوف اور پریشانی۔ مستقبل میں کیا ہو۔

گا: انسان کے ذہنی توازن کو بگاڑنے کے لیے اس سے بڑھ کر پریشان کن سوال اور کوئی نہیں ہے، لیکن نچتہ ایمان کے مسلمان فکر و تشویش میں ذرا بھی مبتلا نہیں ہوتے، اس لیے کہ ہم مستقبل کے پردے میں جھانک ہی نہیں سکتے۔ مستقبل صرف خدا ہی پر عیاں ہے؛ بنا بریں یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ کون سی چیز ہمارے لیے اچھی اور قابلِ اطمینان ہوگی؟

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ

أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا

تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ: ۲۱۶)

”ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ اپنے اندر تمہارے لیے بُرائی

کا سامان رکھتی ہو۔ ہر بات کا علم اللہ کو ہے اور تمہیں کوئی علم نہیں؟“

رزق کے بارے میں فکر و تردد آج کی دنیا کا سب سے بڑا انسانی مسئلہ ہے۔ ایک

کافر جب اس مشکل سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے طرزِ عمل کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے کیا جاسکتا ہے:

”سیبل اٹھارہ برس کی ایک بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں۔

تیسری مرتبہ پھر حاملہ ہو گئی۔ اُس کا شوہر ٹیڈ ایک معمولی مزدور تھا اور دن بھر خون

پسینہ ایک کر کے تھوڑی سی رقم لے آتا تھا۔ سیبل نے بڑی دل شکستگی اور فردگی

کے عالم میں ٹیڈ سے کہا: اس بچے سے میں چھٹکارا پا کر رہوں گی خواہ مجھے جان

ہی کیوں نہ دینی پڑے؛ چنانچہ اس نے پڑوس کے ایک دوا فروش سے مدد

طلب کی۔ دوا فروش نے چند گویاں اُس کے ہاتھ بیچ دیں۔ مقصد تو پورا نہ ہوا،  
البتہ وہ بیمار ہو گئی۔ اپنی ایک سہیلی کے مشورہ پر اُس نے ہنس کے چکنے پر  
کے ذریعے اسقاط کی کوشش کی، مگر کچھ نہ بنا۔ ایسی متعدد چیزیں اس نے  
یکے بعد دیگرے استعمال کیں، لیکن تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اپنی دھمکی  
پر عمل کرتے ہوئے اُس نے خودکشی نہ کی۔ بچہ اپنے وقت پر پیدا ہو گیا۔ وہ  
ایک ایسا نوزاد تھا جس کی اس غربت زدہ گھرانے میں نہ تو باپ کو پناہ تھی اور  
نہ جذباتی مدد تک مضطرب ماں کے دل میں اس کے لیے کسی قسم کی کوئی محبت  
یا مسرت تھی

اس کے برعکس ایک سچے مسلمان کا یقین و ایمان کس بات پر ہے؟ ایک نظر اس  
پر بھی ڈال لیجئے!

عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله صلى الله  
عليه وسلم يقول كَوْنُوا نَكَه تَوَكَّلُوا عَلَى اللَّهِ حَقًّا تَوَكَّلُوا  
لِرَزْقِكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرُ قَعْدًا وَخِفَافًا وَتَرَوْهُمْ يَطَافُوا۔  
(ترمذی - ابن ماجہ)

”عمر بن خطابؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے  
سنا ہے کہ اگر تم خدا پر ایسا بھروسہ کرو، جیسا کہ بھروسہ کرنے کا حق ہے تو وہ  
تمہیں اس طرح رزق دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے۔ وہ صبح کے

---

The Sex Life of the Modern American Teen-Ager,  
Leland Glover, Belmont Books, New York, 1961,  
pp. 173-174.



وقت بموت کے نکلنے ہیں اور شام کو اپنے اشیانوں میں لوٹتے ہیں تو ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔“

عن ابی ذرٍّ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انی لا علم ایۃ لخواخذ الناس بها مکفّتهم ۚ من یتقی اللہ یمجّل لہ منجرباً ویزدقہ من حیث لا یحتسب۔

(مسند امام احمد - ابن ماجہ)

”ابو ذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہی ان کے لیے کافی ہو رہے (اور وہ یہ آیت ہے) مَنْ یَتَّقِ اللہ..... الخ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اُس کے لیے نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرتا ہے جہاں سے اُس کو خیال و گمان ہی نہیں ہوتا۔“

عن ابن مسعود قال اقرأ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّیْ اَنَا الرَّزَاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِّینِ۔ (ابو داؤد - ترمذی)  
”عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ آیت سکھائی اِنِّیْ اَنَا الرَّزَاقُ..... الخ یعنی بلاشبہ میں ہی رزق دینے والا اور صاحب قوت ہوں۔“

بزدل انسان کا اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان و اعتقاد ہی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ خالق سے نہیں مخلوق سے ڈرتا ہے۔ مسلمان صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ اُس کا یقین ہے کہ ذاتِ خداوندی اُس کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اللہ ہر وقت ہماری حفاظت کر رہا ہے اور چونکہ ہماری قسمت کا نوشتہ پہلے ہی سے طے کر دیا گیا ہے اس لیے ہمیں وقت مقررہ

سے پہلے کوئی شخص مار نہیں سکتا۔ اس عقیدہ پر یقین و اذعان انسان کو جرات و بہت اور ذہنی طاقت سے نوازتا ہے۔

عن جابرؓ انه غزا مع النبي صلى الله عليه وسلم قبل نجي  
فلما قفل رسول الله صلى الله عليه وسلم قفل معه فادرعهم  
القائلة في وادٍ كثير العضاة فنزل رسول الله صلى الله عليه  
وسلم . تفرق الناس ينظرون بالشجر فنزل رسول الله صلى  
الله عليه وسلم تحت سمرة فعلق بها سيفه ونمنا  
نومته فاذا رسول الله صلى الله عليه وسلم يدعونا واذا  
عنده احدائي فقال ان هذا اختلط على سيفي وانا نائم  
فاستيقظت وهو في يدي صلتا قال : من يمنعك مني .  
قال : الله . فسقط السيف من يدي فاخذ رسول الله  
صلى الله عليه وسلم السيف فقال : من يمنعك مني  
فقال : كن خير اخي ..... فعلق سبيلك . فاتي  
اصحابك فقال جئتكم من عند خير الناس .

”جابرؓ کہتے ہیں : انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نجد  
کے قریب کسی مقام پر جنگ میں حصہ لیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے  
ہمراہ واپس ہوتے۔ دوپہر کے وقت صحابہ رضہ ایک جگہ پہنچے جہاں بکثرت  
بہول کے درخت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پڑاؤ ڈال  
دیا۔ صحابہ رضہ درختوں کے سائے کی تلاش میں ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بہول کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے  
قیام فرمایا اور اپنی تلوار و رخت کے ساتھ لشکادی۔ مقررہ دیر بعد ہمیں

نہینے آیا۔ اچانک ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی۔ حضور ہمیں  
 پکار رہے تھے اور آپ کے پاس ایک بڈو بیٹھا ہوا تھا۔ حضور نے ہمارے  
 پیچھے پر ارشاد فرمایا: "میں سو گیا تھا۔ یہ شخص آیا اور میری تلوار سونت لی۔  
 میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے اور کہہ  
 رہا ہے: "تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" میں نے کہا: "اللہ"۔ یہ سن  
 کر تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ (ایک اور روایت میں ہے)۔ حضور نے وہ  
 تلوار اٹھالی اور فرمایا: "اب بتلے تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" بڈو نے  
 کہا: "آپ بہترین مواخذہ کرنے والے ہیں"۔۔۔۔۔ پھر حضور نے اسے  
 چھوڑ دیا۔ وہ اپنے لوگوں میں پہنچا تو کہنے لگائیں ایک بہترین انسان کے  
 پاس سے آ رہا ہوں۔"

ایک سچے مسلمان کے ساتھ دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے اُس سے وہ مثبت اور تعمیری  
 اثر قبول کرتا ہے۔ کوئی خیر و خوبی کی چیز ہوتی ہے تو اُس کے فوائد سمیٹتا ہے اور  
 کوئی مصیبت ہوتی ہے تو صرف اُس کے مثبت پہلو کے متعلق سوچتا ہے، کیونکہ ہر تجربہ  
 اپنے دامن میں ایک سبق رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کسی ناگزیر المیہ سے دوچار ہوتا ہے مہر و  
 توکل کے ساتھ اللہ کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى

اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ - (التوبہ: ۵۱)

”کہو، ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی، مگر وہ جو اللہ نے

ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولا ہے اور اہل ایمان کو اسی

پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ بعض لوگ اس سے بچنے کی کوشش کرتے اور





۸۲

## اسلام اور صفائی پسندی

آج مسلمان ممالک میں بے حد گندگی اور غلاظت پائی جاتی ہے۔ باہر سے آنیوالے لوگ مسلمانوں سے جو نفرت کرتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ گندگی اور غلاظت بھی ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ساری شہرت اور ساکھ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کسی بھی یورپین سیاح سے پوچھئے۔ ”دنیا بے اسلام کے ملکوں اور عوام کے متعلق اُس کا کیا خیال ہے؟“ آپ کو ہمیشہ ایک جواب ملے گا: ”وہ کتنے غلیظ ہیں!“ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یہ مکتہ چینی بسا اوقات اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ خود یورپین نژاد نو مسلم محض اسی وجہ سے ارتداد کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک بڑی اچھی دوست — ایک جرمن نو مسلم — بیگم فاطمہ ہیرن مکر کا ہیں۔ وہ ادران کے شوہر اُن دنوں ایک مسلمان ملک میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۴ء کو بیگم فاطمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا:

”میرے شوہر اس ملک میں پھیلی ہوئی گندگی سے بے حد متنفر ہو چکے ہیں۔ ان کے دفتر کی دیواریں خصوصاً میسرے پان کی پیک سے لال سیاہ ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنی پتلون کے ٹخن باتھ روم میں نہیں اپنے میز



”جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :  
جنت کی کلید نماز ہے اور نماز کی کلید طہارت اور صفائی۔“

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه  
وسلم لا تقبل صلاة بغير طهور ولا صدقة من غلول۔

(مسلم)

عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :  
بغیر پاکیزگی یا وضو کے نماز نہیں ہوتی اور نہ مالی حرام کی خیرات قبول ہوتی ہے۔“  
عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

اذا جاء احدكم الجمعة فليغتسل۔ (متفق علیہ)

”عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :  
جب تم میں سے کوئی شخص نماز جمعہ پڑھنے آئے تو چاہیے کہ غسل کر کے آئے۔“

”عمر بن سلیمؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جمعہ  
کے روز غسل کرنا ہر بالغ شخص پر فرض ہے، اُسے مسواک بھی استعمال کرنا  
چاہیے اور بل سکے تو خوشبو بھی۔ (بخاری)

اسلام کی ان تعلیمات کا مقابلہ اُس غلاظت سے کیجئے جو قرون وسطیٰ کے یورپ  
میں مسیحیت کو پسند تھی :

(ابتدائی دور کے) مسیحی جم کی پاکیزگی کو روج کی آلودگی گردانتے تھے  
اور ان اولیاء اور بزرگوں کی سب سے زیادہ مدح و توصیف کی جاتی تھی جو



گندگی اور میل کچیل کا مکروہ مرتفع ہوتے تھے۔ سینٹ اینٹھاناسیوس بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سینٹ اینتھونی بڑھا فضیلت ہو گیا لیکن اس سے اپنے پاؤں دھونے کا گناہ کبھی سرزد نہ ہوا۔ سینٹ ابراہیم جو مسیحی ہونے کے بعد پچاس برس تک زندہ رہا اتنا محتاط تھا کہ اس سانسے عرصے میں نہ تو اس نے اپنے ہاتھ دھوئے نہ پاؤں۔ ایبٹ ایگزنڈر ماضی کی تاریخ پر جب بھی نگاہ حزیں ڈالتا تو پکاراٹھتا تھا: ”ہمارے آباء نے تو کبھی منہ تک نہ دھویا تھا اور ہم ہیں کہ پبلک حماموں میں اکثر جانے لگے ہیں۔۔۔۔۔“

اسلام جسمانی صفائی اور حفظانِ صحت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ صفائی اور طہارت نہ صرف دنیوی زندگی میں جسمانی صحت برقرار رکھنے، بلکہ آخرت کی زندگی میں روح کی نجات کے لیے بھی ضروری ہے۔ رفیع ماجت اور گہری نیند سے اٹھنے کے بعد نماز سے پہلے وضو نہایت ضروری ہے۔ جمعہ اور عیدین کی نماز سے پہلے اور جماع، احتلام، حیض، پکے کی ولادت اور میت کو نہلانے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔ یورپ اور امریکہ کے نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں بھی آج صفائی اور طہارت کے ان لازمی امور پر عمل نہیں کیا جاتا۔

اسلام دانتوں اور منہ کی صفائی کی بہت زیادہ تاکید کرتا ہے۔

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السَّوَاكُ مَطْهُرَةٌ لِلْفَمِ مَرْمَنَةٌ لِللِّسَانِ (بخاری)

”عائشہ کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسواک منہ کو

پاک صاف کرتا ہے اور پروردگار کی خوشنودی و رضا کا باعث ہے۔“

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لولا ان اشدق علی امتی لامرتم بالاستواء عند کل صلوۃ۔

(بخاری و مسلم)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ

خیال نہ ہوتا کہ میری امت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی تو میں انہیں حکم دیتا کہ وہ

ہر نماز کے وقت مسواک کریں۔“

کھانا کھانے کے بعد کٹی کرنا اور دانت صاف کرنا بھی سنت ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پاک صاف منہ کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اپنی دنات سے پہلے

آپ نے جو آخری کام کیا وہ مسواک کا استعمال تھا۔ منہ کی صفائی کے متعلق اسلام کی تعلیمات

پر اگر ان نام نہاد ترقی یافتہ ”حماک میں جہاں دانتوں کی خرابی اور گندی سانس عام

ہے، سختی کے ساتھ عمل کیا جاتے تو بے خوف و خطر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ دندان

سازوں کا کاروبار مندا پڑ جائے گا۔

مسلمانوں پر اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا ہی فرض نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے

کہ اُس کا لباس ناپاک نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے رفیع حاجت کے بعد مٹی کے ڈھیلوں سے

استنجا کرنا لازمی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عذاب قبر کی ایک وجہ

یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے کپڑوں کو بول و براز کے چھینٹوں اور نجاست سے بچانے کی احتیاط

نہ کرے۔

عن ابی ہریرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتی

الخلاء اتیتہ بای فی تور و رکوة فاستنجا ثم مسح یدہ علی

الارض ثم اتیتہ بانایہ اخر فتوضأ۔ (ابوداؤد)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں جلتے، میں  
 آپ کے لیے پیالہ یا دھڑے کی، چھاگل میں پانی لاتا۔ حضور اس سے استنجا  
 کرتے، پھر ہاتھ دھو دین پر گزرتے، پھر میں پانی کا ایک اور برتن لاتا اور حضور  
 وضو فرماتے۔“

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لا تقبل صلوۃ من احدک حتی یتوضا (بخاری و مسلم)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے وضو کی نماز  
 قبول نہیں کی جاتی جب تک وہ وضو نہ کرے۔“

اس معمول سے تو مغربی ممالک کے لوگ بالکل نا آشنا ہیں۔ وہ ”ٹائلٹ پیپر“ استعمال  
 کرتے ہیں جو اس مقصد کے لیے ناکافی ہے۔

نماز کے لیے جسم اور لباس کا پاک صاف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ نماز کی جگہ کا  
 بھی گندگی اور نجاست سے پاک ہونا چاہیے۔ صرف ایسی نماز ہی اللہ کے نزدیک قابل  
 قبول ہو سکتی ہے۔ اس حکم کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے کہ مسلمان اپنے گھر اور گلی کو چھ  
 صاف ستھرے رکھیں، اس لیے کہ اسلام کے نزدیک گلی روئے زمین مسجد ہے۔ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بول و براز کی حاجت ہو تو مناسب جگہ تلاش کر کے بیٹھو۔

عن جابر قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد

البراز انطلق حتی لا یراء احد۔ (ابوداؤد)

”جابر کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پاتھانہ کو (جنگل میں) جانے کا

ارادہ فرماتے تو ایسی جگہ تشریف لے جاتے کہ آپ کو کوئی نہ دیکھتا۔“

کس قدر ثمرناک بات ہے کہ دورِ جدید کے مسلمان اپنے عمل سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی ان تعلیمات کی تفہیم کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں لاہور میں یہ منظر عام دیکھنے میں آتا

ہے کہ مرد (بلکہ بعض اوقات عورتیں بھی) بھرے پُرسے گلی کوچوں میں ساری دنیا کے سامنے  
پیشاب کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

عن معاذٍ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتقوا  
الملا عن الثلاثة البواز في الموارد وقارعة الطريق والظل۔  
(ابوداؤد)

”معاذ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں سے  
بچو جو لعنت پھٹکار کا موجب ہیں (۱) بول و براز کرنا دریا کے گھاٹ پر (۲)  
راستہ کے درمیان اور (۳) سایہ میں“

پبلک مقامات پر تھوکنے کی بھی حدیث میں مذمت کی گئی ہے۔

عن انسٍ قال رأى النبي صلى الله عليه وسلم غمامة  
في القبلة فشق ذلك عليه حتى رقى في وجهه فقام فحكه  
بيده..... ثم اخذ طرف رعايته فبصق فيه ثم  
دّ جعده على بعض فقال او يفعل هكذا۔ (بخاری)

”انس کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قبلہ کی جانب بلند پڑا  
ہوا دیکھا تو آپ کو بے حد ناگوار ہوا، اتنا ناگوار کہ اس کے آثار چہرہ مبارک  
پر ظاہر ہو گئے۔ آپ اٹھے اور اپنے ہاتھ سے اُسے گھرچ ڈالا اس کے بعد  
آپ نے اپنی چادر کے کونے میں تھوکا اور اُس کو نل کر فرمایا کہ اس طرح کرنا  
چاہیئے۔“

حدیث میں تنبیہ کی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنے پڑوسی کے گھر کے سامنے پھل ریڑ  
کے چھلکے اور دوسرا گڑا کر کٹ پھینک کر اُسے دکھ نہ دے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی یہ سنت یہاں لاہور میں جیسے بالکل فراموش کی جا چکی ہے۔ یہاں گلی کوچے نہایت



گندے ہیں، جگہ جگہ خلافت اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر اور ڈرم وغیرہ پڑے ہیں اور شہر والوں کی زندگی دو بھر کیے دے رہے ہیں۔

آج کل ٹیوائیہ سمجھا جاتا ہے کہ صفائی، خصوصاً شہر اور گلی کوچوں کی صفائی جدید مغربی تہذیب کی ٹیکنالوجی اور سائنس کا خصوصی کارنامہ ہے۔ یہ محض ایک غلط مفروضہ ہے۔ اسلامی تہذیب نے سب سے پہلے اپنے علمبرداروں کو یہ عمرانی و تمدنی شعور عطا کیا۔ آج بھی دور افتادہ مسلمان شہروں اور قصبات میں یہ شعور مفقود نہیں ہے۔ محمد اسد نے اپنی کتاب میں سعودی عرب کے ایک ایسے ہی شہر کا ذکر کیا ہے جہاں وہ ۱۹۳۲ء میں گئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس شہر کو جدید تہذیب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

”حائل بغداد یا مدینہ سے کہیں زیادہ عرب شہر ہے۔ یہاں غیر عرب ملکوں اور لوگوں کا کوئی عنصر نہیں ملتا۔ یہ تازہ دودھ ہے ہوتے دودھ کے پیالے کی طرح خالص اور بے آمیزش ہے۔ بازار میں کہیں غیر ملکی لباس نظر نہیں آتا۔ بس ہر طرف عرب عبا میں، کیفیہ اور عقال دکھائی دیتے ہیں۔ گلی کوچے مشرق وسطیٰ کے کسی بھی اور شہر سے زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ نجد کے شہر صفائی میں دور دور تک مشہور ہیں، حائل ان کو بھی پیچھے چھوڑتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ انہوں نے مشرق کے دوسرے تمام لوگوں سے کہیں زیادہ اپنی خودداری کو قائم رکھا ہے اور اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔۔۔۔۔“

دنیا تے اسلام کے ممالک اپنی گندگی میں اس قدر بدنام کیوں ہیں؟ محمد اسد نے مندرجہ بالا اقتباس میں اس کے اہم ترین سبب کی نشاندہی کی ہے۔ غربت و افلاس کافی الحقیقت اس عجیب و غریب صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور

صحابہ کرامؓ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے کہ آج کے غریب ان کے مقابلے میں متمول  
 نظر آتے ہیں۔ غربت و افلاس میں بلاشبہ صاف ستھرا رہنا خاصا مشکل ہوتا ہے، لیکن عرب  
 ایسے گرم اور بنجر ملک میں، جہاں پانی کی بے حد قلت تھی اور موجودہ دور کی سہولتوں مثلاً  
 ٹیل کے پانی وغیرہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریبی  
 ساتھی نہ تو کبھی بے ضرور رہتے تھے اور نہ ان کے گھر اور گلی کوچے گندگی اور کوڑا کرکٹ سے  
 اُٹے ہوتے تھے۔ اگرچہ صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کو ان کے جاہ و جلال اور خودداری سے  
 محروم کر دیا ہے لیکن اب جب کہ ہم آزادی و حریت سے ہمکنار ہو چکے ہیں ہمارے پاس اپنے  
 مذہب کی لازمی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہونے کا کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

---



Marfat.com



ہمارا جب کسی مغربی ملک میں جانا ہو تو ہمیں چاہیے کہ وہی لباس پہنیں جو اہل مغرب کا معمول ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنے آپ کو مضحک اور ان قوموں کی دل لگی اور خوش طبعی کا سامان بنادیں گے۔۔۔۔۔ (صفحہ ۵۴)

یہ ہے ان لوگوں کی ذہنیت جو یورپ کی محکومی سے ملنے والی میراث کی بدولت مغربی آداب زندگی کو جنہیں وہ خود بھی اپنا چکے ہیں، اس قدر بلند و برتر سمجھتے ہیں کہ ہماری تہذیب و ثقافت کو بھی انہی کی میزان پر تولنا چاہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی مسلمان ملکوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں لیکن وہ جیسا دیس ویسا بھیس کے "صحیح مقولہ" پر کبھی عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنے میزبانوں کی خاطر نہ تو اپنا لباس تبدیل کرتے ہیں اور نہ اپنے آداب بدلتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت انہیں توقع ہوتی ہے کہ دوسرے تمام لوگ ان کے آداب اپنالیں گے۔ اگر ہم مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں تو ہمیں بھی یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

مغربی آداب زندگی نہ صرف یہ کہ یکسر مختلف ہیں، تقریباً ہر اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے متناقض بھی ہیں۔ وہ مسلمان جو جدید مغربی آداب کے مطابق رہتے ہیں وہ اپنے سہنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ اپنی ذہنی و جذباتی غلامی ہی کا اعلان نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کی برخلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے، لہذا کسی دوسرے مرجع و ماخذ سے کوئی چیز مستعار لے کر اس کی "اصلاح" نہیں کی جاسکتی۔

مغربی نیشن اپنانے والے مسلمان یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔

وہ کسی خاص وضع قطع کے لباس کی تخصیص نہیں کرتا، بنا بریں ہم جس معاشرہ میں رہتے ہوں اُس کے مطابق ہمیں لباس پہننے کی کھلی چھٹی ہے۔ یہ ایک غلط مفروضہ ہے۔ مسلمانوں کو کس طرح کا لباس پہننا چاہیئے؟ قرآن و سنت دونوں اس باب میں صاف اور واضح ہدایات دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُم سَرَائِیلَ تَقِیْمُ الْحَرَّ وَسَرَائِیلَ تَقِیْمُ  
بِاسْکُف (النحل)

”اور (اللہ نے) تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ دوسری پوشاکیں بھی دیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔“

یٰبَنِی آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْآتِکُمْ  
وَرِیْثًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (الاعراف)

”اے اولادِ آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔“

گویا اسلام کے نزدیک لباس کا مقصد شرم و حیا، جغرافیائی حالات کے مطابق آب و ہوا کی سختیوں سے جسم کی حفاظت اور تن زیری ہے۔

مغربی لباس کا سب سے بڑا مقصد نیم برہنگی ہے اور باریک شفاف کپڑوں اور نہایت تنگ اور چست لباس کے ذریعے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا ہے۔

عن عائشۃ أنّ اسماء بنت ابی بکر کتبت علی رسول  
الله صلی الله علیہ وسلم وعلیہا ثیابٌ رَقَاقٌ فاعرض  
عنہا وقال یا اسماء ان المرأة اذا بلغت المحیض لن

يُصَلِّحُ اَنْ يَكْرِي مِنْهَا اِلَّا هَذَا وَهَذَا وَاَشَارَ اِلَى وَجْهِهِ  
وَكَفِيْدٌ - (ابوداؤد)

■ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُس وقت اُن کے جسم پر باریک کپڑے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: اے اسماء، جب لڑکی بالغ ہو جائے تو مناسب نہیں ہے کہ سوائے چہرے اور ہاتھوں کے اس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا رہے۔

يَخْضُضْنَ

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ  
خُرُوجِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا  
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوْبِهِنَّ - (النور)

”اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھائیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں، سوائے اس کے جو کسی طرح چھپ نہ سکے اور اپنے سینوں پر اوڑھنی اوڑھے رہیں۔“

اسلامی لباس صاف ستھرا، اجلا، مذاقِ سلیم کے مطابق اور وضعِ قطع میں سادگی، سنجیدگی اور وقار کا منظر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ مغربی لباس اس لیے زیب تن کرتے ہیں کہ وہ ”سمارٹ“ اور ”فیشن ایبل“ نظر آئیں۔ مغربی فیشن سراسر اسراف اور خود نمائی سے عبارت ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

من لبس ثوب شهرة في الدنيا أبسده الله ثوب مذلّة

يوم القيامة - (ابوداؤد)

”ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا میں شہرت کا لباس (ایسا لباس جس سے تکبر اور غرور کا اظہار ہو) پہنے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔“

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من جرد ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة (بخاری)

”ابن عمرؓ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اظہار تکبر کے لیے اپنا کپڑا نیچے لٹکائے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔“

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کفوا واشربوا وتصدقوا وابسروا ما لم يخالط اسراف ولا مخیلط۔

(احمد، نسائی، ابن ماجہ)

”عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دافا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ، پیو اور صدقہ خیرات کرو اور پہنوجبت تک کہ اسراف اور تکبر کی آمیزش نہ ہو۔“

حدیث ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قسم کا لباس زیادہ پسند تھا۔

عن أم سلمة قالت كان أحب الثياب إلى رسول الله

صلی اللہ علیہ وسلم القميص۔ (ترمذی، ابوداؤد)

”ام سلمہؓ کہتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کپڑوں میں قمیص سب سے زیادہ پسند تھی۔“



عن عبادة بن قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم  
عليكم بالعبائم فانها سيئات الملائكة وارغوها خلف ظهوركم

(ربيعی)

عبادہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ پگڑی  
باندھا کرو اس لیے کہ یہ فرشتوں کی علامت ہے اور اس کا شملہ اپنی پشت  
کی طرف چھوڑ دو۔

عن ابی الدرداء قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم  
ان احسن ما رزقتم الله في قبوركم ومساجدكم البياض۔

(ابن ماجہ)

ابو درداء کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بہترین  
کپڑا جسے پہن کر تم اپنی قبروں اور مساجد میں اپنے اللہ سے ملو سفید کپڑا  
ہے۔

کھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مسلمانوں کو اس  
بارے میں بھی مفصل ہدایات دیتی ہے۔ اور یہ ہدایات سب کی سب جدید مغرب  
میں مروج آداب سے متضاد ہیں۔

کھانے سے پہلے ہر شخص کو یہ جائزہ لینا چاہیے کہ جو غذا وہ کھانے چلا ہے،  
حلال ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے تو بالکل نہیں کھانا چاہیے، اس لیے کہ حرام غذا میں  
کھانے والے شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

مغربی کھانے میں مختلف قسم کے الکھلی مشروبات شامل ہیں اور خنزیر کا گوشت نہ صرف الگ طور پر مرنے سے کھایا جاتا ہے بلکہ دوسرے کھانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یورپ کے لوگ جانوروں کو ذبح نہیں کرتے اس لیے متدین یہودیوں کے ذبیحہ کے علاوہ مغرب میں ملنے والا ہر قسم کا گوشت حرام ہوتا ہے۔ متدین یہودیوں کے سوا اہل مغرب میں حلال و حرام کا امتیاز نگہبشتہ جاتا رہا ہے۔ وہ لذت کام و دہن کی خاطر جرجی چاہتا ہے بے تکلف کھاتے ہیں۔

کھانا جیسا کہ اب دستور بن چکا ہے، میزوں پر نہیں، فرش پر پچھے ہوئے دسترخوان پر چھنا چاہیے۔ کھانے والا دسترخوان پر سہولت سے بیٹھ سکتا ہے۔ چاہے آلتی پالتی مار کر بیٹھے یا یک زانو ہو کر یا دونوں پاؤں پر۔ لیکن کسی چیز مثلاً کرسی کی پشت، کے ساتھ ٹیک لگا کر نہیں کھانا چاہیے۔ پھر کھانا کھانے کی نیت کرنی چاہیے، کیونکہ آپ لذت کام و دہن کی خاطر نہیں بلکہ اپنے جسم کو اس قابل بنانے کے لیے کھا رہے ہیں کہ وہ دینی فرائض ادا کر سکے۔ ایک ایک برتن میں کئی لوگوں کو شریک ہونا چاہیے اس لیے کہ ساتھ مل کر کھانے میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لینا ہی مسلمان کا فرض ہے۔ کسی بھی کام کا آغاز کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر اسلام کا بنیادی تصور ہے۔

مندرجہ ذیل احادیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کھانے کے آداب مفصل بیان کرتی ہیں:

عن عمر بن ابی سلمہ قال کُنْتُ غُلَامًا فِي حَجْرٍ رَسُولِ

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت یدی تطیش فی الصحيفة  
فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سم اللہ وکل  
بیمینک وکل متایلیک (متفق علیہ)

■ عمر بن ابی سلمہ کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
زیر پر وخت تھا۔ دکھانا کھاتے وقت میرا ہاتھ رکابی کی طرف تیزی سے بڑھتا  
جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دفعہ)  
فرمایا: بسم اللہ پڑھ، وائیں ہاتھ سے کھا اور اپنے آگے سے کھا۔

عن ابی عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا  
یاکلف احدکم بشمالہ فلیاکل بيمينہ ولا یشرب بہا فان  
الشیطان یاکل بشمالہ ویشرب بہا۔ (مسلم)

۱ "ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی شخص بائیں  
ہاتھ سے نہ تو کوئی چیز کھائے نہ پیے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا  
اور پیتا ہے۔"

عن کعب بن مالک قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم یاکل بثلاثة اصابع ویلعق یدہ قبل ان یمسہا  
(مسلم)

۱ "کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے  
کھایا کرتے تھے (یعنی انگوٹھے، انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی سے)  
اور ہاتھ پونچھنے یا دھونے سے پہلے اس کو چاٹ لیا کرتے تھے۔"

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بلعق  
الاصابع والصحفة وقال انکم لا تہرون فی آیتہ البرکۃ  
(مسلم)

”جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں اور رکابی کو چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا: تم نہیں جانتے کس انگلی کے نواسے میں برکت ہے۔“  
عَنْ بُيُوشَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مَنْ أَكَلَ فِي قِصْعَةٍ ثُمَّ لَحِيسَهَا فَقَوْلَ لَهُ الْقِصْعَةُ اعْتَقَلَتْ

اللَّهُ مِنَ النَّارِ كَمَا اعْتَقَتْنِي مِنَ الشَّيْطَانِ - (رزین)

”بُیُوشَةُ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص پیلے میں کھاتے اور پھر اس کو چاٹ لے تو یہ پالہ اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تجھے دوزخ سے بچائے جس طرح تو نے مجھے شیطان سے بچایا۔“  
عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَتَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِلَحْمٍ فَرَفَعَ إِلَيْهِ الذِّرَاعَ وَكَانَتْ تَعْجِبُهُ فَنَهَسَ مِنْهَا -

(ترمذی - ابن ماجہ)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (دکھا ہوا) گوشت لایا گیا اور اس میں سے آپ کو دستی دی گئی، جو آپ کو بہت پسند تھی، آپ نے اُسے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا۔“

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ بِالسَّكِّينِ فَانَدَ مِنْ مَنَعِ الْأَعَاجِمِ وَالْهَسَوِ  
فَانَدَ اهْذَاؤُ امْرَأَ - (ابوداؤد - بیہقی)

”عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گوشت کو پھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ اس لیے کہ یہ طریقہ بھی لوگوں کا ہے بلکہ دانتوں سے کھاؤ کہ دانتوں سے کھانا لذت بخش بھی ہے اور ہاضم بھی۔“

جن لوگوں نے جدید مغربی طریقہ خورد و نوش کو اپنا لیا ہے، جس میں گریساں، میزیں،







اس باسن کو گرم پانی سے بھر دیتے ہیں۔ اسی میں ہاتھ منہ دھوتے اور طہنم وغیرہ  
 نکھڑکتے ہیں۔ اگرچہ جدید مفید صحت پانی ہتیا کرنے کا سلسلہ خاصا ترقی  
 یافتہ ہے، تاہم سرور ممالک میں اہل مشرق کو اس سلسلے کا عادی نہ ہونے کی  
 وجہ سے، یا تو ٹھنڈا یا گرم پانی برداشت کرنا پڑتا ہے یا پھر گرم گرم پانی سے  
 وہ اپنا ہاتھ منہ مجلس لیتے ہیں۔ جب تک (اہل مشرق) گرم اور سرد  
 پانی سے بھرے ہوئے اس باسن کو استعمال کرنے کے عادی نہیں ہوتے  
 یہ صورت حال برقرار رہے گی۔

کسی باعمل مسلمان کے لیے اس مشورہ سے بڑھ کر نامعقول بات اور کوئی نہیں  
 ہو سکتی۔ سنت کی رو سے ایک مرتبہ نہانے دھونے میں استعمال شدہ پانی دوبارہ کام  
 میں نہیں لایا جاسکتا۔ مغربی طرز کا ہاتھ مسلمانوں کے نزدیک غلاظت کا پتھر ہے۔

بیڈروم کے ساتھ ہی ہاتھ روم ہوتا ہے۔ اس کمرے میں نہ صرف  
 نہاتے ہیں بلکہ رفع حاجت بھی یہیں کی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں ایک  
 بڑے سائز کا ہاتھ ٹب ہوتا ہے جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی  
 ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق مناسب ٹمپرچر کا  
 پانی ٹب میں بھر لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر اس ٹب میں بالکل برہنہ داخل  
 ہو جاتے ہیں اور گردن تک پانی میں بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ صابن ملنے  
 کے بعد یا تو پانی اپنے اوپر ہاتھ سے ڈالتے ہیں یا ہاتھ اسٹینج سے اسی دگدے  
 پانی میں اپنا جسم صاف کرتے ہیں۔ تازہ پانی کے لیے ٹب کو خالی کرنا

اور پھر اس کے بھرنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران میں یا تو آدمی سرو ہو جائے گا یا پانی کے ٹیپر پچر میں فرق ہوگا اور یہ صورت حال بھی آرام دہ نہیں ہوگی۔

جدید مغربی باتھ روم غالباً مغرب کے دوسرے تمام طور اطوار سے بڑھ کر نامقول ہے، کیونکہ جہاں لوگ نہاتے ہیں وہیں بیت الخلا بھی ہوتا ہے، جسے سنت نے بالکل ممنوع قرار دیا ہے۔ ایک مکروہ رواج کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ہے۔ مغربی طرز کے بیت الخلا میں آدمی کے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔

پھر کمبوڈیا ٹائلٹ ہے جو مشرقیوں (مسلمانوں) کے لیے سب سے بڑی مشکل ہے۔ رفع حاجت کے بعد اہل مغرب استنجا کے لیے ٹائلٹ پر استعمال کرتے ہیں۔ پانی کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ مشرقی مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک نہایت مکروہ اور غلیظ عادت ہے۔ وہ جب تک پانی سے طہارت نہیں کر لیتے اپنے آپ کو صاف ستھرا نہیں سمجھتے، لیکن اگر وہ مغربی باتھ روم میں پانی استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرش پر بیٹھ کر وہ ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ فرش کسی حالت میں بھی گیلیا نہیں ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں وہاں ٹوٹا یا ٹنگ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی بڑی احتیاط کے ساتھ مغربی طور کا خوگر ہونا چاہیے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ باتھ روم میں خصوصاً کمبوڈ کے سلسلے میں کسی قسم کی بدنظمی انہیں ہوٹل والوں یا لینڈ لیڈی کی نظر سے گرا دے گی۔ وہ انہیں وحشی نہیں تو غیر مہذب ضرور قرار دیں



گے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ ان بدحواس کر دینے والے مسائل سے بچ نکلنے کی  
کوشش کریں، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ”جدیدیانے“ اور اپنے مشرقی  
اطوار کو ترک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

اسی طرح اسلامی ہدایات کو چھوڑے بغیر نہ سہی، کم از کم پامالی کیے بغیر مغربی طریق  
زندگی کو اپنایا نہیں جاسکتا۔ اغیار کی نقالی کے اسی جنون کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کا ارشاد ہے ————— مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ جس (مسلمان)  
نے کسی قوم (یعنی کفار) کی نقالی کی اُس کا شمار انہی میں ہوگا۔

## اسلام اور عرب تہذیب

ایک سو دوا جس میں ہمارے تہجد پسند مبتلا ہیں یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو ہر ممکن طریقے سے باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلامی طرز حیات کا عرب تہذیب و ثقافت، خصوصاً عربی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں قرآن کریم کی کلاسیکی عربی کی اشاعت اور عربی کا مسلمان ملکوں کی سرکاری زبان قرار دینا کسی اعتبار سے بھی اسلام کی غرض و غایت کی تکمیل میں مدد نہیں ہو سکتا۔ غالباً وہ انگریزی اور لاطینی حروف تہجی کو مفید ترین گردان کر ترجیح دیں گے۔ کیونکہ انگریزی آخر ایک عالمگیر زبان ہے اور اسلام ایک عالمگیر مذہب۔ یہ ہے انداز تہجد پسند ذہن کے کام کرنے کا۔

بعض حضرات تو اس سلسلے میں غلط طور پر غلط سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ ماننے میں تاہل ہے کہ نو مسلم عربی ناموں کو اپنا ناپسند کرتے ہیں۔ ایک پکا تہجد پسند ہی ایسا طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ دیل کے طور پر وہ قرآن کریم کے انگریزی مترجم محمد ماراڈیوک پمٹھال (۱۸۷۵ء-۱۹۳۶ء) ایسے مشہور نو مسلموں کا نام لیتے ہیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ ایک مخلص مسلمان تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنا انگریزی نام برقرار رکھا اور صرف ”محمد“ کا اضافہ کیا۔ ماراڈیوک پمٹھال کے مخلص اور سچے مسلمان ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ قطع نظر

اس کے کہ انہوں نے اپنے لیے کونسا نام پسند کیا، دنیا سے مغرب میں ان کی اہم اسلامی خدمات پر شاذ ہی حرف گیری کی جاسکتی ہے۔ تاہم یہاں سوال جائز اور مباح کا نہیں مرجع اور مستحسن کا ہے۔ اگرچہ شریعت کی رو سے غیر عربی نام برقرار رکھا جاسکتا ہے، لیکن مستحسن یہ ہے کہ نو مسلم اپنا پورا نام مسلمانوں کا سار کے اور کوئی ایسا نشان باقی نہ رہنے دے جس سے اس کی سابقہ غیر اسلامی زندگی کا پتہ چلتا ہو۔ ٹھیک یہی بات لباس کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ مغربی لباس اگر معقول اور شائستہ ہو جیسا کہ موجودہ تنگ "ٹیڈی" لباس سے پہلے رائج تھا، تو اس کی پوشش سے اسلام کی کسی تعلیم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ بے شک وہ جواز کی حد تک قابل قبول ہے، لیکن کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار محبت اور اتباع سنت کی خاطر یہ زیادہ مستحسن نہ ہوگا کہ ہم وہ لباس زیب تن کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے طور اظہار اور لباس کی نقالی نہ کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے تو اس عمل کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سنت کو سراہا اور اس کے اتباع کی ہدایت کی ہے اور یہ سنت چھوٹے چھوٹے امور پر بھی حاوی ہے۔ مثلاً ایک طباق میں بہت سے لوگوں کا لی کر کھانا، فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں اور بالوں کے کبلوں پر بیٹھنا اور سونا، وارسی رکھنا، جیتے اور پگڑیاں پہننا اور عربی زبان بولنا۔ بے شک یہ اعمال نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح فرض نہیں ہیں۔ ان کا اہتمام نہ کرنے سے آدمی گناہ گار نہیں ہوتا، لیکن انہیں ساتویں صدی کے وحشی اور ان گھڑ بدوؤں کے لیے موزوں قرار دے کر ان کا تسخیر اور تحقیر اور جدید مغربی اطوار کو فوقیت دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تحقیر و تضحیک کے مترادف ہے۔ پھر وہ شخص اپنے آپ کو ایک اچھا مسلمان کیسے سمجھ سکتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

تینفق طلب امر یہ ہے: یہ لوگ اسلام کے عرب اجزاء کی اہمیت کو گھٹانے کی

جو کوشش کر رہے ہیں، اس کا محرک کیا ہے؟ یہی عرب خصوصیات اسلام کو امتیازی وجود اور تہذیب عطا کرتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر تہجد و پسند نہایت شد و مد سے اعتراض کرتے ہیں۔ تہجد و پسند تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ٹوٹ کھسوٹ لیں، مگر ایسے انداز سے کہ خافل مسلمان غضب ناک ہونے نہ پائیں؛ چنانچہ وہ اسلام کے بدن سے ہڈیوں تک گوشت نوح لینے کی سعی میں مصروف ہیں دان کا بس چلے تو ہڈیاں بھی نہ چھوڑیں۔ وہ اسلام کے ان تمام تصورات پر تلخا کر رہے ہیں جو اسے دوسرے مختلف نظام ملتے جیات سے الگ تہذیبی استقلال اور شعوس امتیازی خصوصیت عطا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا امرار ہے کہ اسلام چند عمومی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اسلام رواداری، اخوت، خیر خواہی اور امنِ عالم کا نام ہے۔ اسلام سوشلزم، ہیشنلزم، فلاحی ریاست، لبرلزم، عقلیت پسندی (Rationalism) نظریہ عملیت (Pragmatism)، انسان دوستی (Humanism) اور مادی ترقی ہے۔ تہجد و پسندوں کا اسلام اتنا پکدار اور لامحدود ہے کہ وہ کوئی بھی چیز بن سکتا ہے اور ہر چیز ہے۔ اور جب وہ کوئی بھی چیز بن سکتا ہے تو گویا کچھ بھی نہیں رہتا؛ چنانچہ ٹھیک یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے یہ تہجد و پسند جدوجہد کر رہے ہیں۔





# اسلام اور فنی کاوش

معتزین اسلام پر ایک الزام عموماً یہ عاید کرتے ہیں کہ وہ بُت شکن، قدیم رسوم و عقائد کا دشمن، مذہب و اخلاق میں کٹر اور فنون لطیفہ کا سخت مخالف ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے؛ چنانچہ ہمیں ہر کام بہ حسن و خوبی انجام دینا چاہیے۔ بنابرین اسلام فن کا بہ نفسہ مخالف نہیں بلکہ وہ صرف اُس کے خلط استعمال کا مخالف ہے۔ حسن و جمال، خواہ قدرتی ہو یا مصنوعی، اس کی پیاس کم و بیش ہر انسان کی فطرت میں ہے۔ اسلام اس فطری آرزو کا گلا گھونٹنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اُس کو بہترین رستے پر لگاتا اور مسخ ہونے اور کج روی سے باز رکھتا ہے۔ ہر تہذیب کا فن اُس کی اپنی مخصوص قدموں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چونکہ مغربی قدریں اسلامی قدروں کے بالکل منافی ہیں اور ایسے نظریات کی اشاعت کرتی ہیں جو ہمارے نظریات سے اصولاً متضاد ہیں اس لیے کوئی سچا مسلمان اپنے دین و ایمان کو مجروح کیے بغیر مغربی فنون لطیفہ کا قدر شناس نہیں بن سکتا۔ لہذا جو مسلمان ہندو کلاسیکل رقص، مغربی سنگت ناچ (ballet) یا امریکن جاز سے لطف و مسرت حاصل کرتا ہے، اس کے دین میں لازماً کوئی سخت نقص ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فن کی

نوعیت اس قدر عالمی نہیں ہے جس قدر کہ بالعموم سمجھی جاتی ہے۔

اسلام کا اصرار ہے کہ فتنی کاوش کا مقصد وحید اپنے عقیدہ اور نظام حیات کی نشر و اشاعت ہونا چاہیے۔ وہ "فن برائے فن" کے تصور کو بڑی سختی سے مسترد کرتا ہے۔ فن فکر و شعور کے بجائے جذبات سے بحث کرتا ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بے حد مفید اور موثر ثابت ہوتا ہے۔ نعت رسول ۲ کے چند شعر لاکھوں دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات اور حضور کی تعلیمات سے عقیدت و محبت کا گرم جوش جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جب کہ حقائق پر مبنی سوانح انسان کو اس قدر متاثر نہیں کر پاتی۔ دوسری طرف بالفرض اگر اسلام کا کوئی دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی اور درپردہ دہنی سے کام لیتے ہوئے ایک نہایت فصیح نظم کہتا ہے تو وہ تاثر کے اعتبار سے کسی عام مناظرے اور مباحثے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔ فتنی نقطہ نظر سے دونوں کاوشیں مساوی معیار کی ہو سکتی ہیں، لیکن اول الذکر فن کے صحیح استعمال کا نتیجہ اور مؤخر الذکر اس کے بگاڑ کا مظہر ہوگی۔

اسلام کے معترضین فنون لطیفہ کے سلسلے میں درحقیقت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ فنکار کے مقام کے متعلق دونوں معاشروں کا تصور بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جب اسلامی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر ثقافت عجایب گھروں میں رکھی جانے والی تصویروں اور مجسموں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ فی الحقیقت مسلمان شہر "فنی عجایب گھر" نام کی کسی چیز سے آشنا نہ تھے۔ مسلمانوں کا فن اُن کی عام روزمرہ زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس فن کا اظہار ان کی سبک عمارتوں کے طرز تعمیر، نجی مکانات، لباس، اسلحہ حتیٰ کہ کھانے پکانے کے برتنوں تک سے ہوتا تھا۔ روزمرہ زندگی کا فنی پہلو جدید تہذیب میں تقریباً ناپید ہے۔ مادی فلسفوں کا نتیجہ حسن و خوبی سے نفرت کی صورت میں نکلا۔ پھر صنعتی اور مشینی زندگی نے یہی کسر پوری کر دی۔ مغربی فن عملاً "قرون وسطیٰ" کے اواخر اور نشاۃ ثانیہ کے

اولیں دور سے بتدریج زوال پذیر ہے۔

اگر کسی شخص کو اسلامی فنون کے حقیقی حُسن کے بارے میں کوئی شک ہے تو وہ صرف عربی اور لاطینی حروفِ تہجی کا موازنہ کر لے۔ فنی نقطہ نظر سے وہ تسلیم کرے گا کہ عربی خطاطی کے حسین و جمیل شاہکاروں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اسلام میں فن کا کیا مقام ہے؟ اگر کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ ہے تو وہ قاہرہ کی جامع ابن طولون، قرطبہ کی جامع البکیر اور عالم اسلام میں تعمیر شدہ ایسی ہی ہزاروں مسجدوں کا مقابلہ فنِ تعمیر کے ان اسٹراڈارن نمونوں سے کر لے جو ہمارے شہروں کو روز افزوں بد نما بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان نئی عمارتوں سے بڑھ کر ایران، یک رنگ اور افسردہ کوئی دوسری چیز نظر نہ آئے گی۔ جدید فنِ تعمیر میں نہ حُسن و جمال ہے نہ تنوع۔ بس ایک سپاٹ سلسلہ ہے جو منڈی سے اسمبلی تک چلا گیا ہے۔ اہل مغرب کی روزمرہ زندگی میں فن کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ مثلاً لباس کو لیجئے۔ مغربی لباس میں "نیش" اور "سٹائل" تو پایا جاتا ہے، مگر دلکشی اور لطافت سے عاری ہے۔ مردوں کے کپڑے غیر متنوع بھونڈے پن کا لاثانی منظر ہوتے ہیں۔ رہا عورتوں کا لباس تو وہ خاص طور پر بازاری (commercialized) صنف کے لیے بنایا گیا ہے۔ ان کا مقابلہ سعودی عرب اور مراکش وغیرہ کے روایاتی عرب لباس، فلسطینی عرب خواتین کی، ہاتھوں سے کاڑھی ہوئی پوشاکوں اور پاکستان کی مسلم خواتین کے مختلف قسم کے لباسوں سے کیجئے۔ مغربی لباس کے برعکس کس قدر لطیف، باوقار، معقول، خوبصورت اور دلکش ہیں۔ ان لباسوں کے علاوہ انتہائی نفیس خطاطی سے مزین قرآنِ کریم کے خوبصورت ترین نسخے، ممد سے اورتالین، پارچا، سفال گری، پتیل کے آرائشی کام اور کاپچ کے سامان سب مسلمانوں کی روایاتی دستکاری کے وہ نمونے ہیں جن سے اسلام کی روحانی اقدار کا زندہ جاوید اظہار ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے اہل مغرب ان سب کو حقیر گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض گھٹیا فنون ہیں۔ ان کے خیال میں حقیقی اور اعلیٰ فن کا اظہار صرف تصویروں اور مجسموں



ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور اسلام ان کی ممانعت کرتا ہے۔

کلاسیکل موسیقی کے موجد باخ اور بیٹھوون کو؛ اوپر ایں وارڈی اور وگنر کو؛ ڈرامٹک تعبیر میں قدیم یونانی المیوں اور ولیم شیکسپیر کو، نظریاتی فنکشن میں (دو تھنکی، تھیکر سے اور ہارڈی کو؛ مجسمہ سازی میں میٹیلنگو اور مصوری میں لیونارڈو اور ریمرنٹ کو امریکہ اور یورپ میں نہایت عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ "عظیم اساتذہ فن" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی فنی کادشوں کی انتہائی قدردانی بجائے خود ایک مذہب بن چکی ہے۔ جو شخص ان لوگوں کی مدح و توصیف سے قاصر رہتا ہے گنوار اور غیر مذہب گردانا جاتا ہے۔

مغرب میں اعلیٰ پایہ کی موسیقی سمفونی اور اپرا کی سمجھی جاتی ہے۔ رقص میں بلند ترین مقام سنگت ناچ (ballet) کو حاصل ہے جو سوویٹ یونین میں ارتقا کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے۔ تھیٹر میں ٹریجیڈی، جس کا خلاصہ قدیم یونانی ڈرامہ نگاروں نے کیا اور شیکسپیر کو اور ٹریچر میں ناول کو جو انسانی کردار کی گہری عکاسی کرتا ہے، مقام بلند و عظیم حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی، رقص اور تھیٹر کی دنیا میں دو قسم کے فن کار ہوتے ہیں۔ نغمہ نگار اور اداکار۔ انتہائی باکمال اور معزز اداکار، رقص اور غنائی تمثیل کی معنی عمویا محورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس نغمہ نگار بلا شرکت غیرے مرد ہوتے ہیں۔ ان "فنون لطیفہ" کے کسی شعبے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کو انتہائی معزز اور شریف پیشہ سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے کو بے حد عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مسئلہ "فنی عبقریت" کے حامل افراد (بالعموم نغمہ نگار) مرنے کے بعد "غیر فانی استادان فن" کی صف میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔ کلاسیکی ناول نگار بھی حیات جاوید سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں بار بار زیور طباعت سے آراستہ کی جاتی ہیں۔ انہیں "عظیم ادب" قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ سکول میں ہر

طالب علم سے ان کے مطالعہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ سمفونی اور غنائی موسیقی کے موجدین کے ایجاد کردہ راگ ہر بڑے شہر کے بڑے بڑے کنسرٹ ہالوں میں بار بار گائے جاتے ہیں، اس طرح انہیں زندہ جاوید بنا دیا جاتا ہے۔ انتہائی معظم گویوں اور سازندوں کی آواز گراموفون میں بھر کر، نیز ان کے بہترین محسّے اور تصویریں تیار کر کے مشہور فنی عجائب گھروں میں بطور یادگار نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھ دی جاتی ہیں۔

مسلم ممالک میں مغرب کی ثقافتی اقدار کا اثر اس قدر غالب اور قوی ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اکثر حیدہ افراد کے نزدیک ہماری ”پسماندگی“ کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ویسی فنون لطیفہ آج تک ارتقا کی ان بندیوں پر پہنچ نہیں پاتے۔ ہماری ”ناقص“ ثقافت کو ”مالا مال کرنے“ اور ”تازہ روح بخشنے“ کے لیے یہ لوگ ضروری سمجھتے ہیں کہ یورپ کی ان مخصوص فنی صورتوں کو قحوک کے حساب سے درآمد کیا جائے۔ ”ترقی“ کے نام پر یہ لوگ شور مچاتے ہیں کہ مغربی طرز کے ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ موسیقی، رقص، تھیٹر، سینما، لٹریچر، فلکس، مصوری اور مجسمہ سازی کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سرکاری سرپرستی میسر ہو۔ اگر کوئی شخص ان غیر اسلامی سرگرمیوں پر اعتراض کرنے کی جرأت کرتا ہے تو اس پر ”رجعت پسند جنونی“ کی تہمت لگا دی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال خصوصیت سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ فنون ”غیر اسلامی کیوں ہیں؟“

قدیم یونان کے عہد ہی سے اصل مغرب کے نزدیک ”عظیم فن“ کا اکتساب بجائے خود ایک مقصد رہا ہے۔ ”فن برائے فن“ کی ضرب مثل اور جان کٹھیں کی نظم کا مشہور اقتباس

“Truth is beauty and beauty, truth and that is

all ye need to know.” (صداقت حسن ہے اور حسن صداقت، انہیں اس

کے سوا اور کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے)، اسی نقطہ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ پس مغربی

ذہن کے نزدیک فنی اقدار اپنی حد تک مستقل اور مکمل ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ حسن اور اخلاق کا

آپس میں کوئی ربط و تعلق بھی ہو۔ فن کار کی نئی زندگی خواہ کتنی ہی غیر اخلاقی اور ناستقانہ کیوں نہ ہو، فن کے شیدائیوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی فن کار گائون کی طرح دختِ زہ کا والد و شیدا ہو کر اپنے بیوی بچوں کو بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور خود طوائفوں سے آتشک کا مرض پال کر مرنے لگتا ہے، تو پرستارِ ان فن کی نظر میں اُس کے اسی کردار کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ یہ سب کچھ وہ ”فن“ کی خاطر کرتا ہے۔ اس کے عمق پرانہ تحقیقی کارناموں کے آگے اس کی تمام کوتاہیاں اور معائب معدوم ہو جاتے ہیں۔

فنی کاوش کا مغربی معیار، فیصلہ کن اہمیت کے حامل کسی حقیقی موضوع کو مشکل ہی سے پرکھتا ہے، چنانچہ جنسی کج رویوں کی نہایت مکروہ انداز میں عکاسی کرنے والی فلموں کو سنسر کرنے کی مخالفت محض اس بنا پر کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بے نظیر فوٹو گرافی، فصیح مکالموں اور ماہرانہ اداکاری کی بدولت ایسی عظیم فنی شاہکار بن جاتی ہیں کہ انہیں حرف گیری اور تنقید سے لازماً محفوظ اور بالآخر رہنا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر غیر معمولی ظاہری ”حسن“ کسی قسم کے اخلاقی المیہاں کو غیر متعلق اور فضول قرار دیتا ہے۔ مغربی ثقافتی اقدار زیر بحث ”فنون لطیفہ“ اور یہودہ تاجرانہ تفریح کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے حسن شناس حساس لوگ کسی کیلنڈر پر ایک کمرشل فن کار کی بنائی ہوئی کسی لڑکی کی برہنہ تصویر دیکھ لیتے ہیں تو اُسے بدنمائی اور سفلہ پن کا موقع گردانتے اور اُس کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اسی نوعیت کے کسی کلاسیکل یونانی مجسمہ کے متعلق ان کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ کیلنڈر کی برہنہ تصویر اور وینس ڈی میلو کا برہنہ مجسمہ اگرچہ ایک ہی موضوع کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن مؤخر الذکر کو حسن کا لاجواب اور کامل نمونہ قرار دے کر اس کی گویا پرستش کی جاتی ہے۔ مسلمان ذہن اس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔

یہاں اسلام اور مغرب کی ثقافتی اقدار کا سب سے بڑا بنیادی فرق عیاں ہو جاتا ہے۔ کوئی فنی شاہکار کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے؟ یہ سوال مغربی ذہن کے نزدیک پرکاش کے برابر بھی



اہمیت نہیں رکھتا، بشرطیکہ وہ فصیح زبان، ہم آہنگ خطوط، دلکش رنگوں یا عمیق اور موثر جذبات کے ظاہری ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ ہو۔ دوڑک انفاظ میں یوں کہنا چاہیے، مغربی ذہن جس چیز کو نادیر و دگر فنی کاوش قرار دے کر نگاہِ اخرام سے دیکھتا ہے وہ درحقیقت مادہ پرستی اور تاریک خیالی (Paganism) ہے، جسے حواس کی تسکین کی خاطر نہایت لطیف انداز میں بنا سنوار کر اور بیش بہا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان فنی کاوشوں کی اصلی مادہ پرستانہ فطرت کا نمایاں ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ ان سے وابستہ گہری جذباتی تصوریت جلد ہی بگڑ کر سفلہ پن اور فحاشی کے تحت اثری میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال قدیم یونان اور روم کی ثقافتوں کے تقابلی میں ملتی ہے۔ یہ دونوں ثقافتیں اگرچہ کفر کی تاریک خیالی (Paganism) اور مادہ پرستی میں یکساں ڈوبی ہوئی ہیں، تاہم یونانیوں نے اپنی فنی کاوشوں کو انتہائی دلکش جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ اس کے برعکس رومی اس اہتمام کی زحمت زیادہ مدت گوارا نہ کر سکے۔ یہی بات یورپی نشاۃ ثواب اور عصر حاضر کا موازنہ کرتے وقت صادق آتی ہے۔ عصر حاضر کوئی بیٹھوون، ریجرتٹ یا ٹیکسٹریڈا نہیں کر سکا، کیونکہ مغربی معاشرہ مادہ پرستی کے زیر اثر اس قدر بگڑ چکا ہے کہ طواہرِ حسن کی تشنگی اور طلب تک ختم ہو چکی ہے؛ چنانچہ فن کار اپنے فن کا اظہار انتہائی خالص برہنہ بیہودگی کی صورت میں کرتے ہیں۔

کوئی غیر ملکی جب لاؤنڈریس (یا میٹروپولیٹن دنیو یارک) ایسے مشہور عجائب گھروں کی سیر کو جاتا ہے تو وہاں اسے ایک عبادت گاہ کا ساما حول نظر آتا ہے۔ ہر ناظر کو بچپن ہی سے تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ان مقامات میں انتہائی بیش بہا مے بدل اور کامل نمونہ کے طور پر محفوظ کردہ تصویروں اور مجسموں کا احترام کرے؛ چنانچہ جب وہ وینس ڈی میلو یا مونا لیزا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے رعب و جلال سے دم بخود اور ساکت و صامت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ ریت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ انسان کے ہاتھوں کی اس صناعتی کا یہ مبالغہ آمیز جلال و



احترام خالص بت پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور بت پرستی کی کوئی شکل و صورت بھی ہو، اسلام اُسے برداشت نہیں کر سکتا۔

”یقیناً آپ میں سے کچھ لوگوں کو وہ بحث یاد ہوگی، جو چند سال پہلے

انگلستان کے اخبارات میں چھڑی تھی۔ موضوع یہ تھا، فرض کیجئے، اپنی نوعیت کا ایک

لیکنا اور بے بدل یونانی مجسمہ کرے میں رکھا ہے۔ اسی کرے میں ایک زندہ بچہ بھی موجود

ہے۔ کرے کو آگ لگ جاتی ہے۔ دونوں میں سے صرف ایک چیز بچائی جاسکتی ہے۔

آپ کے نزدیک کس کو بچانا چاہیئے؟ مراسلہ نگاروں، اصحاب فکر و دانش اور اچھے

مرتبہ کے حامل افراد کی بہت بڑی تعداد کی رائے یہ تھی کہ مجسمہ کو بچانا چاہیئے اور

بچہ کو جل کر مجسمہ ہو جانے کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بچے تو روزانہ

ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن قدیم یونانی آرٹ کے اس

شاہکار کی جگہ کوئی اور نہ لے سکے گا۔ فنی شاہکاروں کے اس قدر احترام کی وجہ اللہ

تعالیٰ کی ہدایت اور نوع انسان کی تخلیقی غرض و غایت پر عدم یقین ہے۔ ان

لوگوں کا طرز استدلال کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ یہ بہترین چیزیں ہیں جو انسان کی

صدیوں کی کاوش کا حاصل ہیں۔ حسن زوال پذیر ہے اس لیے ہمیں ماضی کی ان

کاوشوں سے چٹا رہنا چاہیئے جو مثالی نوعیت کی ہیں اور باقی بچ رہی ہیں۔ اس

نقطہ نظر کو کوئی مسلمان اپنا نہیں سکتا۔ یہ بت پرستی کی تازہ ترین ترقی یافتہ صورت

ہے۔ مسلمان اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کو ہر چند بے مایہ سمجھتا ہے، لیکن وہ کسی

دوسری انسانی زندگی کو، جو بظاہر کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، انسانی ہاتھوں کے بنائے

ہوتے فنی کام پر قربان نہیں کرے گا۔ اسلامی تہذیب کا مقصد انسانی زندگی کے زوائد

کو دلکش و لطیف بنانا نہیں ہے بلکہ خود انسانی زندگی کو سنوارنا اور سر بلند کرنا ہے۔“

جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے اسلام کے نزدیک کسی دوسرے شخص کا بہروپ بھرنا انسان کی شخصیت کو بگاڑنے کے مترادف ہے اور کوئی شریف و باعصمت خاتون تو ایکٹرس بن کر مجمع عام میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ایک اور ہلک نقصان، جو بظاہر بہت کم نظر آتا ہے، وہ انفعالیات ہے جسے یہ سب فنون، خصوصاً تعییر، سینما اور لٹریچر، فکشن جنم دیتے ہیں۔ ان تمام نام نہاد تخلیقی، فنون پرندہ و ر ایک نئی غیر حقیقی زندگی کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان تخیل دیکھتے یا ناول پڑھتے وقت ایک خیالی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ یہ خیالی دنیا جو فن کار اپنی کہانی کے ذریعے ناظر تک منتقل کرتا ہے، اس کے لیے جذباتی طور پر اپنی حقیقی زندگی سے زیادہ اطمینان بخش ہوتی ہے۔ اس قسم کا انفعالی میلان تیز فحش کی طرح اُس کے دل و دماغ کو متاثر کرتا اور اس کی عادات میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے عادی کی طلب روز بروز بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کے بغیر وہ زندگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، چنانچہ وہ اپنی فرصت کے اوقات اسی تصور کی دنیا میں بسر کرتا ہے، وہ نہ صرف خود شیخ چلی کے سے منصوبے باندھتا ہے بلکہ دوسروں سے توقع کرتا ہے کہ وہ بھی اُس کے لیے خیالی پلاؤ پکائیں گے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بلاشبہ بدترین معاشرتی بُرائی کا سرچشمہ ہیں۔

اسلام عبادات کے ساتھ ساتھ اپنا سارا زور موثر، مثبت اور تعمیری امور پر صرف کرتا ہے تاکہ فرد کی روح کا تزکیہ اور معاشرہ کی اخلاقی و روحانی فضا کی تدریج اصلاح و تطہیر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان مشیننگلو یا لیونارڈو ڈاؤنکی کے مقابلے میں عمر بن الخطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ، عمر بن عبدالعزیزؓ، صلاح الدین ایوبیؓ اور اوزنگ زیب عالمگیرؓ کو پسند کرتے ہیں۔ اسلام کی حقیقی اقدار کے مطابق اعلیٰ ترین آرٹ یہ ہے کہ اخوت کی زندگی کی تیاری کی خاطر انسان کی حقیقی زندگی میں اس کے کردار کی تکمیل لگاتا اور سخت جدوجہد کی جاتے اور جو مشغلہ انسان کی توجہ اس مقصد سے ہٹاتا ہے اُس کو مسترد کر دیا جاتے۔

120

# مسلمان عورت

## معاشرہ میں اس کا کردار

جو لوگ جدید تہذیبی اقدار کی برتری کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک مسلمان عورت کا معاشرتی مرتبہ نہایت پست ہے اور یہ معاشرتی پستی نکاح میں ولایت، تعدد و ازدواج، طلاق اور پردہ یا اختلاطِ مرد و زن سے مکمل اجتناب کی اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے؛ چنانچہ تمام اسلامی ممالک میں ”تحریک اصلاحِ دین“ چل رہی ہے۔ مسلمان معاشرہ اپنے آغاز ہی سے جن بنیادوں پر قائم ہے یہ تحریک انہیں ”غیر اسلامی“ قرار دے کر مسترد کرتی ہے اور غیر مسلم ممالک میں مروج قوانین کو نافذ کرنا چاہتی ہے۔ ہم اس مقالہ میں یہ ثابت کریں گے کہ عورتوں کے متعلق اسلامی تعلیمات درحقیقت برتر و فائق ہیں اور ان میں تحریک و تصرف کا مطلب یہ ہے کہ ہم عظیم مفاسد کو دعوت دے رہے ہیں۔

جدید نسوانی تحریک کے ترجمان اس تصور پر ٹرپ اٹھتے ہیں کہ بیچاری مسلمان لڑکی کو اپنا شریکِ حیات منتخب کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ اُس کے والدین یا سرپرستوں کی نگاہِ انتخاب جس شخص پر بھی پڑ جائے بیچاری لڑکی مجبور ہے کہ اُسے اپنے شوہر کے طور پر قبول کر لے ایسی مسلمان لڑکی سے وہ بڑی ہمدردی اور دل سوزی جانتے ہیں۔ اس کی تصویر ایک ایسی مجبور و مظلوم لڑکی کی سی کھینچتے ہیں جو اپنے ظالم و جابر باپ کے پنجہ جبر میں گرفتار ہے اور شخصی حقوق



کی سرے سے مستحق ہی نہیں ہے۔

اسلامی نظام پر ایک اعتراض اکثر یہ کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے شوہر کا انتخاب والدین کرتے ہیں، حالانکہ یہ انتخاب خود اُسے کرنا چاہیے تھا۔ تاہم سب ملکوں اور قوموں میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ جب کوئی نوجوان لڑکی کسی ایسے شخص کو اپنا شوہر منتخب کرتی ہے جسے اس کے والدین ناپسند کرتے ہیں، تو وہ درحقیقت ایک ایسی مصیبت کو دعوت دیتی ہے جس کا آخری نتیجہ اس خاندان کی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ دوسری طرف مسلمان والدین اپنی بیٹی سے شرعیہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جس شخص کو وہ پسند نہیں کرتی، اُس کے ساتھ لازماً اپنی زندگی گزار دے۔ ایسی صورت جب بھی پیش آتی ہے وہ اُسے اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ لڑکی میں جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جان پہچان اور ملاقاتوں کا حلقہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ بالعموم شادی کی نوبت پہنچ جاتی ہے، میرے ایک دوست کی بیٹی نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ فلاں بے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ باپ نے جواب دیا: ”بہت اچھا، لیکن یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم ایک پرانی روایت کو توڑ دو گی تو اُس پر منحصر تمام پرانی روایات ٹوٹ جائیں گی۔ تم جس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو میرے نزدیک وہ تمہارا شوہر بننے کے لائق نہیں ہے۔“

اور یاد رکھو مردوں کے بارے میں جتنا کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتیں۔ اگر اس سے تمہارا نباہ نہ ہو سکا اور طلاق کی نوبت پہنچ گئی تو میں تمہیں اپنے گھر میں داخل ہونے نہ دوں گا، کیونکہ مجھ پر قانوناً کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ ہاں تم میرے پسند کے آدمی کے ساتھ شادی کرو اور یہ شادی ناکام ہو جائے تو میں شرعاً تمہیں اپنے سایہ عاطفت میں لینے کا پابند ہوں۔ میری استطاعت جتنی کچھ ہے لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ لڑکی نے

باپ کے آگے تسلیم کر دیا اور اُس کے علم اور تجربے کو اپنا رہنما بنانے کا فیصلہ  
کر لیا ہے

”تعدّوا زواج کا اسلامی اصول بھی مخالفین کے ناروا حملوں کا سب سے زیادہ ہدف بنا  
ہوا ہے۔ یہ گویا مسلمان عورت کی پستی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ نیز اسے سراسر جنسی آوارگی  
اور شہوت پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے تجدید پسند مصلحین تو اس پر بڑی ہی ناک  
بھوں چڑھاتے ہیں اور اس کو صرف پس ماندہ معاشروں کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔  
ان کے خیال میں اس کو زیادہ سے زیادہ انتہائی مستثنیٰ اور ثنائی حالات میں بس برداشت کیا  
جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ حقیقت خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہمارے مجددین  
کی اس معذرت خواہانہ تعبیر کی بنیاد نہ قرآنِ کریم میں ملتی ہے نہ حدیث میں، بلکہ یہ سراسر مغرب  
کی تہذیبی اقدار سے مرعوبیت اور ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے۔ تعدّوا زواج سے مغربی دنیا  
کی نفرت کا سبب وہ مبالغہ آمیز انفرادیت ہے جو جدید معاشرہ پر بڑی طرح مُستط ہے۔  
اتنی بُری طرح کہ اُس کے نزدیک بدکاری تعدّوا زواج سے کہیں کم نفرت انگیز اور شنیع  
فعل ہے۔“

”تعدّوا زواج پر پابندی کے حق میں بلاشبہ قویٰ تر دلیل یہ ہے  
کہ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی دوسری عورت اس کی مستقل  
رقیب اور اس کے شوہر کی خلوتوں کی شریک بن جائے۔۔۔۔۔ (مریم حبیبہ کی)  
دلیل ایک عام مسلمان عورت کی نظر میں اپنا سارا وزن کھودیتی ہے، کیونکہ وہ  
اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ تعدّوا زواج کی

---

Islamic Culture, Muhammad Marmaduke Pickthall,  
op. cit., pp. 147-148.

صورت میں زیادہ تر تکلیف دہ دوسری نہیں پہلی بیوی کو اٹھانا پڑتی ہے.....

تاہم تعدد ازواج ضروری ہے..... نہ صرف بدکرداری اور مردوں

کے آزاد جنسی میلان کی روک تھام کی خاطر بلکہ بڑی حد تک اس لیے بھی کہ معصوم

عورتیں جو بیوی اور مرد کی اشخاص کے حوالے نہ ہونے پائیں۔ اگر کسی مرد نے

ایک اور عورت سے شادی رچانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو قانون چاہے کچھ بھی

کہے وہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر رہے گا..... جو لوگ تعدد ازواج

کی مکمل ممانعت کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ چاہتے ہیں کہ نئی

بیوی کہ نہیو الاشخص پہلی بیوی کو (اس کے تمام بچوں سمیت) اپنے گھر سے

نکال دے۔ ورنہ انہیں یہ مطالبہ کرنا چاہیے تھا کہ نہ صرف تعدد ازواج کو

مکمل طور پر ممنوع قرار دیا جائے بلکہ طلاق کی اجازت بھی کسی حالت میں نہ دی

جائے اور مردوں کو اپنی پہلی بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا

جائے۔ عیسائیت نے عصر حاضر کے آغاز سے پہلے یہی ضابطہ تجویز کیا تھا اور یہ

کوئی راز نہیں ہے کہ یہ قانون انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔

یہ بات بے حد رنجیدہ اور شرمناک ہے کہ اکثر مسلمان ممالک میں عائلی قوانین ایسے

انداز میں مسخ کیے جا رہے ہیں کہ ان جدید قوانین کے تحت ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ

وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وراثت معاذ اللہ محرم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان سب

نے ایک سے زیادہ بیویاں کی تھیں۔

”Polygamy from the Woman’s Point of View,”

Anwar Ali Khan Soze, *The Radiance Views Weekly*,

New Delhi, February 8, 1967, pp. 13-14.



طلاق سے متعلق اسلامی قانون کی تردید و تکذیب بھی تعددِ ازدواج ہی کی طرح بڑے شد و مد سے کی جاتی ہے۔ شریعتِ اسلامی نے مرد کو یہ جہاں اجازت دی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو از خود طلاق دے سکتا ہے ہمارے متجددین اسے عورت کی ذلت و پستی کا ایک اور ثبوت قرار دیتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ طلاق یا معاہدۂ نکاح کی ایک طرفہ تینسخہ ناقابلِ معفو بُرائی ہے۔ اس طرح ایک مرد کو چھوٹی چھوٹی اور بے کار باتوں پر اپنی بیوی کو بے دخل و طلاق دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ بنا بریں ان کا مطالبہ ہے کہ طلاق کو واجبِ التعزیر جرم قرار دینا چاہیے اور صرف حرام کاری یا ناقابلِ علاج دیوانگی ہی کی صورت میں اس کی اجازت ہونی چاہیے اور وہ بھی اس وقت جب عدالت اُس کو باضابطہ اور جائز قرار دے۔ شریعتِ اسلامی میاں بیوی میں ناچاقی اور ایک دوسرے سے سخت بیزاری کی صورت میں بڑا ہی شانستہ قابلِ عزت اور باوقار راستہ تجویز کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب میاں بیوی ایک دوسرے کی رفاقت سے تنگ آچکے ہوں اور باہمی اختلاف کی وجہ سے زندگی عذاب بن گئی ہو تو انہیں امن و امان کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ہمارے متجدد و مسلمین مُصر ہیں کہ میاں بیوی کے مزاج میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو انہیں ازدواجی بندھن میں بندھے رہنے پر قانوناً مجبور کرنا چاہیے، چونکہ دنیا کا کوئی قانون کسی مرد اور عورت کو آپس میں محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا اس لیے جب انہیں ایک دوسرے کی ذات میں تسکین و مسرت نہیں ملے گا تو وہ اسے کسی اور جگہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایسا نمل بے جوڑ جوڑے کے سامنے نجات کا صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عدالت کے دروازے پر دستک دے اور اُس سے کذب و دروغ، تہمت تراشی اور افترا پر دازی کے ذریعے چھٹکارا پانے کا پروانہ حاصل کرے۔ گویا اُسے باقاعدہ اپنی رُسوائی کا سامان کرنا ہو گا جس کا نتیجہ مرد اور عورت دونوں کی اخلاقی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ کسی معقول سبب کے بغیر طلاق چونکہ



کوئی بدکردار مرد ہی دے سکتا ہے اس لیے عورت دوسرا نکاح کرنے اور اسودہ زندگی کا از سر نو آغاز کرنے میں آزاد ہوتی ہے، لیکن ہمارے سجدہ پسند مصلحین ایک ایسا قانون بنانے کی لگ بھگ دو دہائیوں میں جو عورت کو اس مرد کے چنگل میں ہمیشہ گرفتار رکھے اور وہ تا دم آخر اس کی بدسلوکی کا شکار ہوتی رہے۔

پردہ یا اختلاط مرد و زن سے مکمل اجتناب کا اسلامی اصول بھی جدید تعلیم یافتہ افراد کے زبردست حملوں کا ہدف بنا ہوا ہے۔ وہ مہر میں کہ پردہ کو "غیر اسلامی" قرار دے کر موقوف کیا جائے، مخلوط درس گاہیں کھولی جائیں، عورتوں کو راستے دہی اور حکومت میں شمولیت کا حق دیا جائے، گھر سے باہر نوکری تلاش کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور پیکی زندگی میں پوری طرح حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ ان کے نزدیک آزادی نسواں کے عروج کی علامت یہ ہے کہ بے پردہ لڑکیاں وردی میں ملبوس، پرچم ہاتھ میں لیے اور قوم پرستانہ نعرے لگاتی ہوئی دارالحکومت کی سڑکوں پر سرکاری سرپرستی میں پریڈ کریں، زمانہ انتخاب میں عورتیں پولنگ بوتھ پر جائیں اور ووٹ ڈالیں، کھلے عام حُسن کے مقابلے منعقد ہوں، جن میں مُنصف مقابلے میں شریک نیم برہنہ لڑکیوں کا معائنہ ٹھیک اسی انداز میں کرتے ہیں جس طرح کسی میلے میں انعامی موشیروں کا کیا جاتا ہے، عورتیں مردوں کا لباس پہن کر جنگوں میں شریک ہوں اور کارخانوں میں کام کاج کریں۔ جدید تہذیب میں ایک عورت اسی وقت لائق عزت و احترام سمجھی جاتی ہے جب وہ مردوں کے سے فرائض کامیابی سے انجام دے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے حُسن و جمال کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دور جدید کے معاشرہ میں دونوں اصناف کے فرائض پوری طرح گڈنڈ ہو چکے ہیں۔ اسلامی تعلیمات ایسی بگڑی ہوئی غلط اقدار کو کبھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ اسلام میں عورت کا کارِ منصبی بلیٹ بکس نہیں ہے بلکہ گھراور خاندان کی خبر گیری ہے۔ اُس کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اپنے شوہر کی کتنی وفادار ہے اور کس قدر لائق بچے اُس کی گود میں پروان چڑھتے ہیں۔ ایک مسلمان خاتون سے

عزالت اور گوشہ نشینی کی توقع کی جاتی ہے۔ پردہ اس مقصد کے لیے ناگزیر ذریعہ ہے۔ مرد  
 تاریخ کے ایجنج پرائیکٹر ہیں اور عورتوں کا کام پردہ کے پیچھے اور عوام کی نگاہوں سے مخفی رہ  
 کر ان کی مدد کرنا ہے۔ یہ کام شاید جویش آفریں بھی کم ہے اور حقیر و فرد مایہ بھی ہے، لیکن ہمارے  
 نظام حیات کے تحفظ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

۱۲۸

# مسلمان عورت کی آزادی اور اسلام

آج تمام مسلمان ملکوں میں پردہ کے خلاف پراپگنڈے کی ہم بڑے جوش و خروش سے جاری ہے۔ شاید ہی کوئی ملک اس ہم سے پاک ہو۔ ہر جگہ پُر زور انداز میں کہا جا رہا ہے کہ پردہ رجعت پسندانہ اور اصلاح و ترقی کا مخالف ہے اور اگر ملت اسلامیہ اقتصادی اور معاشرتی ترقی سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے تو عورت کی آزادی ناگزیر اور لازمی ہے۔

مثلاً پاکستان ٹائمز لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد مقدم سے مندرجہ ذیل بیان منسوب کیا گیا ہے:

”کوئی ملک اس وقت تک زمانہ جدید کے رنگ میں رنگا نہیں جاسکتا جب تک اس کی عورتوں کو آزادی نہیں ملتی۔ مشرق میں جہاں جدیدیت کی رو تاخیر سے پہنچی ہے، لوگ ابھی تک فرسودہ اور روایاتی طرز فکر کی زنجیریں کاٹنے میں متاثر ہیں۔ جب تک ہم دنیا کے دوش بدوش نہیں چلتے ”زندہ قوم“ کی حیثیت سے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کا کردار واضح ہے۔ انہیں ملک کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی میں مزور شریک ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ”جدیدیت سے



وابستہ برائیوں کا جو تصور بعض لوگوں کے ذہن میں پایا جاتا ہے، اس کے مقابلے

میں یہ برائیاں درحقیقت بہت کم ہیں۔

اگست ۱۹۶۷ء میں پاکستان کونسل برائے قومی سالمیت نے لاہور میں "پاکستان کی بیس سالہ زندگی میں آزادی نسواں" کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا وہ بھی اس نقطہ نظر کی نمایاں مثال تھا۔

اگر ہم مسلمان ہونے کے مدعی ہیں اور اسلام کو اپنے ملک کی نظریاتی بنیاد قرار دینے پر مصر ہیں تو کیا یہ معلوم کرنا ہمارا فرض نہیں کہ اسلام اس معاملے میں ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے؟ جہاں تک عورتوں کے نظریہ مساوات کا تعلق ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ مرد عورتوں کے نگران و محافظ ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اول الذکر کو مؤخر الذکر پر فضیلت دی ہے اور وہ عورتوں پر اپنا مال و دولت صرف کرتے ہیں۔

النِّسَاءُ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِهَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ۔ (سورۃ النساء - ۳۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان عورت روزی کمانے کی پابند نہیں ہے

الایہ کہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہو اور نہ تو اس کی کوئی جائداد ہو اور نہ ایسا مرد رشتہ دار جو اس کی

ضروریات بہم پہنچا سکے۔ قرآن کریم یہ تعلیم دیتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کا آتما بھی ہے اور

مونس و غم خوار رفیقِ حیات بھی۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ عدل و انصاف،

محبت اور لطف و عنایت سے پیش آئے۔ دوسری جانب عورت کا فرض یہ ہے کہ

وہ اپنے شوہر کی وفادار اور اطاعت شعار ہو اور اس کے اعتماد پر پورا اترے۔ قرآن

کریم شوہر کو بیوی پر کسی حد تک فوقیت ضرور عطا کرتا ہے، لیکن اس تفوق کا مطلب یہ

نہیں ہے کہ وہ ظالم و جابر بن جائے، بلکہ اس کا مقصد خاندان کا تحفظ اور اسے فساد اور

بگاڑ کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ جن خاندانوں میں بیوی معاشی طور پر آزاد ہوتی ہے

ان میں شوہر اپنے گھرانے کی سرکاری سے خود بخود محروم ہو جاتا ہے، اور جب گھر میں

ماں کی شخصیت غالب ہو تو بچوں کے دل میں باپ کی عزت و وقعت باقی نہیں رہتی۔

سورۃ النور میں مسلمان مردوں کو نامحرم عورتوں اور مسلمان عورتوں کو نامحرم مردوں پر نظر ڈالنے کی ممانعت کی گئی ہے اور مرد و زن دونوں کو یکساں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ دوپٹہ اوڑھیں اور اس کے پلو اپنے سینے پر ڈال لیں، اپنی زینت و آرائش کو اپنے شوہروں اور محرم مردوں کے سوا کسی اور پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ قُلِ الْمُؤْمِنِينَ يَفْضُلُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ

أَذْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ وَكُلِ الْمُؤْمِنَاتِ يَفْضُلْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ خَوَاتِمٍ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ كَمْ يَظْهَرُونَ عَلَىٰ عَوَاتِ النِّسَاءِ (النور۔ ۳۰-۳۱)

سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور کنایتہ مسلمان خواتین کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں مقیم رہیں اور نہانہ عیالیت کی طرح اپنا بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھریں۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (۳۳) اور کہتا ہے کہ مسلمان خواتین گل کوچوں میں ایسے انداز سے نہ چلیں کہ لوگوں کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو جائیں۔ وَلَا يَضْرِبْنَ

بِأَرْجُلِهِنَّ يَعْلمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (النور۔ ۳۰-۳۱) وہ بے تکلف گفتگو صرف محرم رشتہ داروں شوہروں اور زر خرید غلاموں سے کر سکتی ہیں۔ اسی سورۃ میں اہل ایمان کو ازواج مطہرات کا شایان شان احترام کرنے کا حکم دیا گیا

ہے اور کہا گیا ہے کہ اُن سے کوئی بات کہنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں۔ وَاِذَا  
سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (الاحزاب - ۵۳)

نیز جب مسلمان عورتیں کسی کام سے باہر نکلیں تو ایک بڑی سی چادر سے اپنا جسم ڈھانپ  
لیں اور گھونگھٹ نکال لیں۔ يٰۤاَيُّهَا الْحَيُّ قُلْ لَّا ذَوٰ اِجْتٍ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءَ  
الْمُؤْمِنِيْنَ يَدْخُلْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَا رِيْبِهِنَّ (الاحزاب - ۵۹)

قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اور کنایہ تمام مسلمان عورتوں کو  
حکم دیتا ہے کہ جب نامحرم مردوں سے بات کی ضرورت آپڑے تو نرمی اور لورچ سے بات  
نہ کریں کہ دل کا کھوٹا شخص غلط توقعات نہ باندھ لے بلکہ دو ٹوک، صاف اور سچی بات  
کریں۔ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهِ مَرْحَنٌ وَقُلْنَ  
قَوْلًا مَّعْرُوفًا (الاحزاب - ۳۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان عورتوں کو

تلفیقین کی ہے کہ وہ اپنے شوہروں یا محرم مردوں کے سوا کسی اور مرد سے تنہائی میں نہ ملیں،  
نہ اپنے خاندان سے الگ تنہا رہیں نہ قریبی رشتہ داروں کے بغیر لمبے سفر پر جائیں۔

صحیح احادیث عورتوں کو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے سے روکتے ہیں اور کہتی ہیں کہ  
اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ترین نماز وہ ہے جو عورت اپنے گھر کی تنہائی میں ادا کرتی  
ہے۔ یہ ہے اسلام کا طرزِ عمل عبادتِ الہی کے متعلق پھر وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ

عورتیں سیکر ٹری، بلکوں کی کلرک، فنانیٹ میزبانیں، ریسٹورانوں میں خدمت گار،  
ماڈل، مغنیات، رقاصائیں یا فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اداکار بنیں۔ سورۃ نور کی

ابتدائی ۲۴ آیات میں ان لوگوں کو دنیا و آخرت میں سخت سزا دینے کا اعلان کیا گیا ہے  
جو ناجائز جنسی تعلقات استوار کرتے اور مسلمان معاشرہ میں بے حیائی کو فروغ دیتے  
ہیں۔ اسلام ”دوہنیوں“ کا قائل نہیں ہے۔ قرآن و حدیث ناجائز جنسی تعلقات کے  
خوگر مرد و زن کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ وہ دونوں کو یکساں نوعیت کی



تشدید سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم اور سنت رسولؐ کی اس شہادت سے بڑھ کر بھی کوئی اور ناقابل تردید شہادت اس بات کی ہو سکتی ہے کہ اسلام پر وہ کا حامی ہے؟ مسلمان عورتوں کی نقل و حرکت کو محدود کرنا، والے اسلامی احکام میں درحقیقت خود عورتوں ہی کا مفاد مضرب ہے۔ ان کا مقصد وحید حفظِ مآئدِ مردوں کو بے جانا نذرہ اٹھانے سے روکنا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام دنیا کے تمام مذاہب میں بے نظیر و لامثال ہے۔ وہ نہ صرف بدکرداری کا قلع قمع کرتا ہے بلکہ اہل ایمان کو ان معاشرتی معمولات میں مبتلا ہونے سے بھی روکتا ہے جو انسان کو بدکرداری کی راہ پر لے جاتے ہیں۔

تحرریک آزادی نسواں کے پہلے نقیب کیونزیم کے ہانی کارل مارکس اور اینجلز تھے۔ انہوں نے اپنے کمیونسٹ منشور (۱۸۴۸ء) میں اعلان کیا کہ شادی، گھر اور خاندان ایک لعنت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی وجہ سے عورت دائمی غلامی میں گرفتار ہو گئی ہے۔ انہوں نے عورتوں کو خانگی غلامی سے "نجات" دلانے پر زور دیا اور کہا کہ انہیں صنعتی کارخانوں میں ہم وقتی ملازمت کے ذریعے مکمل اقتصادی آزادی سے ہمکنار کرنا چاہیے۔ ان کے بعد آزادی نسواں کے دوسرے حابیوں نے زور دیا کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے مخلوط تعلیم رائج کی جائے، گھر سے باہر مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو ملازمت دی جائے، مخلوط تفریحی اور معاشرتی تقریبات، جن میں شراب خوردی، نشہ بازی اور رقص کی محفلیں بھی شامل ہیں، منع کی جائیں، مانع حمل ادویہ، آلات استقاظ اور نس بندی اور آپریشن کے ذریعے بانجھ پن کے اعمال عام کیے جائیں تاکہ عورتیں غیر مطلوب عمل سے محفوظ رہ سکیں۔ بچوں کی، جن میں بہت سے ناجائز ہوں گے، پرورش کے لیے یاسٹ کی نگرانی میں نرسیاں اور سرکاری اقامتی درس گاہیں کھول جائیں۔ یہ ہے عورت کے حقوق کے اس جدید تصور کا خلاصہ۔

تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے گلبرگ سکول آف ہوم اکنامکس (لاہور) میں حاضرین







استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان سرگرمیوں پر پولیس کی نگرانی خاصی ڈھیلی ہے۔  
 کیا کرسٹن کیلر اور مارلون مونرو ایسی عورتوں کی فوج تیار کرنا بھی ہمارے قومی  
 ترقیاتی پروگرام کا کوئی حصہ ہے؟

عورت بیوی اور ماں کی حیثیت میں جو کردار ادا کرتی ہے پرپس، ریڈیو اور سینما  
 کے ذریعے ہونے والا آزادی نسواں کا پروپگنڈا اُسے نہایت حقیر گردانتا ہے۔ جو خواتین  
 گھر کے کام کاج اور بچوں کی پرورش میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔ یہ پروپگنڈا اُسے قوم  
 کی نصف افرادی قوت کا ناقابلِ عفو اقتصادی ضیاع قرار دیتا ہے۔ مسلمان ممالک میں  
 سرکاری سرپرستی میں سرعت سے پھیلتی ہوئی مخلوط تعلیم، جس کے نتیجے میں اختلاط مرد و زن  
 کے تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں، بہت سے معاشرتی مفاسد کی ذمہ دار ہے۔  
 مخلوط تعلیم کی بنیاد اس مغالطے پر ہے کہ مرد و زن کے درمیان فطرتاً کوئی فرق و امتیاز نہیں  
 ہے اور دونوں کو گھر سے باہر یکساں نوعیت کے کاموں کی تربیت دی جانی چاہیے تاکہ  
 وہ ہمہ وقتی ذریعہ معاش اختیار کرتے کے قابل ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مخلوط درس گاہوں  
 میں تعلیم پانے والی لڑکیاں ازدواجی زندگی اور اموست کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تربیت  
 شاذ و نادر ہی پاتی ہیں تاہم یہی پروپگنڈا بڑے شد و مد سے یہ بھی کہتا ہے کہ آزاد عورت  
 کی بنیادی ذمہ داری اپنے گھر کی دیکھ بھال ہے گویا بالفاظِ دیگر مغرب زدہ عورت کو دہرا  
 بوجھ اٹھانا ہوگا۔ گھر سے باہر کسبِ معاش کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے شوہر اور بچوں  
 کے فرائض بھی انجام دینا ہوں گے اور اپنا گھر بھی یکہ و تنہا صاف ستھرا رکھنا ہوگا۔ کیا اسے  
 انصاف کہہ سکتے ہیں؟

“Focus on Prostitution,” The Pakistan Times, Lahore,

March 29-30, 1968.



مغربی قوانین کی پیروی میں جو نئے عائلی قوانین اکثر مسلمان ممالک میں نافذ کیے جا چکے ہیں کیا ان سے فی الواقع ہماری خواتین کی حالت سدھر گئی ہے؟ اس نوعیت کے قوانین شادی کی کم سے کم عمر متعین کرتے وقت تو بے شک بڑے فکر و تردد سے کام لیتے ہیں، لیکن وہ معینہ مدت سے کم عمر کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات استوار کرنے پر پابندی لگانا بالکل بھول جاتے ہیں۔ اکثر مسلمان ممالک میں قرآن و سنت کی روح کے یکسر برعکس، تعدد ازواج کو محدود سے محدود ترکیا جا رہا ہے، بلکہ ہمارے متجددین اسے کلیتہً ممنوع قرار دینے چلے ہیں، لیکن وہ اس سوال کا سامنا کرنے کی رحمت گوارا نہیں کرتے کہ کیا کسی عورت کے لیے یہ بہتر ہے کہ کوئی دوسری عورت اُس کی سوکن بن کر اُس کے شوہر کی محبت میں شریک ہو، تاہم وہ خود بھی اپنے گھر میں بحفاظت تمام زندگی بسر کرے اور اُس کے بچوں کو بھی اپنے باپ کا پیار حاصل رہے یا یہ بہتر ہے کہ اُس کا شوہر اُس عورت سے چوری چھپے ناجائز تعلقات قائم کرنے پر اس لیے مجبور ہو جائے کہ ملک کا قانون اُسے اپنے شوہر کی جائز بیوی بننے سے روکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے اور بچوں سمیت گھر سے باہر نکال دے۔ ایک عورت جس کا اپنے شوہر کے ساتھ نباہ مشکل ہو گیا ہو کیا اُس کے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ شوہر اُسے اپنے طور پر طلاق دے دے اور وہ دونوں امن و سکون کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ اور دوسرا نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں؟ یا کیا یہ بہتر ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کریں اور شوہر بیوی سے نجات پانے کے لیے اُس پر بدکاری کا الزام عاید کرے یا اُسے محبوظ الحواس اور پاگل قرار دے تاکہ تیسرے فریق (عدالت) کو یقین ہو جائے کہ طلاق ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو گا کہ کھلے عام تہمت طرازی کی جائے گی اور بے چاری عورت کا دامن عصمت و کردار ہمیشہ کے لیے داغدار اور زندگی تباہ ہو جائے گی۔

امرواقع یہ ہے کہ "آزادی نسواں" کے علم برداروں کو عورت کی ذاتی مسرت و بہبود



سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مذاکرہ لاہور میں ایک خاتون مقررہ مسٹر مستنام محمود نے جو خود اپورا کی پُر جوش حامی ہیں، بڑی صاف گوئی کے ساتھ اعتراف کیا کہ اگرچہ مغربی خواتین مادی فراوانی مکمل معاشرتی آزادی اور مساوات سے بہرہ ور ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ مسرت سے محروم ہیں۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اگر ہمارا مقصد ذہنی سکون کا حصول ہے تو نام نہاد "آزادی" کا دامن اس مقصد سے تہی ہے اور اس راہ پر چل کر ہم گوہر مقصود سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ بیگم قیصرہ انور علی نے، جو ایک آزمودہ کار سماجی کارکن اور اپورا کا ستون ہیں، اس بات پر شدید مایوسی ظاہر کی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین اپنے مذہبی و ثقافتی پس منظر اور قومی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ حالانکہ وہ اس حقیقت کو سرِ یحیٰٰ نظر انداز کر گئیں کہ اس نامبارک ارتقاء میں ان کی اپنی تنظیم کی سرگرمیاں کار فرما رہی ہیں۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آزادی نسواں کی تحریک دراصل اختیار کی ایک انتہائی ناپاک سازش ہے۔ اس طرح وہ گھر، خاندان اور بالآخر پورے معاشرہ کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ "عورتوں کے حقوق"، "آزادی" اور "ترقی" وغیرہ کے فرسودہ نعرے اس تحریک کے حقیقی عزائم کو چھپانے کے لیے محض ایک پردہ ہیں۔ مسلمان ممالک میں آزادی نسواں کی تحریک کے وہی تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے جو دوسرے ملکوں میں ہو چکے ہیں۔ ان ملکوں میں ناجائز جنسی تعلقات و باکی صورت اختیار کر چکے ہیں، انسانوں کی اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ جنگل کے وحشی جانور تک شرمناک نہیں۔ گھر اور خاندان بلکہ پورے معاشرہ کا ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ کم سن مجرموں، جرائم، تشدد سے معمور فضا، بے چینی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ مافی کی گود میں سو جانے والی تہذیبوں کی تاریخ گو اسی دیتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرہ میں بدی اور فسق و فجور کا طوفان اُٹھ اُٹھتا ہے، اُس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

## مسلمان ماں کے فرائض

مسلمان ماں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن و سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرے۔ عجمی مسلمان ممالک کی اکثر مسلمان خواتین اگرچہ قرآن کریم کی تلاوت روزانہ صبح سویرے بڑے اخلاص و عقیدت کے ساتھ کرتی ہیں، لیکن انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ جو کچھ اپنی زبان سے ادا کر رہی ہیں اس کے معانی کیا ہیں اور یہ کتابِ عظیم اُن کے لیے اپنے دامن میں زندگی کا کون سا پیغام رکھتی ہے۔ بے شمار مسلمان لڑکیاں، خصوصاً وہ جو جدید تعلیم سے بہرہ ور ہیں، زیادہ تر مذہب کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ وہ قرآن و حدیث اور دوسرے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ بھی کرتی ہیں، مگر اس طرح گویا اسلام محض ایک عظیم الشان مجرّد فلسفہ ہے۔ وہ سینما کی نقش فلمیں دیکھتی اور ریڈیو پر گاتے جانے والے یہود و اوربازاری گیت کچھ ایسے ذوق و شوق سے سنتی ہیں کہ بے خیالی، بلکہ بسا اوقات نیند، میں خود بھی گانے لگتی ہیں۔ وہ نیم غریب چُست لباس پہن کر مخلوط مجالس میں شریک ہوتی ہیں۔ انہیں خیال تک نہیں آتا کہ ان جیاسوز باتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ مسلمان ماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی رہنمائی کریں۔ انہیں بتائیں کہ ان کے سکول یا کالج کے ساتھی اس قسم کے کام کرتے ہیں تو اس سے ان کے درست اور حق ہونے کا جواز نہیں مل جاتا۔ مسلمان خواتین کو

یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ اُن کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اکثر مسلمان گھر آنے قرآن کریم کو خوبصورت ریشی خلافت میں لپیٹ کر اپنے طاق میں رکھ دیتے ہیں جہاں وہ پڑے پڑے گرد و غبار میں اٹ جاتا ہے۔ کسی کو خیال تک نہیں آتا کہ اللہ کی عظیم کتاب بزبان خاموش فریادگناں ہے۔ وہ شب و روز ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ مجھے اس طاق سے اٹھاؤ، پڑھو اور میری ہدایات پر چلو، لیکن اس کی اس خاموش فریاد پر کسی کو کان دھرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

مائیں زمانہ رسائل میں آتے دن پڑھتی رہتی ہیں کہ مدتوں کی مسلمہ اخلاقی اور دینی قدروں کے خلافت نوجوان بچوں کی پرجوش بغاوت، ان کا احمقانہ بیہودہ طرزِ عمل، چھوٹی چھوٹی بے یار اور بیچارہ باتوں کی طرف بے محابا کشش، ہر روایاتی چیز سے شدید نفرت اور انقلابی تبدیلیوں، یعنی مغربی الحاد اور مادہ پرستی کو اپنانے کی بے تابانہ خواہش دراصل جدید نوخیز نسل کی فطری حیاتیاتی حقیقت ہے۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ نیز یہ بھی مان لیں کہ نئی نسل کے عام رجحانات کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ یہ مشورہ سراسر فریب کاری پر مبنی ہے۔ یقیناً کوئی بات بھی ناگزیر نہیں ہے۔ تجدد پسندوں کے پراگندے کے برعکس حالات اس قدر مایوس کن نہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ ہماری جانب سے بھرپور جدوجہد ہونے ہی نہیں پائی۔ درحقیقت یہ ردِ عمل ہے اُس تعلیم کا جو ہمارے نوجوان گھروں، سکولوں اور کالجوں میں پاتے ہیں اور ان باتوں کا جنہیں وہ رسائل و جرائد میں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اگر انہیں مغربی طور اظہار کے بجائے اسلامی طرز کی تعلیم دی جاتی تو ان کے جذبات، خیالات اور طرزِ عمل کا انداز ہی اور ہوتا۔ اس مطلوبہ تغیر کو لانے میں خواتین فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہیں، کیونکہ وہ اگر چاہیں تو اپنے نوخیز بچوں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈال سکتی ہیں۔

پردہ کے اسلامی احکامات مسلمان خاتون سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ باوقار انداز میں خلوت گزریں رہے، زیادہ تر وقت اپنے گھر میں گزارے اور صرف ناگزیر ضروری کام سے باہر



نکلے۔ وہ اپنے قرابت داروں اور سہیلیوں کے ہاں بھی کبھی کبھار جاسکتی ہے۔ ایک ماں اپنے نر خیز بچوں کے لیے اعلیٰ نمونہ بن کر ان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جو خاتون ہر وقت گھر کے کام کاج، اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت نیز نماز روزہ اور تلاوت وغیرہ ایسے اعمالِ صالح میں ہمہ تن مشغول رہتی ہے وہ اپنے بچوں کو بہترین اسلامی فضا بہم پہنچاتی ہے۔ ایسی فضا اُن لاتعداد ناگوار اثرات کے ازالہ میں بڑی مدد ثابت ہوگی جن سے وہ بیرونِ خانہ دوچار ہوں گے۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو زندگی کے بالکل ابتدائی مرحلے ہی سے اسلامی تعلیم دینے کا اہتمام کریں۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام اپنے بچوں کو دودھ چھڑانے سے پیشتر ہی قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے لگتے تھے۔ بچہ جو نہی بولی چال شروع کرے اُسے کلمہ طیبہ، بسم اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، انشاء اللہ اور ماشاء اللہ ایسے کلمات سکھانے چاہئیں۔ جب وہ کھڑا ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے تو ماں کو کوشش کرنی چاہیے کہ بچہ اُس کے نقش قدم پر چلے۔ بچے اپنے بڑوں کی نقل بڑے ذوق و شوق سے اتارتے ہیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ ان کی حوصلہ افزائی کریں اور کوشش کریں کہ جب وہ نماز پڑھنے کھڑی ہوں تو بچے ان کی نقل اتاریں۔ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز پڑھنے کی تلقین کریں۔ دس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور نماز نہ پڑھے تو باقاعدہ گوشمالی کریں۔ اس طرح بچے بچپن ہی سے اپنے خدا اور اُس کے بندوں کے فرائض ادا کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ان تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں پر ان کی عمر اور ذہنی استعداد کے مطابق ان فرائض کی اہمیت واضح کریں۔ انہیں گزشتہ اور موجودہ عہد کے مسلمان اکابر کے ایمان افروز اور جوش انگیز حالات سنائیں۔ ان کے دل میں نیکی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب بچے خود پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو انہیں چھوٹی چھوٹی اسلامی کتابیں لاکریں اور پڑھنے کا شوق دلائیں۔ بڑے اور بالغ بچوں کو نہ صرف ریڈیو اور ٹیلیوژن کے اخلاق سوز پروگرام اور نقش فلمیں دیکھنے سے روکیں بلکہ اُن پر ان کے مفاسد بھی آشکار کریں۔



اگر کسی گھر میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن ہے تو ماں کو چاہیے کہ وہ اسے تلاوتِ قرآن، خبروں، عمدہ نظموں اور صحت مند تعلیمی پروگرام تک محدود رکھے۔ فحش اور بیہودہ گیت سُنانے کی اجازت کسی صورت بھی نہ دے۔ بچوں پر ایسے گیتوں کے بدترین اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بچہ پڑوس کے ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے سُنے ہوئے گیت کبھی گانے لگے تو اُسے فوراً خاموش کر دے اور بتائے کہ اگر لوگ ایسے فحش گیت گاتے ہوئے سُن لیں تو کتنی شرم کی بات ہے۔

مسلمان ماں اپنے بچوں کو کسی انگلش میڈیم کہ سچن مشنری سکول یا کونٹ میں ہرگز نہ بھیجے، ان درس گاہوں میں بچوں کو ان کے دین و ملت اور تہذیبی میراث سے بالکل بیگانہ کر دیا جاتا ہے تاہم سرکاری درس گاہوں کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ ان کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر پر عربی قرآن اور حدیث کی تعلیم دینے کا انتظام بھی کرے۔ بصورتِ دیگر بچوں کو مسجد کے مکتب میں بھیجے حتیٰ الامکان خود بھی ان کی تعلیم اور ذہنی و فکری تربیت کی طرف توجہ دے۔ ممکن ہو تو بچوں کی تمام نصابی کتابیں غور سے پڑھے اور انہیں بتائے کہ ان کتابوں میں بہت سی باتیں نہ صرف نادرست ہیں بلکہ جھوٹ اور نقصان رساں بھی ہیں، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید برآں انہیں بالوفضاوت موثر انداز میں یہ بھی بتائے کہ یہ باتیں غیر اسلامی کیوں ہیں؟

مسلمان ماں کو چاہیے کہ وہ اپنا گھر صاف ستھرا رکھے اور اُسے حتیٰ المقدور پرکشش اور جاذب توجہ بنائے۔ یہاں لاہور میں مجھے بہت سے پاکستانی گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اکثر، حتیٰ کہ طبقہ اوسط کے گھر بھی تاریک اور گندے ہیں۔ میں ایسی متعدد خواتین سے واقف ہوں جن کے گھروں میں کوڑے کرکٹ کا انبار لگا رہتا ہے۔ خصوصاً باورچی خانے اور صحن تو بڑے ہی گندے ہوتے ہیں۔ یہ خواتین شاید خود جھاڑو دینے کی زحمت اٹھانے کے بجائے گندگی میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات لڑکیوں کو صاف ستھرا اور سلیقہ پسندی و شائستگی سے رہنا سکھاتی ہیں۔ عورتیں اپنے گھر کی صفائی کرنے اور جھاڑو بہاؤ دینے سے نہ تو شرماتیں اور نہ

اسے کسرِ شان سمجھیں۔ نیز خدمت گاروں پر انحصار کر کے نہ رہ جائیں کہ وہی صاف کریں گے۔ اگر اللہ نے خوش حالی عطا کی ہے تو گھر کی آرائش پر روپیہ بیکار ضائع نہ کریں۔ غیر ضروری فرنیچر مثلاً مغربی طرز کے صوفوں، شگھار میزوں اور چھوٹی موٹی آرائشی چیزوں سے احتراز کریں۔ دیواروں پر اسلامی طغروں کی نمائش سے دو گونہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ گھر کی زیبائش بھی ہو سکتی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کہ یہ ایک مسلمان گھر ہے۔ اہل خاندان اور دوستوں کی تصاویر چوکھٹوں میں لگا کر دیواروں پر آویزاں نہ کریں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیم کا تقاضا ہے کہ لڑکیاں صحت کے بنیادی اصولوں، فوری طبی امداد اور اصولِ تغذیہ سے واقف ہوں۔ بہت سی مسلمان عورتیں اصولِ تغذیہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ نہیں جانتیں کہ بچوں کو کھل غذا کیونکر دی جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح غذا دستیاب بھی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو دے بھی سکتی ہیں۔ ان پڑھ اور شعور و احساس سے تہی دامن عورت ان اسلام دشمن اثرات کا معقول سدِ باب نہیں کر سکتی جو اُس کے بچوں کو شب و روز نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عاملِ فہم، تعلیم یافتہ اور پرجوش مسلمان خواتین ہی اُس کام سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں جس سے وہ آج دوچار ہیں۔

۱۲۴

## اسلامی معاشرہ کے لوازمات

اگر ہم واقعی مسلمان ہیں اور اپنے دین کی سالمیت کو عزیز رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی دینی و تہذیبی انفرادیت کو پوری قوت کے ساتھ برقرار رکھیں اور اُس پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دیں۔ تہذیب جدید کا نظریہ الحاد، اس کی مادہ پرستی اور اُس کے قوانین اور اداروں کو جو ان تمام چیزوں کے لیے سخت تباہ کن ہیں جنہیں ہم عزیز رکھتے ہیں، نہ صرف مسترد کر دیں بلکہ اسلامی نظام حیات کی تعمیری اور مثبت اقدار پر مسلسل زور دیں اور انہیں اپنی زندگی میں عملاً نافذ کریں۔ تہذیب جدید کی تباہ کاریوں سے اپنی دینی و تہذیبی زندگی کو محفوظ رکھنے کا اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ تہذیب جدید کے مقابلے میں مثبت نظریاتی بنیادوں کا وجود اجنبی اثرات کو ہمیشہ کے لیے طیامیٹ کر دے گا۔ یہ کام سرانجام دیتے وقت ہمیں اپنی صفوں میں شامل مفاد پرستوں کے ساتھ زندگی اور موت کی کشمکش کرنا پڑے گی۔ اس لیے کہ یہ مفاد پرست ہماری مساعی کو ناکامی سے دوچار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیں گے۔ ہم ان سطور میں جو راہ عمل تجویز کر رہے ہیں یہ لوگ اسے ہمیشہ تضحیک و استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسے قطعاً ناقابلِ عمل اور محض خوش خیالی کا حاصل گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صنعتی ترقی کے اس دور میں پوری دنیا ایک دوسرے کی اس طرح دست نگر ہو چکی ہے کہ کوئی قوم جدید تہذیب سے دامن کش رہ کر اپنا وجود



تأم رکھنے کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جدید دنیا میں کسی حکومت کا تیرہ صدی قبل کے آسمانی قانون پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔ وہ بار بار بڑے شد و مد سے کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت آثارِ قدیمہ بن چکی ہے اور خلافت کی حیثیت عجائب گھر میں رکھی جانے والی کسی نادور شے سے زیادہ نہیں ہے۔

Shame

ان کا یہ طرزِ استدلال سخت قابلِ گرفت ہے۔ جو لوگ "حقیقت پسندی" (realism) اور "عملیت" (practicality) کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں، کیا کبھی انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ اگر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ طبیعت بھی یہی ہوتا تو حضورؐ اور آپ کے مٹھی بھر اصحابؓ اپنے عہد کی عظیم ترین شاہنشاہی طاقتوں سے ہر دو زمانیٰ کو ناممکن جان کر حصولِ مقصد سے بائوس ہو جاتے۔ اس منطق پر عمل کیا جاتا تو کبھی جنگِ بدر نہ لڑی جاتی۔ غربت زدہ مسلمان اس قدر قلیل التعداد تھے کہ وہ اسلحہ میں غرق تین ہزار قریشی سواروں کے مقابلے میں صرف تین سو آدمی میدان میں لاسکے، جن کے پاس نہ پورے ہتھیار تھے نہ سواری کے جانور۔ کیا یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ "حقیقت پسند" (realist) ہی تھے جنہیں کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تباہی کا خطرہ تھا، وہ انہیں صرف مکہ ہی کا نہیں پورے عرب کی آمدنی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو لوگ "عملیت" کے دلدادہ اور اس کی مدح و توصیف میں مصروف ہیں انہیں اپنی منطق کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں امیر معاویہؓ کی دنیوی کامرانی کا قصیدہ سرا ہونا چاہیے اور حضرت حسینؓ کو ایک سر پھرا شخص قرار دینا چاہیے، کیونکہ کہ بلا میں اُن کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ فی الحقیقت مسلمانوں اور کافروں کے کردار کا امتیازی نشان یہی ہے کہ کافر اپنے اعمال کی بنیاد موقع پرستی اور مصلحت کو بناتے ہیں اور مسلمان دنیوی نتائج کی پروا کیے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جو حق کا تقاضا ہوتا ہے۔

شریعت کا تفوق تسلیم کیے بغیر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آسکتا۔ شریعتِ الہی کی نظر میں چونکہ حاکم و محکوم دونوں برابر کی رعایا ہیں اس لیے ایک صحیح اسلامی ریاست میں

ظلم و استبداد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شریعت کے شیریں ثمرات سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعبیر ہمیشہ اُس کے ظاہری مفہوم تک محدود رکھی جائے۔ نہ کسی قسم کی رعایت سے کام لیا جاتے اور نہ زمانے کی نام نہاد تبدیلی کے پردے میں کسی مصلحت کا شکار ہوا جائے۔

یہاں اجتہاد (شریعت کی تعبیر میں آزادانہ راستے کا استعمال) اور تقلید (فقہائے متقدمین کی راستے پر انحصار) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ظالم اسلام جس زوال و انحطاط اور جمود کا شکار ہے اُس کا ذمہ دار بالعموم "تقلید" کو گردانا جاتا ہے۔ یہ گویا آج کل کی ایک رسم بن چکی ہے۔ لیکن یہ ایک گمراہ کن راستے ہے۔ اس مغالطہ کا بے نقاب کرنا نہایت ضروری ہے۔ تقلید درحقیقت ان افسوسناک حالات کا سبب نہیں بنتی تھی۔ صلیبی جنگوں اور منگولوں کے حملوں کے دوران میں بے شمار علمی مراکز تباہ ہو گئے، لیکن اس دور کے ممتاز فقہاء اور علماء راستے دوراندیش ضرورت تھے کہ اس کے نتائج و عواقب ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔ وہ سمجھ گئے کہ اگر نااہل، غیر مجاز اور جاہل لوگوں کو شریعت میں من مانی تحریف کرنے کی چھٹی دیدی گئی تو معاشرہ کھلم کھلا کاشکار ہو کر پراگندہ ہو جائے گا، چنانچہ وہ اجتہاد کے نام شہر بے ہمار بننے کے بجائے تقلید پر زور دینے لگے۔ آج کل جدید تعلیم یافتہ رہنما، جنہیں اسلامی اقدار کی قدر و اہمیت کا یا تو سرے سے احساس ہی نہیں ہے یا ہے تو نہ ہونے کے برابر، اسلامی شریعت کو مسخ کرنے کی خاطر حق اجتہاد کا دعویٰ کر رہے ہیں؛ چنانچہ وہ اس مقصد کے پیش نظر مسئلہ ائمہ کی فقہ کو مسترد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فقہ آج کی دنیا میں مناسب و موزوں نہیں رہی۔ اس سلسلے میں وہ حدیث کی صحت کو بھی مشکوک گردانتے ہیں۔ اس طرح چاہتے ہیں کہ انہیں مغربی بدعات کو رواج دینے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل جائیں۔ اسے یہ متجددین اجتہاد قرار دیتے ہیں۔

اجتہاد بلاشبہ اسلامی فقہ کا ایک بنیادی اور ناگزیر اصول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے خود اس کے جواز کی توثیق فرمائی ہے۔ بنابرین اصولی اعتبار سے اس کو مسترد نہیں کیا جا

سکتا۔ دراصل قابلِ مذمت وہ ناجائز طریقِ عمل اور اندازِ تعبیر ہے جو اجتہاد کے نام پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اجتہاد صرف وہی جائز ہے جو:

۱۔ صرف ان معاملات میں کیا جائے جن کے متعلق قرآن و سنت کی واضح نصوص موجود نہ ہوں۔

۲۔ قرآن و سنت سے متصادم نہ ہو۔

۳۔ قرآن و سنت کے صحیح اصولوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی غلط استدلال نہ کیا جائے۔

ہمارے متجددین ان تمام شرائط کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ خصوصاً آخری شرط تو رُبّی طرح پامال ہو رہی ہے۔

جدید حالات کی روشنی میں شریعت پر نظر ثانی کی کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی مداومت اور حکمی کاشتہ تک باقی نہ رہے گا، جو ایک مسلمان کے نزدیک شریعتِ الہی کے تصور کا لازمی اور ناگزیر جزو ہے۔ اس لیے کہ شریعت پر نظر ثانی اگر آج ضروری قرار پاتی ہے تو چند عشروں کے بعد پھر ضروری ہو جائے گی، کیونکہ اُس وقت "جدید حالات" بدل چکے ہوں گے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا، حتیٰ کہ اس عملِ پیہم کے نتیجے میں اسلامی شریعت کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ عمل درست اور بجائے ہے تو پھر ہمیں یہ دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے کہ شارعِ علی نے اسلامی شریعت کو ابدی شریعت بنایا ہے؟ اس صورت میں کیا یہ کہنا زیادہ درست نہ ہو گا کہ چونکہ یہ شریعت حالات کو اپنے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود ان کی تابع ہے اس لیے شریعتِ الہی نہیں ہو سکتی۔



تعلیم اسلامی معاشرہ کا اہم ترین فرض ہے۔ اچانک اسلام کا کام جمہور امت کی تائید کے بغیر ناممکن ہے۔ جب تک نوخیز نسل کو اپنے مذہب کی افادیت کا پورا پورا احساس و شعور نہ ہو کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

یہ کام کس طرح سرانجام پاسکتا ہے؟

اول ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح مقام مسجد ہے۔ ہماری ہر مسجد کو ایک مدرسہ ہونا چاہیے۔ دوم ہر تعلیمی سطح پر عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اسے دیگر مضامین پر فوقیت دی جائے۔ مسلمان بچے نہ صرف قرآن پڑھنا اور حفظ کرنا سیکھیں بلکہ اس کے معانی بھی پوری طرح سمجھیں۔ ذریعہ تعلیم عربی ہو۔ عربی کو محض ایک ضمنی مضمون کی نہیں بلکہ نقطہ ماسکہ کی حیثیت حاصل ہو اور پورا نصاب تعلیم اس کے گرد گھومے۔ تمام مضامین کی تعلیم کا قرآن کریم کے ساتھ گہرا ربط ہو اور دینی و دنیوی تعلیم کے درمیان تفریق و امتیاز کو ختم کیا جائے۔ اس طرح پورے نصاب تعلیم میں ہم آہنگی اور سالمیت پیدا کی جائے۔ یورپی زبانوں، ادب، فلسفہ اور قانون کی تعلیم صرف یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج تک محدود رکھی جائے۔ ہمیں اپنے بچوں اور نوجوانوں کو کسی صورت میں جدید تعلیم کے رسم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیے، کیونکہ جلد متاثر ہونے والے اور ناپختہ ذہنوں کے لیے اس سے بڑھ کر سم قاتل اور کوئی نہیں۔ دوسری طرف ارباب اختیار اور ذی اثر اصحاب کا جدید تہذیب سے پوری طرح آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ اس کے اثرات کا نوڑ موڑ طریقے سے کر سکیں۔

ہمارے نوجوانوں میں اپنے ماضی کا واضح فہم و ادراک اور حال کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اسلامی تاریخ کے متعلق انقلابی طرز عمل اختیار کرنا ہوگا۔ قرون وسطیٰ کے یورپ کو یونانی فلسفہ معتزلہ (عقلیت پرستوں) کے ذریعے ملا تھا۔ ہمارے منتخب طبقے کی بھاری اکثریت اسے انسانیت کے فکری ارتقا میں اسلامی تہذیب کا بہت بڑا حصہ قرار دیتی ہے۔ الکندری، الفارابی، ابن سینا اور ابن رشد ایسے یونانی فلسفے کے فضلا و کی مدرج و توصیف میں



زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں، جس کے وہ فی الواقع مستحق نہیں ہیں۔ اسلامی تاریخ کا صحیح تر خطوط پر مطالعہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز، صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر کے کارنامے اتنے جلیل القدر کیوں ہیں۔ جدید مغرب تہذیب کی تخلیق میں اسلام کے کردار کے متعلق شیخی گجراتی کے بجاتے ہیں اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی وساطت سے یونانی فلسفہ کا قرون وسطیٰ کے یورپ میں پہنچنا محض ایک اتفاق امر تھا اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام کا ماخذ خطائے منزہ خدائی الہام ہے بنا بریں وہ ایک مکمل، خود نگر اور انسان کے خود ساختہ فلسفہ سے مطلقاً آزاد دین ہے۔ ماضی یا عصر حاضر کی کسی تہذیب کے مقابلے میں اس کی صحت کو جانچنے پر کھننے کی سعی لا حاصل ہے، نیز یہ دعویٰ بھی بے سود ہے کہ اسلام نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اسلامی تہذیب عظیم تر تہذیب ہے۔ اسلام اپنی زندگی اور عظمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے، نہ وہ کسی اور تہذیب کا تابع ہے۔

ہمارے حکمرانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں نظام تعلیم کی ترقی میں دلچسپی لیں، اس کی اخلاقی تائید کریں اور مل کھول کر مالی امداد دیں، تاہم درس گاہوں کو ریاست کے براہ راست تسلط سے بالکل آزاد ہونا چاہیے اور انہیں خود مختار بنیادوں پر چلنے پھولنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ متمول افراد کو ترغیب دینی چاہیے کہ وہ زکوٰۃ اور رضا کارانہ صدقات کے ذریعے درس گاہوں کی مالی امداد کریں۔ زکوٰۃ، رضا کارانہ صدقات، وصایہ اور اوقاف کی امداد کے بل پر ابتدائیہ مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم مفت دی جاسکے گی۔ ابتدائی تعلیم ہر بچے کے لیے لازمی قرار دی جائے، البتہ ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم صرف ان نوجوانوں تک محدود رہے جو اپنی فطری دلچسپی اور ذہنی صلاحیت کی بنا پر اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔ الدین کو ہر قسم کی مراعات اور سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ وہ اپنے بچے مدرسوں میں بھیجیں، تاہم قانونی جبر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرنا بنیادی طور پر ریاست کی نہیں باپ کی ذمہ داری

ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کن خطوط پر کرے۔

اسلامی معاشرہ کا ایک اور اہم فرض خانہ ان کا تحفظ ہے۔ باہمی شفقت اور ذمہ داری پر مبنی مضبوط خاندانی روابط ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ناگزیر اور لازمی ہیں۔ بزرگوں کی سعادت مندانہ اطاعت، ان کا احترام اور لحاظ و مروت نہایت ضروری ہے۔ اس کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ انتہائی موثر طریقہ یہ ہے کہ تقدیسِ شباب اور جوانی کی پوجا کا مسلک ختم کر دیا جائے۔ عورتیں جب صحت مند خانگی زندگی کے تحفظ کی عظیم ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے بجالانے میں عزت و وقار محسوس کریں گی تو مردوں کا کردار ادا کرنے کی خواہش مند نہیں رہیں گی، پھر وہ کاروبار اور سیاست کے میدان میں مردوں کے مقابلے کو اپنے انسانی وقار کا مسئلہ نہ سمجھیں گی نہ ساتیر اور حیا دار لباس پہننے کی تلقین، کھلے عام بے پردگی کے مظاہرے اور جسمانی نمائش کو قانوناً روکنے پر چراغ پا ہوں گی۔

اسلامی معاشرہ کے لیے لازمی ہے کہ اختلاطِ مرد و زن کو روکے اور بلوغت کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ کر دے۔ غیر اخلاقی کتابوں، انجارات و رسائل، کتابوں اور تجارتی اشتہارات میں تصویروں کی اشاعت پر پابندی عائد کرے، نشہ آور مشروبات کی فروخت کو ممنوع قرار دے اور ناجائز جنسی تعلقات پر حد نافذ کرے۔ اسلام کی اخلاقی قدروں کے لیے سینما کی موجودہ صنعت سے بڑھ کر زہرِ ملاحل اور کوئی فتنے نہیں ہے اس لیے ضروری ہے کہ تمام غیر ملکی فلموں کی درآمد بند کر دی جائے اور اندرون ملک میں اخلاق کش، جاسوز اور فحش فلمیں تیار کرنے پر پابندی لگا دی جائے۔ سینما اور ٹیلی ویژن کو صرف دینی اور تعلیمی مقاصد تک محدود رکھنا چاہیے۔

ہمیں قومیت پرستی کی بُرائی کے خلاف زبردست جنگ لڑنا ہوگی اور عالم اسلام میں پھیلی ہوئی اُمتِ مسلمہ کے باہمی روابط مضبوط کرنا ہوں گے۔ مختلف مسلمان ملکوں کا سیاسی اتحاد فوراً ممکن نہ ہو تو پاسپورٹ، ویزا، درآمد و برآمد پر محصول اور جنگی وغیرہ ختم کر کے اور آزاد

تجارت اور بے روک ٹوک سفر کو فروغ دے کر اس کا راستہ ہموار کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان ممالک میں جو اقلیتیں سکونت پذیر ہیں انہیں مذہبی و ثقافتی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے حقوق کا تحفظ قانون شریعت کے مطابق پوری دیانت داری سے کیا جائیگا۔ جب تک ہم غیر ملکی تہذیب کی نقالی کے تباہ کن نتائج کا اعتراف کر کے اسے ختم کرنے کی ہر ممکن تدبیر نہیں کریں گے، قوتِ حیات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ مغربی لباس اور بود و باش کا انداز اختیار کرنے سے اجتناب قومی زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتا تو اسے ہمارے مشہور مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲ - ۱۴۰۶ء) کی مندرجہ ذیل رائے کو غور سے سننا چاہیئے۔

”مفتوح اقوام ہمیشہ فاتح قوموں کے لباس، امتیازی نشان، رسم و رواج اور معمولات کی اتباع کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو بہترین اور کامل نمونہ سمجھتے ہیں، جو انہیں شکست دے کر محکوم و مطیع بنا لیتے ہیں۔ فاتحین کی عظمت و عزت ان کے دل میں گھر کر جاتی ہے، یہی جذبہٴ احترام انہیں ان فاتحین کا رنگ و رنگ اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے۔ یا پھر وہ اپنی شکست کے حقیقی اسباب و عوامل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان فاتحین کی کامرانی کا سبب ان کی انتہائی کاہلیت ہے۔ ایک مباحرصہ گزرنے پر یہ یقین گہری جڑیں پکڑ لیتا ہے، چنانچہ وہ فاتحین کے طور اطوار اور عادات و خصائل کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ یہ نقالی غیر شعوری طور پر بھی کی جاسکتی ہے اور اس غلط اعتقاد کی بنا پر بھی کہ فاتحین کی فتح یا بیابی ان کی برتر عصبیت، قومی استحکام اور جسمانی قوت کی بنا پر نہ تھی، بلکہ مفتوح قوم کے رسم و رواج اور گہرے عقائد اس کے ذمہ دار تھے، وہ اس خیالی خام میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس طرح نقالی کر کے شکست کے اسباب و عوامل کا ازالہ ہو جائے گا۔۔۔



درحقیقت ہر وہ ملک جس کے پڑوسی زور اور فاتح ہوتے ہیں، اپنے ان پڑوسیوں کی نقالی کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ ہم سپین کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ لباس اور زیب و زینت وغیرہ میں اپنے عیسائی پڑوسیوں کی نقالی کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے گھروں اور دکانوں میں مجسمے اور تصویریں تک موجود ہیں۔ نگاہِ غائر سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ لوگ احساسِ کہتری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

ابنِ خلدون نے صرف ایک پیرے میں ایک عبقری کی سی بصیرت کے ساتھ اس مرض کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ مداوا ظاہر ہے۔ اگر ہمیں اپنے مذہب اور اس کی میراث پر واقعی فخر و ناز ہے تو لازم ہے کہ اس کا اظہار ہماری ظاہری وضع قطع سے بھی ہو۔ اگر ہم اپنے دشمنوں کی نظیر بننا نہیں چاہتے تو ہمیں ان کی مشابہت بھی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم اپنے آپ کو مسلمان کے طور پر پیش کرنے سے شرماتے ہیں تو مسلمان کہلانے کے مستحق یقیناً نہیں ہیں۔

”کوئی نہایت کم مایہ ماہرِ نفسیات ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ امور چونکہ خارجی نوعیت کے ہیں اس لیے ذرا اہمیت نہیں رکھتے۔ انسان کے جسم کے بعد اس کے کپڑے اور گھر اس کی روح سے قریب ترین اشیاء ہیں اور اس پر بے اندازہ اثر ڈالتی ہیں۔ اسلامی تہذیب کے ماحول میں انسان کی روح کے لیے اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا نہایت آسان تھا۔ لیکن کسی معقول سبب کے بغیر، اللہ کی عطا کردہ اس تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے، چنانچہ ہم اکثر مسلمان ممالک میں دیکھتے ہیں کہ مردوں نے وارثیاں صفا چٹ کر وادی ہیں، عملے اتار دیے ہیں اور ایسا لباس پہننا شروع کر دیا ہے جو



و نو کرنے میں سخت غل ہوتا ہے اور نماز پڑھتے وقت انسان کی حرکات و سکنات کو عجیب بے ڈھنگا اور مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ رہے ان کے گھر، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے خدا یاد آئے، اٹاؤہ خدا فراموش امور سے معمور ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ عمارت مسلمان کی داخلی عظمت کا خارجی نشان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارت کی مدح و توصیف بیان فرمائی اور مردوں کو دارِ محی رکھنے کی تاکید کی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ڈھیلے ڈھالے ملبوسات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے، صحیح معنی میں اسلامی ہیں کیونکہ صرف یہی ایک ایسا لباس ہے جس میں نماز پڑھتے وقت وقت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن مسجد نبوی ہی کا ایک اضافی حصہ تھا اور بارہ صدیوں سے زائد عرصہ تک ہر مسلمان کا گھر قریب ترین مسجد کا اضافی حصہ بنا رہا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں داخل ہوتے وقت جڑتے آثار لیتے تھے۔ فرش پر پاک چٹائیاں اور قالین پھے ہوتے تھے۔ وہ گھروں میں بھی اسی ادب و احترام کے ساتھ بیٹھتے تھے جس طرح مساجد میں۔ دیواروں پر آویزاں طعنے خدا کی یاد دلاتے اور اسمائے حسنیٰ آیات قرآنی اور ارشادات رسول پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ ہے اسلامی تہذیب کا جوہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ متذکرہ بالا امور میں آج تغیر و تبدل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ پھر مسلمانوں کے گھر آج بھی مسجد کا اضافی حصہ کیوں نہ ہوں۔ ایسے ماحول ہی میں اسلام فی الواقع پھل پھول سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کے سایہ میں دنیا کے شب و روز کس نوعیت کے ہوں گے؟

مہ الحاج ابو بکر سراج الدین (سابق ڈاکٹر مارٹن لیگن) نو مسلم انگریز بچوالہ مسلم نیوز انٹرنیشنل

لندن جنوری ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۹-

جب لوگ اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور اس کے قانون کی برتری کو تسلیم کر لیں گے، زندگی کی تمام باطل اقدار کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگ اپنے جیسے انسانوں کے نہیں اپنے خالق و مالک اللہ کے غلام ہوں گے۔ بالفاظِ دیگر وہ ہر قسم کے ظلم و استبداد سے آزاد ہو جائیں گے۔ انسان کے مرتبہ و مقام کا فیصلہ اُس کی دنیوی کامرانیوں سے نہیں سیرت و کردار سے کیا جائے گا۔ نسلِ امتیاز یا طبقاتی نفرت کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ نماز و روزہ، حج اور زکوٰۃ انسانوں کے مابین شفقت و محبت، اعتماد اور ذمہ داری کے بندھن مضبوط کر دیں گے۔ خوشحال لوگ اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر اُس سے بہرہ اندوز ہوں گے، جس میں غریب کا بھی قانوناً جائز حصہ ہوگا۔ یہ دنیا تصنع یا فریب سے پاک ہوگی۔ عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش نہیں کریں گی نہ سی رسیدہ لوگ اپنے بڑھاپے پر نادام و متاسف ہوں گے۔ چرنکہ دنیا کو محض ایک عارضی جہتے قیام سمجھا جائیگا اس لیے لوگ ہر آن ابدی نجات کی فکر میں عورتیں ہوں گے اور اللہ کے ذکر اور فکرِ آخرت سے غافل کرنے والی تمام باتوں کو بُرائی سمجھ کر ان سے احتراز کریں گے۔ شبینہ کلب، زفص گاہیں، نالک گھر، شراب خانے، قمار خانے اور چکلے ویران اور کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو جائیں گے۔

اسلامی معاشرہ یقیناً نہ ہوگا، کیونکہ بے عیبی اور کمالیت اس خاکدانِ ارضی سے تعلق نہیں رکھتی۔ بعض لوگ تحریریں کا شکار ہو کر قانون کی خلاف ورزی کریں گے، تاہم جرائم محدود ہو جائیں گے اور وبا کی طرح اخلاقی تباہ کاری چمانے کے بجائے دُکے افراد ہی ان کے مرتکب ہوں گے۔ کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق ذہنوں میں کوئی الجھن نہ ہوگی۔ اسلامی معاشرہ میں لوگ بلاشبہ مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوں گے۔ اس لیے کہ انبساط و سرور کے ساتھ ساتھ غم بھی دنیوی زندگی کا جزو لا ینفک ہے۔ اسلامی معاشرہ میں دُکھ درد بھی ہوگا، قحط، بیماری اور موت بھی ہوگی، لیکن قنوطیت اور زندگی سے بیزاری نہ ہوگی۔ خودکشی کے واقعات اس معاشرہ کے لیے بالکل بے گانہ ہوں گے۔ ہر شخص زندگی کے مفہوم اور مقصد سے آگاہ ہوگا اور کسی ریب و تشکک میں مبتلا نہ ہوگا۔



(۳)

اسلام — میدانِ عمل میں



10A

## علماء کون ہیں؟

آج کل سبھی مسلمان ممالک میں ایک مخصوص گروہ علماء کے خلاف ناپاک پراگندہ سے میں مصروف ہے۔ یہ لوگ بڑے پُر فریب انداز میں عالم اسلام کے علماء کا مقابلہ قرونِ وسطیٰ کی یورپی مسیحی دنیا کے پادریوں سے کرتے ہیں، اور عاتقہ المسلمین کو متنفذ کرنے کے لیے ان کی بڑی بھیانک تصویر کھینچتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ علماء عیش و عشرت کی زندگی گزارتے اور اپنے عقیدت مندوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو معاند فرقوں میں بانٹ رکھا ہے جو سب کے سب باہمی سر پھٹول اور جنگ و جدل میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ عالم اسلام، اپنی ساری تاریخی میں جن مفاسد سے دوچار رہا ہے ان کی ذمہ داری علماء پر عاید ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہم مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے دین کی تعبیر و تشریح کا حق و اختیار علماء کو دے رکھا ہے۔ اس سارے اربعہ مسئلہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ اسلام کی ان تمام تعبیرات کو مسترد کر دیں جو یہ ادعا پسند علماء پیش کرتے ہیں، ان ملاؤں سے چٹکارا پائیں اور اسلام کا ایک بالکل جدید قالب خود تیار کریں۔

علماء کون ہیں؟ کیا وہ پروہت ہیں؟ کیا وہ ایک موروثی حکمران ذات ہے جس میں غیر ذات

لا کوئی آدمی شامل نہیں ہو سکتا؛ ان سب باتوں کا جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔ ہر وہ مسلمان جو عربی زبان، قرآن، حدیث اور اسلامی فقہ کا ناگزیر مطلوبہ علم حاصل کر لیتا ہے عالم کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے، لیکن آج ہم ایک بے حد الم ناک صورت حال سے دوچار ہیں۔ ایک گروہ جو خالص انگریزی تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے، جس کی ایک بڑی تعداد نے مسیحی مشنریوں کے جاری کردہ سکولوں اور کالجوں میں پڑھا ہے، جو نہ صرف اسلامی تعلیم کی تحصیل اور اس کی اہمیت کا منکر ہے بلکہ جس کا قلب اس کے لیے اپنے دامن میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا، وہ مُصر ہے کہ اسے اسلام اور اس کے قوانین کی از سر نو تعبیر کا حق حاصل ہے۔ اُن لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ اسلام ملاؤں کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت بودا استدلال ہے۔ اگر کسی کام کے لیے علمی جہارت اور تربیت درکار ہے تو اسے ضروری شرائط پر پورا اُترنے والے لوگوں کے سوا اور کون بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے؟ پھر جو لوگ شریعت سے بالکل بے بہرہ ہیں انہیں اجتہاد کی اہلیت کا سزاوار کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہمیں اپنی ساری تاریخ میں علماء عیش و عشرت اور راحت و طمانیت کی زندگی سے دور، بڑے صبر و استقامت کے ساتھ انتہائی ناقابلِ برداشت آلام و شدائد کا سامنا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو تعذیب و اذیت کس نے دی؟ مسیحیوں، یہودیوں یا ہنود نے نہیں، ہمارے اپنے حکمرانوں نے، جن کے نام مسلمانوں کے سہتے، جو نہیں چاہتے تھے کہ اسلام مملکت کے معاملات میں حصہ دار ہو۔ ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور ابن حنبلؒ ایسے جلیل القدر ائمہ کو انتہائی ظلم و تشدد کیوں پہنچا پڑا؟ اس لیے کہ انہوں نے معتزلہ کے مبتدعانہ افکار کی توثیق سے انکار کر دیا تھا جو اس زمانے کے حکمران طبقے میں بے حد مقبول تھے۔ امام احمد کو کوڑوں کی ایسی سخت مار کیوں ماری گئی کہ اگر ہاتھیوں پر بھی پڑتی تو وہ چلا اُٹھتے۔ امام ابن تیمیہؒ کا جرم کیا تھا کہ انہیں بار بار قید و بند میں ڈالا گیا حتیٰ کہ وہ قید ہی کی حالت میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو جہانگیر نے گواہیار کے قلعے میں کیوں قید کیا؟ کیا اس لیے نہیں کہ انہوں نے بادشاہ کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

آج طاقت کس کے ہاتھ میں ہے؟ علماء کے ہاتھ میں یقیناً نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو علماء جدید زندگی کے غیر اسلامی معمولات کی علانیہ مذمت کرتے ہیں، جو لادینیت، مادہ پرستی اور الحاد کی راہ میں مزاحم ہیں اور جو احیائے اسلام کی جدوجہد کرنے والی تحریکوں کے حامی ہیں، وہ تقریباً ہر مسلمان ملک میں دار و گیر کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس تعذیب و اذیت اور جبر و تشدد کا سبب اس کے سوا اور کیا ہے کہ انہوں نے بدعات و منکرات کے مقابلے میں نہایت صبر و ثبات اور جرات کے ساتھ دین کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ ملا کی مذہبی آمریت کہاں ہے؟ اگر علماء مسلمانوں کو آزادی کے ثمرات سے محروم کرنے اور روشن خیالی اور ترقی کی راہ سے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں تو وہ اس سارے ظلم و جور کا تختہ مشق بننے پر کیوں مجبور ہیں؟

عامة المسلمین کے دل میں ان علماء کے لیے عزت و احترام کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ نہ تو محض ایک امر اتفاقی ہے اور نہ نری قدامت پسندی یا تقلید کا شاخسانہ۔ انہیں مسلمان معاشرہ میں جو عظمت و وقعت ہے وہ کسی مادی طاقت کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ انہیں یہ مقام عظیم مجرد ان کے کمال علم و فضل، بصیرت، کردار، ورع و تقویٰ اور اسلام کی راہ میں جدوجہد، قربانیوں اور مصائب و شدائد کی بدولت ملا ہے۔ ان کی زندگی اور کام بجائے خود اس بات کا یقین پرور ثبوت ہے کہ انہوں نے شریعت کے صحیح معانی و مطالب معلوم کرنے میں ہر ممکن انسانی کوشش کی ہے اور ان کی پیش کردہ تعبیر پر کامل اعتقاد اور دیانت داری کے ساتھ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ علماء پر تہمت طرازی کرتے ہیں اور ان کی تعبیرات کو "ادعائی فاضل اصحاب" کی رائے قرار دے کر مسترد کرتے ہیں، وہ گویا بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہل بیت، صحابہ کرام، بخاری، مسلم، ابو حنیفہ، شافعی، مالک، ابن حنبل، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ ایسے سب "ادعائی فاضل اصحاب" نے اسلام کی غلط تعبیر کی تھی اور چودہ سو برس کے بعد آج مغرب کے تہذیبی استعمار کے سامنے میں پلنے اور پروان چڑھنے والے ان تجمہ و پسندوں



کو اسلام کی صحیح تعبیر پیش کرنے کا ثروت حاصل ہوا ہے۔ یہ نئے اسلام کی تخلیق بلکہ قرآن و سنت کے اسلام کے بجائے لندن اور نیویارک کے مسیحی مشنریوں اور مستشرقین کے بتائے ہوئے جعلی دین کو رائج کرنے کے لیے کیسا عجیب استدلال اور پرفتن حیلہ ہے۔

---

## محمد بن عبد الوہاب کی تحریک

بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) کے آغاز میں دنیا سے اسلام کا دینی و اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس عہد کے مسلمان قرن اول کے مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ خود مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اس تفاوت پر متعجب تھے۔ امریکی مصنف لوتھرپ شادرٹ نے اس دور انحطاط کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے۔ امیر شکیب ارسلان کے الفاظ میں کوئی انتہائی مبتخر مسلمان عالم اور مفکر بھی ایسی واضح، صاف اور بلیغ تصویر نہیں کھینچ سکتا وہ کہتا ہے:-

”دیگر امور کی طرح مذہب بھی زوال پذیر تھا۔ تصوف اور طفلانہ ترہات کی

کثرت نے خالص اسلامی توحید کو مستور کر دیا تھا۔ مسجدیں سوئی اور ویران تھیں۔ جاہل عوام ان سے منہ موڑ چکے تھے اور تعویذ گنڈے اور مال میں پھنس کر غریب فقراء اور درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کو جاتے تھے۔ انہیں دلی اور بارگاہ ایزدی میں شفیع سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا گیا تھا بلکہ اُس کی خلافت ورزی بھی کی جاتی تھی۔ مقامات مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ بھی معصیت اور بد اعمالی کے قعر مذلت بن گئے تھے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر سے دنیا میں تشریف لاتے تو وہ اپنے متبعین

کے ارتداد اور بت پرستی پر سخت اظہارِ بیزاری فرماتے ہیں،

یہ تھے وہ حوصلہ شکن حالات جب ۱۷۰۳ء میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے۔ انکا خاندان ۱۷۸۶ء

اپنے علم اور ورع و تقویٰ کی بنا پر سارے نجد میں مشہور تھا۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی دماغی اور جسمانی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ چودہ پندرہ برس کے تھے کہ ان کا شمار عرب بھر کے ممتاز علماء میں ہونے لگا۔ ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر طالبانِ علم دور دور سے آنے لگے، لیکن ابھی وہ خود علم کے پیاسے تھے، چنانچہ وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ پہنچے اور پھر ایران میں اپنے عہد کے ممتاز اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا۔

پھر وطن واپس آئے اور دعوت و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ جلد ہی مرجع خلافت بن گئے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر علاقے کے حکمران سخت پریشان ہوئے۔ انہیں اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا، چنانچہ ان کے علاقے کے امیر نے مقامی گورنر کو ایک پیغام میں اس خطرہ کی خبر دیتے ہوئے کہا:

”..... شیخ محمد بن عبدالوہاب نے میری مرضی کے خلاف عمل کیا ہے،

اس لیے انہیں فوراً قتل کر دیں ورنہ ہم آپ کو خراج دینا بند کر دیں گے.....“

شیخ نے سنا تو پوری بے غمی کے ساتھ اپنی دعوت کا اعلان کیا:

”میرا موقف لا الہ الا اللہ ہے۔ میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنانے،

نیک کام کرنے اور بُرے کاموں سے باز رہنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اس

دعوت کو قبول کر دو گے اور اس پر ثابت قدم رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے دشمنوں

پر غلبہ عطا کرے گا۔“

لیکن مقامی گورنر نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور شیخ کو ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا،

چنانچہ شیخ ملک چھوڑنے اور بھٹی کی طرح قیمتی ہوتی ریت پر برہنہ پاسفر کرنے پر مجبور ہو گئے۔  
 شیخ ایک مدت تک سرگرداں رہے۔ اسی دوران میں درعیہ کا امیر محمد بن سعود دعوت سے متاثر  
 ہوا، اُس نے شیخ کو سرانگھوں پر بٹھایا اور عہد کیا کہ وہ اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے  
 ان کے ساتھ تعاون کرے گا۔ محمد بن عبدالوہاب محض اسلام کی تبلیغ و تلقین ہی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ  
 ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے جس میں اسلام کی خالص، نکھری ہوتی پاکیزہ تعلیمات  
 کو زندگی کے عملی دستور کی صورت میں نافذ کیا جاسکے۔ محمد ابن سعود کی حکومت کے زیر سایہ لوگوں کا  
 طرز زندگی، عقائد اور کردار یکسر بدل گیا۔ قبل ازیں اکثر لوگ برائے نام مسلمان تھے بگمہ شہادت کے  
 سوا کچھ نہ جانتے تھے اور وہ بھی غلط سبط۔ اب ہر شخص سے باجماعت نماز پڑھنے، روزے  
 رکھنے اور زکوٰۃ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ تبا کو نوشی، ریشم اور عشرت پرستانہ زندگی کے نشانات  
 محو اور تمام غیر اسلامی ٹیکس منسوخ کر دیئے گئے۔ کئی صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ ملک میں امن و امان  
 کا ایسا دور دورہ ہوا کہ بدو چوری چکاری اور لوٹ مار کے خوف و اندیشہ سے آزاد رات کو چین  
 کی نیند سونے لگے۔ ایک سیاہ فام غلام بھی انتہائی طاقت ور قبیلے کے سردار کے سامنے اپنی شکایات  
 پیش کرتا اور اس کی بد اعمالیوں کا مواخذہ کرتا تھا۔ فرقہ وارانہ اویش ختم ہو گئی، کیونکہ تمام مکاتب  
 فکر کے علماء مساجد میں باری باری نماز پڑھاتے تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب بلند پایہ مجدد اور امام احمد ابن حنبل اور امام ابن تیمیہ کے صحیح  
 معنوں میں جانشین تھے۔ اپنے پیروؤں کی طرح انہوں نے معتزلہ کے استدلالی ہیو لازم کو مسترد  
 کر دیا۔ قرآن کریم اور خالص سنت رسول کو اپنانے اور ان کے سیدھے سادے ظاہری معانی کے  
 مطابق ان کی بے چوں و چرا اطاعت پر زور دیا۔ قرآن مجید کی مقصودانہ تفاسیر اور شروح پر دیدہ و بینی  
 کے بجائے سیدھے سادے متن کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی۔ اُن کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا کہ چونکہ  
 تفاسیر اور حواشی انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے بے خطا نہیں ہو سکتے۔ ان کا  
 مرقف یہ تھا کہ اگر قرآن مجید کو مختلف تفسیروں کے ساتھ غلط ملط کر دیا گیا تو کلام پاک کی صاف



مستحری تعلیم تک رسائی مسلمانوں کے لیے ناممکن ہو جائے گی اور وہ اپنے آپ کو اسی ناگوار صورت حال سے دوچار پائیں گے جس میں ان سے پہلے یہودی اور عیسائی مبتلا ہو چکے ہیں۔ شرعی مسائل میں شیخ محمد بن عبد الوہاب حنبلی مسلک کے پابند تھے، تاہم وہ امام ابن حنبل کے اندھے مقلد نہ تھے۔ اپنی کتابوں میں انہوں نے بالصراحت کہا کہ جو مسلمان دیگر تین ائمہ کے فقہی مسلک سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں، انہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اللہ نے انہیں بے خطا و روشن و واضح بصیرت عطا کی تھی۔ اس خدا داد بصیرت کے ذریعے انہوں نے ہم عصر مسلمانوں کے بدترین روگ کی تشخیص کی، اور وہ تھا تصوف سے مرصیانہ دلی لگاؤ۔ یہ بات یقینی ہے کہ شیخ تصوف کے مخالف نہ تھے۔ ایران کے زمانہ قیام میں انہوں نے صوفیاء کی متعدد شاخوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا تھا، لیکن عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان پر آشکارا ہو گیا کہ تصوف کے مفاسد اتنے گہرے اور عام ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کو اس سے بچانا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ جس طرح پانی ایسی صاف اور حلال شے بھی اگر مریض کے لیے مضر ہو تو ڈاکٹر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں، اسی طرح تصوف کا مسلک اگرچہ اصولاً جائز ہے، تاہم حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مسترد کر کے بلائے طاق رکھ دیا جائے۔ ”بے سجادہ رنگیں گن گرت پیرمناں گوید“ کی ذہنیت روحانی مرشد اور اربابِ مَعْنٰی اللہ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتی۔ شیخ خوب جانتے تھے کہ ان کے زمانے کے مسلمان افیون کی طرح تصوف کے عادی ہو چکے ہیں، جس نے انہیں اٹنا غفیل اور جوش و جذبہ اور زندگی سے محروم کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے مسلکِ تصوف کی ان تمام کج رویوں کے خلاف جدوجہد کی جو اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید سے متصادم تھیں۔ اولیاء پرستی، تصویری شیخ، قبر پرستی اور بدعات و منکرات کے خلاف زبردست جنگ لڑی۔ اس زمانے میں سنتِ رسولی کے صریح خلاف قبروں پر مسجدیں اور مقبرے تعمیر کرنے کا رواج عام تھا، شیخ نے اُس کی بالخصوص مذمت کی۔ انہیں قبروں کی زیارت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ شریعت نے اُس کی اجازت دی ہے، اس سے انسان کو اپنی موت اور آخرت یاد آتی ہے، تاہم وہ بزرگوں

کی پریشانی اور اہل قبور سے استعانت اور انہیں اللہ کے حضور اپنا شفیع و کار ساز قرار دینے کے سخت مخالف تھے۔

مختلف گوشوں سے شیخ کی شدید مخالفت ہوئی۔ یہ ایک فطری امر تھا۔ ان کے دشمنوں نے عاتر المسلمین کو یقین دلایا کہ شیخ ایک نئے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے شیخ پر گونا گوں الزامات عائد کیے، وہ ایک نیا فرقہ بنا رہے ہیں، جو لوگ ان کی سیادت تسلیم نہیں کرتے انہیں کافر قرار دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان الزامات میں رتی بھر بھی صداقت نہ تھی، لیکن شیخ کے دشمن اپنے عقیدت مندوں کو اس جھوٹ کے باور کرانے اور شیخ کی دعوت دینی پر لبیک کہنے والوں کو دہابی کا نفرت انگیز لقب دینے میں کامیاب ہو گئے۔

امیر عبدالعزیز کے انتقال پر اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ بد قسمتی سے وہ تدبیر اور حکمت عملی دونوں سے عاری تھا۔ اُس نے شیخ کے متبعین کو ترکوں کی حکومت سے بھڑا دیا۔ وہ عقل و دانش سے کام لیتا تو مسلمانوں کے مابین اس غیر ضروری خون ریزی کو مال سکتا تھا، لیکن اُس کے پیروکار مکمل سیاسی اقتدار کے طلب گار تھے اس لیے انہوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس تصادم ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی کسی ترک کے آگے دہابی تحریک کا ذکر کرنا اُس کی نفرت کو ابھارنے کے لیے کافی ہے۔

اس مہلک غلطی کے نتیجے میں مصر کا ابانوی حکمران محمد علی دہابی تحریک کا نام و نشان مٹا دینے کے ارادے سے عرب پر چڑھ دوڑا۔ ۱۸۱۳ء میں طائف کے قریب زبردست جنگ کے بعد دہابیوں کو شکست فاش ہوئی۔ پانچ ہزار سے زائد مارے گئے۔ طائف کے گلی کوچے لاشوں سے پٹ گئے۔ پھر ظلم و تشدد کا بازار گرم ہوا۔ تمام مشہور و معروف دہابی گروہ درگروہ گرفتار کر لیے گئے اور بر سرِ عام ان کی گردن مار دی گئی۔ ان کی لاشوں پر گتے چھوڑ دیے گئے۔ فاتحین جس شہر میں بھی پہنچے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کھجور کے باغات تباہ کر دیے،

مریشی مارڈالے، مکانات کو آگ لگا دی، بوڑھی، بیمار عورتوں اور بچوں کو بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا۔ برطانوی حکومت تحریک اچلتے اسلام کو ابھرتے اور طاقت پکڑتے دیکھ کر سخت مضطرب تھی۔ اُسے جب محمد علی اور اُس کے بیٹے ابراہیم کے "کارنامے" کی خبر ملی تو اُس کے ہاں گھی کے چراغ جلنے لگے۔ اُس نے ہندوستان سے کیپٹن جارج فارسٹر سیدلیر کی قیادت میں ایک وفد مبارک باد دینے کے لیے بھیجا۔ ۱۹۰۰ء میں بدنام زمانہ مسیحی مشنری سیموئل زویر نے لکھا:

"یہ وہابی تحریک رسوا کن انجام سے دوچار ہو گئی اور سیاست کے میدان

میں محض ایک سنٹ ثابت ہوئی۔ اب عرب میں سعودیوں کی طاقت کو قطعاً ماضی سمجھنا چاہیے....."

تاہم یہ یاس انگریز پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں۔ پچیس برس بھی نہ گزرے تھے کہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے محض اپنی سعی و جہد کے بل پر جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔ ابتدا میں نہ صرف اس کے زیر سایہ بسنے والے عربوں کی، بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ اچلتے اسلام کا پرچم لے کر اُٹھے گا، چنانچہ وہ بڑی بے چینی سے اُس روز سعید کا انتظار کرنے لگے، لیکن جب اُس نے ملوکیت کے قیام کا اعلان کیا تو اُن کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب یہ صاف عیاں ہو گیا کہ شاہ سعود نے وہابی تحریک کے مذہبی جوش و خروش کو محض حصول اقتدار کی خاطر بطور حربہ استعمال کیا تھا۔ اس المیہ پر محمد اسد لکھتے ہیں:-

"ابن سعود زندگی بھر اسلام کا ذکر والہانہ انداز میں ایک مہم کی حیثیت سے کرتا رہا ہے، جو اُسے تفویض کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آگے چل کر بھی جب کہ ایک عرصہ پہلے یہ واضح ہو چکا تھا کہ اُس کے نزدیک شاہانہ اقتدار ایک نظریہ کی علمبرداری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہ اپنی غیر معمولی خطابت کے زور سے اکثر لوگوں کو — اور غالباً اپنے آپ کو بھی — یقین دلاتا کہ یہ نظریہ اب بھی







دینے سے انکار کر کے نقصان وہ مغربی اثرات پر اپنی مملکت کے دروازے بند رکھ سکتا ہے یا کم از کم ان اثرات کے نفوذ کی راہ میں کئی عشرون ملک کے لیے مزاحم ہو سکتا ہے۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ دولت کی حرم و آرنے اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کو مکمل طور پر غرقاب کر دیا۔

”دہائی دور کا سخت مناظرہ نظریہ فی الواقع اُس روز ختم ہو گیا جب امریکیوں نے

تجارتی مقدار میں تیل دریافت کیا۔ ۱۹۱۲ء سے تقریباً تیس برس تک کی پوری زندگی اور

اُس کی سرگرمیاں صحیح معنی میں مذہبی قوانین کی پابند تھیں۔ نماز کے وقت تمام کاروبار بند

ہو جاتا۔ دارالحکومت کے دروازے آمد و رفت کے لیے بند کر دیے جاتے اور پوری

مرد آبادی مسجد کی راہ لیتی۔ آج وہ سب تبدیل ہو چکا ہے۔ عرب کی معاشرتی زندگی پر

تیل کا دہرا اثر ہوا ہے۔ اول اس سے حاصل ہونے والی دولت نے شہزادوں اور

ملک کے خوش حال شہریوں میں آرام اور مغربی خطوط پر ترقی کی خواہش پیدا کر دی

ہے۔ وہ غیر ملکیوں کی سیاحت، غیر ملکی لباس اور ہر قسم کے تعیشات کے خواہگر ہو

چکے ہیں۔ دوم تیل پڑوسی ملک کے تارکین وطن کی اتنی بھاری تعداد کو اپنی جانب

کھینچ رہا ہے کہ قصباتی اور شہری آبادی کا کردار یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ ان لوگوں

میں سرکاری ملازم بھی ہیں اور روزی کی تلاش کرنے والے مزدور بھی۔ سوداگر بھی ہیں

اور سہل الحصول منفعات کی توقع رکھنے والے دکاندار اور تعمیری مواقع سے جھولییاں

بھرنے اور کارخانوں کو ترقی دینے والے صنعت کار بھی۔ سب سے بڑھ کر استاذ

اور فنی ماہرین ہیں جو نوخیز نسل کو مغربیت کے رنگ میں رنگنے کے لیے اپنے

قوی اثر و رسوخ سے کام لے رہے ہیں۔ یہ سب لوگ مغربی لباس پہنتے ہیں

اور زندگی کے طور اظہار میں مغربیوں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں۔ وہ دن زیادہ

گور نہیں ہے جب مغربی رنگ میں رنگنے کا عمل سعودی عرب میں اسی طرح

عام ہو جائے گا جس طرح اس کے پڑوسی ملکوں میں ہو چکا ہے۔“  
 (اگرچہ وہابی تحریک خالص سیاسی معنی میں جزیرہ نما سے عرب تک محدود تھی تاہم روحانی طور سے اس کے قوی اثرات عالم اسلام کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اپنی رُو میں بہا لے گئے۔ اس تحریک کی قابل تقلید مثال سے سنوسی تحریک، الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کو حرکت ملی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ بلکہ اس کی بقا کا دار و مدار محمد بن عبد الوہابؒ ایسے مجددین کی روحانی اولاد ہی پر ہے۔)

---

“Riyadh Ancient and Modern”, Harry St. John  
 Bridger Philby, *The Middle East Journal*, Washington,  
 D.C., Spring 1959.



## سنوسی تحریک

سنوسی تحریک کی داستان دورِ حاضر کی اسلامی تاریخ کا نہایت اندوہناک المیہ ہے۔ المیہ اس لیے کہ یہ تحریک جن نظریات کی علمبردار تھی اگر وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے تو اس کا نتیجہ سارے عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں روحانی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں نکلتا چونکہ لیبیا ۱۹۵۲ء میں اپنی سیاسی حاکمیت بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے، اس لیے عرب قوم پرست یورپی سامراج کے خدشات سنوسیوں کی جدوجہد کو اپنی انگلیوں اور نظریات کا ہم آہنگ قرار دینے لگے ہیں۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط بیانی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سنوسیوں کا سارا جہاد اسلام کی خاطر تھا۔ لادینی قوم پرستانہ نعرے جو آج عالم عرب میں عام ہو چکے ہیں، ان لوگوں کے لیے بالکل مہل اور نفوذ تھے۔

سنوسی جن اغراض و مقاصد پر ایمان رکھتے تھے اور جن کی خاطر انہوں نے جنگ کی، وہ قوم پرستوں کے اغراض و مقاصد کے بالکل برعکس تھے۔ قوم پرستوں نے انتہائی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے سنوسی رہنماؤں کا نام اپنے اغراض و مقاصد کے ساتھ منتقل کر دیا۔ سنوسیوں کے دل میں جدید تہذیب سے نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ آخر وقت تک اسلامی نظریات اور مادہ پرستانہ فلسفے کے درمیان مصالحت سے انکار کرتے رہے۔

ایک بار لیبیا کے موجودہ بادشاہ سید محمد الاولیس سے پوچھا گیا کہ وہ خود اودان کے پیرو کار جدید



تہذیب و ثقافت کے مخالف کیوں ہیں تو انہوں نے جواب دیا،

”سنوسیوں کا مطلق نظر صرف تقویٰ اور شرافت نفس کا حصول ہے۔ یہ مقصد

کس طرح پورا ہو سکے گا؟ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ہم اپنے خیالات سے خارج کر دیا  
میانہ روی اختیار کریں اور ان تمام لذتوں سے مجتنب رہیں جو تقرب الہی کے حصول  
میں حاسر ہوتی ہیں۔“

”پھر اطالوی سنوسیوں کے خلاف اقدامات کیوں کرتے ہیں؟“

”اس لیے کہ جو شخص ہماری تعلیم کو اپناتا ہے وہ جسمانی اور روحانی لحاظ سے

صحت مند ہو جاتا ہے۔ اطالوی فاشسٹ عالم اسلام کے بہت سے دوسرے ملکوں  
کی طرح، ہماری پوری آبادی کو بگاڑنے کے درپے ہیں۔ اطالوی تہذیب اسی صورت  
میں زیادہ تیز رفتاری سے پیش قدمی کر سکتی ہے، لیکن جب تک ہماری تعلیم دلوں پر  
حکمران ہے ایسا نہیں ہوگا۔“  
”کیوں نہ ہوگا؟“

”ہماری تعلیم بالکل سادہ ہے۔ ضروری ہے کہ جسم کو صحت مند اور پرہیزگار

زندگی سے تقویت دی جائے تاکہ وہ روح کے لیے نمایاں شان اور عمدہ مسکن بن  
سکے۔ آپ کوئی نشہ آور شے حتیٰ کہ تباہ کن نمک استعمال نہیں کر سکتے۔ لازم ہے کہ خدا کے  
سوا آپ کسی کے غلام نہ ہوں۔ گویا حالات آپ کے تصرف میں ہونے چاہئیں۔ اطالوی  
جس تہذیب کو سیرینیکا میں رائج کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں حالات کا غلام بنا دیتی ہے  
اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے خلاف جنگ کریں۔“

”یہ تہذیب ہمیں حالات کا غلام کیونکر بناتی ہے؟“

”وہ مادی صنعتی ترقی ہی کو سب کچھ گردانتی ہے۔ خارجی شان و شوکت اور

قوت و اقتدار کسی شخص یا قوم کی قوت فیصلہ میں فیصلہ کن عنصر بن جاتا ہے۔ میں صرف

اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جہاں سنوسی حکمران ہیں وہاں امن امان اور اطمینان و آسودہ خاطری کا دور دورہ ہے۔۔۔۔۔“

(سید محمد الاوریس کے جدِ امجد سید محمد ابن علی السنوسی الجزائر میں مستغانم کے قریب ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سال وہابی تحریک کے مؤسس نے عرب میں وفات پائی۔ سید محمد ابھی دو برس کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ وہ ایک علمی اور خدا پرست خاندان میں پروان چڑھے۔ ان کی پہلی معلمہ اُن کی پھوپھی سیدہ فاطمہ تھیں۔ سیدہ فاطمہ نہایت ذکی و فہیم اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کے زیرِ ہدایت کم سن سنوسی نے قرآن کریم بہت چھوٹی عمر ہی میں حفظ کر لیا۔ پھر دینیات اور فقہ کی تعلیم اپنے علاقے کے بہترین اساتذہ سے حاصل کی۔ جوان ہوتے تو مراکش چلے گئے۔ وہاں پہلے ضروری استعداد ہم پہنچائی اور پھر مشہور یونیورسٹی جامعہ تیروین میں داخل ہو گئے، جہاں نامی گرامی اساتذہ سے قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی ان کے علم و فضل نے سلطانِ مراکش مولائی سیبان کی نگاہِ توجہ ان کی جانب منعطف کرادی۔ سلطان نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کرنا چاہا، لیکن سید السنوسی نے جو کسی دنیوی اقتدار کے اُگے جھکنے کے تصور ہی سے نفرت کرتے تھے، اس پیش کش کو رد کر دیا۔ لہذا انہوں نے مراکش کو خیر باد کہا اور جہاں گشتِ علماء کی صف میں شامل ہو گئے۔ پہلے تونس گئے۔ پھر لیبیا اور مصر۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے ہر جگہ اپنی علمی تشنگی بجھائی، مگر اُن کی پیاس تھی کہ روز بروز فزوں تر ہوتی جاتی تھی۔ جہاں کہیں جاتے طالبانِ علم جو حق درجوق ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ ان کے زبردست علم و فضل کا شہرہ دیس دیس پھیل چکا تھا اور ان کا شمار ممتاز ترین علماء میں ہونے لگا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مصر میں طویل

۱۷ Sanusiya :

*The Study of a Revivalist Movement in Islam, Nicola A. Ziadeh, E. J. Brill, Leiden, pp. 132-3.*

مدت تک رہیں گے اور قاہرہ کی جامعہ الازہر میں اپنی تعلیم جاری رکھیں گے، لیکن ان کے سب ارادے خاک میں مل گئے۔ علامتے ازہر نے ان کا استقبال معاذانہ جذبات سے کیا۔ انہیں اس نئی طاقت و شخصیت کے ہاتھوں اپنا وقار اور اثر و رسوخ خطرے میں نظر آیا۔ وہ مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ السنوسی کو علماء کے اس مکارانہ طرزِ عمل نے ان سے متنفر کر دیا۔ یہ مکار لوگ اپنے آپ کو راسخ الاعتقاد اور ورع و تقویٰ کا پیکر ظاہر کرتے تھے اور حال یہ تھا کہ بد عنوان اور عیاش حکمران طبقے کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ سید السنوسی کو محمد علی سے خاص طور پر از حد نفرت تھی۔ وہ اس کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی علانیہ مذمت کرتے تھے۔ آخر قاہرہ کے احوال سے متنفر ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ یہاں انہیں وہ چیز ملی گئی جس کی جستجو تھی۔ موسم حج میں ان کی ملاقات مراکش کے سید احمد ابن ادیس الفاسی سے ہوئی۔ سید احمد شہرہ آفاق مدحانی پیشوا تھے۔ وہ تصوف کے سلسلہ خضریہ کے شیخ تھے۔ سید السنوسی نے بلا توقف ان کی بیعت کر لی اور انتہائی غمخس و صادق مرید بن گئے۔ یہاں ہی علماء اُن کی زبردست شخصیت کو برداشت نہ کر سکے، چنانچہ پروردگار دونوں کو چھوڑ کر بین چلے گئے۔ چند سال بعد جب شیخ احمد ابن ادیس الفاسی کا انتقال ہو گیا تو سید السنوسی مکہ واپس آگئے۔ ۱۸۳۷ء میں انہوں نے پہلا زاویہ قائم کیا یہ گویا اُس تحریک کا آغاز تھا جو بعد ازاں سنوسی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

سنوسی تحریک کا مقصد خالص کتاب و سنت کی اساس پر عالم اسلام کا مکمل دینی احیاء تھا۔ اپنے اس کام میں السنوسی زیادہ تر امام احمد ابن حنبل، امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ اغلباً عرب کے مجدد و مجددین عبد الوہاب کی قائم کردہ نظیر ہی اُن کے سامنے تھی۔ اگرچہ دونوں مجدد یکساں مقاصد، انگلیں اور نظریات رکھتے تھے تاہم تصوف کے بارے میں سنوسی تحریک کا رویہ وہابی تحریک سے بالکل مختلف اور زیادہ مودبانہ تھا، البتہ وہ تصوف کی مناسب حد تک حوصلہ افزائی کے باوجود بعض سلسلہ ہائے تصوف کے برعکس سماع اور وجد وغیرہ کو کسی بھی دوسرے خلاف شریعت عمل کی طرح سخت ممنوع قرار دیتے تھے۔



استنوسی جہاں بھی گئے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ آخر دُور دراز ممالک کی سیاحت کے بعد انہوں نے سیرینیکا کو اپنی دعوت کا میدان بنانے کا فیصلہ کیا، تاہم جو زاویے عرب اور شمالی افریقہ کے دوسرے حصوں میں قائم کر چکے تھے انہیں کسی فراموش نہ کیا۔ جب اُن کے وطن الجزائر پر فرانسیسی قابض ہو گئے اور تونس بھی اسی حشر سے دوچار ہوتا نظر آیا، نیز دیکھا کہ عثمانی حکام تحریک کی کامیابی سے خار کھانے لگے ہیں تو استنوسی نے اپنی دعوت کا مرکز صحرا میں کسی ایسے انتہائی دُور افتادہ علاقے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا، جہاں وہ الگ تھلگ رہ کر اپنی دعوت کو بے روک ٹوک جاری رکھ سکیں؛ چنانچہ ۱۸۵۳ء میں انہوں نے ایک اُجاڑے نخلستان جغیبہ کو اس مقصد کے لیے منتخب کر لیا۔ ایک بڑا زاویہ تعمیر کرنے کے لیے عمارتی ساز و سامان قافلے کے ذریعے بھیجا۔ اپنے مضبوط کردار کی بدولت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان — اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں امن و امان قائم کرو — سے تحریک پا کر وہ مقامی قبائل کی دیرینہ عداوتوں کو مٹانے اور بالآخر علاقے بھر کے خانہ بدوش قبائل کو مسلکِ اتحاد میں منسلک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جوں ہی اس علاقے میں امن و امان قائم ہوا، جو زمانہ دراز سے عنقا تھا، انہوں نے اپنی توجہ افریقہ کے دُور افتادہ گرم سیر خطوں میں اسلامی دعوت پھیلانے پر مرکوز کر دی۔ انہیں سب سے نمایاں کامیابی اُس وقت ہوئی جب قبیلہ زویانے استدعا کی کہ استنوسی ان کے ہاں تشریف لائیں، کفرہ میں زاویہ قائم کریں اور یہیں قبیلہ زویہ اپنی خون آشامی کی بدولت سارے صحرا میں ایک عذاب بنا ہوا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جو سیرینیکا اور حبیل شاد کے بیس ہزار مربع میل سے زائد رقبے میں پھیلے ہوئے نخلستانوں میں بود و باش رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے عہد کیا کہ وہ چوری چکاری اور قتل و غارت کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے۔ استنوسی نے اپنے معتد مرید کفرہ بھیج دیئے۔ ہزاروں قبائلی جو نسلوں سے محض برائے نام مسلمان چلے آتے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ایک زبردست روحانی انقلاب نے اُن کی زندگیوں کا رخ بدل دیا۔ ساتھ



ہی ساتھ منطقہ حارہ افریقہ کے بیشتر لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۱۸۵۹ء میں السنوسی کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے سید المہدی

جانشین ہوئے۔ سید المہدی اُس وقت صرف سولہ برس کے نوجوان تھے۔ وہ ۱۸۶۴ء

میں پیدا ہوئے۔ جنوب میں تعلیم حاصل کی۔ پدر بزرگوار کی وفات سے تقریباً ایک سال

پہلے کفر مہینے جو اب تحریک کامرکز بن چکا تھا۔ ابھی بارہ برس کے بھی نہ تھے کہ وہ اپنے والد

کی دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ قاصد بھیجتے۔ وفد کا استقبال کرتے اور طلبہ کو تعلیم دیتے،

سالانہ وہ اس وقت خود فاضل اور متقی اساتذہ سے تعلیم پا رہے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں

کی حالت سخت بایوس گن تھی۔ یورپی استعمار زبردست خطرہ بن چکا تھا، چنانچہ سید المہدی

ان کی اُمید بھری نگاہوں کامرکز بن گئے۔ یہ خیال عام تھا کہ وہی عدل و انصاف اور امن و

راستی کا دور پٹ کر لائیں گے۔ سید المہدی نے بار بار اور بڑے زور کے ساتھ اپنے ”مہدی“

ہونے سے انکار کیا۔ اپنے والد کی طرح انہیں بھی دعوتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہیں

صرف اسلامی دعوت کے لیے مسلسل جدوجہد اور بار آور کام سے دلچسپی تھی۔

سید المہدی کی قیادت میں سنوسی تحریک کی قوت اور اثر و نفوذ اپنے عروج پر

پہنچ گیا۔ سنوسی تعلیمات کا اہم ترین مطالبہ یہ تھا کہ اُس کے متبعین دیر پا اور ٹھوس کام کریں۔

سنوسی ابکیہ خود اکثر کہا کرتے تھے کہ درختوں اور ان کے پتوں میں بیش بہا دولت پنہاں ہے۔

اس فلسفے کی بدولت انتہائی بنجر اور ویران زمینیں وسیع پیمانے پر سرسبز باغات میں تبدیل ہو

گئیں۔ کاروبار اور تجارت ترقی کرنے لگی۔ گداگری اور کاہلانہ زندگی ناقابل برداشت بن گئی۔

”سنوسیہ: ایک تحریک احیائے اسلام کا مطالعہ“ کا مصنف ایک مثالی سنوسی زاویے

کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

”جنوب صحیح معنوں میں محض ایک قصبہ نہیں مذہبی اور تعلیمی مرکز ہے

کسی چھوٹے سے یونیورسٹی شہر میں جس امن سکون کا تصور کیا جاسکتا

ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے۔ صرف کالج کے اساتذہ عمامہ باندھتے ہیں۔ سفید ریش  
 شیخ سبز یا دیسی نیلے رنگ کے جاموں پر لمبی ڈھیلی ڈھالی عبا میں پہنتے ہیں۔  
 یہ ایک نہایت وسیع عمارت ہے۔ جس کی ضخیم اور بے دریچہ دیواریں، صحن خانوں،  
 غلام گردشوں، مدارس اور طلبہ کی اقامت گاہوں، سنوسی خاندان کے بڑے  
 بڑے مکانات اور مسجد کے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ جنہو ب ایک ڈھلوان چٹان پر  
 واقع ہے۔ بے شمار ٹیرھیاں نیچے کچھور کے درختوں اور ایک بڑے سے کنوئیں تک  
 جاتی ہیں۔ یہ واحد کنواں ہے جو پوری بستی کو پانی پہنچاتا ہے۔ سید المہدی کفرہ  
 منتقل ہوتے تو انہوں نے اپنے پچاس غلاموں کو آزاد کر دیا اور جن باغات کو یہ  
 غلام کبھی اپنے آقاؤں کے لیے تیار کیا کرتے تھے، انہیں صبر کر دیتے، چنانچہ اب  
 وادی کے ان نخلوں میں بھی آزاد کردہ غلام رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے باغات میں  
 بڑی عرق ریزی سے کام کرتے ہیں۔ باغات کو سیپنے کے لیے مصنوعی نالوں اور  
 تالابوں کا نہایت عمدہ نظام ہے۔ ان نالوں اور تالابوں میں پانی ایک چٹنے سے  
 آتا ہے جو زاویہ کے نیچے واقع ہے۔ یہ لوگ کچھور میں جیتے ہیں۔ اس آمدنی پر خود بھی  
 گزر بسر کرتے ہیں اور طلبہ کے لیے خوراک بھی فراہم کرتے ہیں۔ جنہو ب ایک  
 یونیورسٹی ہے۔ پاک صاف اور سادہ۔ ساری جماعت کی زندگی اس کے گرد مرکوز  
 ہے۔ اس کی لائبریری میں ۸ ہزار کتابیں ہیں اور صنفِ ادب کے علماء اور فضلا  
 کی ایک بڑی تعداد ہے جن کی موجودگی طلبہ کے لیے تحریک کا باعث ہوتی ہے۔  
 المہدی کے دور میں ان طلبہ کی تعداد تین سو تھی۔ مجوزہ نصابِ تعلیم میں قرآن کی تعلیم  
 تفاسیر کا گہرا مطالعہ، حدیث، فقہ، صرف و نحو، ادب، تاریخ اور منطق شامل ہے۔  
 تربیت کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ طلبہ میں حصولِ علم کی خواہش بے پایاں اور  
 خلوص سے معمور ہے۔ طلبہ کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی ہے۔ کوئی طالب علم

اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان حرفتوں میں بخاری، لہاری، معاری، کتابی، پارچہ بانی، جلد سازی اور چٹائی بنانا شامل ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہر سفتے جمعرات کا دن وقف ہے۔ سید المہدی بالعموم خود طلبہ کے ساتھ کام کرتے ہیں، یہ عملی مثال اُن کے لیے دلولہ انگیز ثابت ہوتی ہے۔ جمعہ کا دن فوجی تربیت اور جنگی مشقوں کے لیے وقف ہے۔ طلبہ گھڑ سواری اور شتر سواری سیکھتے ہیں۔ ان مشقوں کی نگرانی اکثر خود المہدی کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں طلبہ کے قیام و طعام کا محنت انتظام ہے۔ سنوسی رہنما اپنے طلبہ میں خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ جنوب یونیورسٹی میں طلبہ کو روزانہ ڈیڑھ روٹی ملتی ہے۔ ناشتے میں کھجوریں اور وہی ملتا ہے۔ دوپہر اور رات کا کھانا شوربے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہر طالب علم کو سال میں دو کُرتے، دو ٹوپیاں اور عملے، دو شلواریں، جوتوں کا ایک جوڑا اور چھ ماہ میں ایک عبا ملتی ہے۔ متمول گھرانوں کے طالب علم غریب طلبہ کو اکثر تحفے تحائف دیتے رہتے ہیں۔ تحریک کے مستقبل کے رہنما، زادیوں کے شیوخ، پُر جوش مبلغین اور جنگ جو سردار خود سنوسی اکیبر کی فرائی نگرانی میں تربیت پاتے ہیں۔ اس کام میں اُن کے ممتاز خلفاء بھی تعاون کرتے ہیں۔ ————— زادیہ دفاعی لحاظ سے خوب محفوظ ہے۔ تین ہزار آدمیوں کے اسلحہ کے علاوہ چار سو انفیلٹیں اور دو سو تلواریں بھی ہیں۔ یہ اسلحہ بیس کمروں میں رکھا ہوا ہے۔ المہدی کے اپنے پاس پچاس رائفلیں ہیں جن کی دیکھ بھال وہ خود کرتے ہیں۔ اسلحہ سازی کے فن میں باہر متعدد دکار گیر جنوب میں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنوسی دار الحکومت میں بارود تیار کرنے کا کارخانہ بھی ہے۔ مسجد کافی بڑی ہے جس میں بیک وقت پانچ چھ سو آدمی جمع ہونے لگتے ہیں، نہایت پرسکون، سفید اور با شکوہ۔ فرش پر سیاہ قالین بچھے ہیں یہ ساری مسجد میں واحد بیش قیمت چیز ہیں۔ بڑے بڑے مربع نما



سفید ستون قطار در قطار چھت کے بھاری بھرکم شہتیروں کو تھامے کھڑے ہیں۔  
 چھت بالکل سادہ ہے۔ منبر بھی نہایت سادہ اور نقش و نگار سے منزہ ہے۔  
 مسجد کی یہ سادگی اُس دین کے عین مطابق ہے جو عیش و عشرت کو ممنوع قرار دیتا  
 ہے۔ جنوب میں پُرشوق ادب و احترام کے سوا زائر کو متاثر کرنے والی اور کوئی  
 شے نہیں ہے۔ اس طرح سنوسی زاویے متعدد و فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ خدائی  
 رحمتوں کی بانیض ندی کی گزرگاہ ہونے کے علاوہ مدارس، تجارتی و معاشرتی مراکز،  
 قلعے، قانونی عدالتیں، بینک، گودام، محتاج خانے، عبادت گاہیں، ماسن اور  
 قبرستان ہیں۔

اگرچہ سید المہدی اور اُن سے پہلے اُن کے پدر بزرگوار نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا،  
 تاہم درحقیقت وہ ایک خود مختار ریاست کے فرماں روا تھے اور حکومت کے تمام کام انجام دیتے  
 تھے۔ اپنی طاقت کے زمانہ عروج میں سید المہدی ایک زبردست سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔  
 جو موجودہ لبیا، صحرائے مغربی مصر اور شمال مغربی سوڈان پر مشتمل تھی، جس کی سرحدیں منطقہ حارہ  
 افریقہ (tropical Africa) کے قلب تک پھیلی ہوئی جاتی تھیں، جہاں لاکھوں نو مسلم  
 اسلام کے سایہ رحمت میں داخل ہو رہے تھے۔ اپنی پیشرو دہائی تحریک کی طرح سنوسی  
 تحریک کے پیروں کی بھاری تعداد عرب کے بدوؤں کی تھی۔ سنوسی جب کبھی جع کرنے جاتے اس  
 موقع سے پُرانا تہذیب اٹھاتے۔ دنیا کے ہر حصے سے آنے والے زائرین بیت اللہ تک تحریک  
 احیائے اسلام کی دعوت پہنچاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنوسی تحریک ملایا، انڈونیشیا اور فلپائن ایسے دُور  
 افتادہ ممالک میں بھی معروف ہو گئی۔

۱۹۰۲ء میں مصیبت ٹوٹ پڑی۔ فرانس نے محسوس کیا کہ سنوسی تحریک کے بڑھتے ہوئے



اثرات اُس کے استعماری مفادات کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس نے وسطی افریقہ میں تحریک کو ختم کر دینے کے لیے وسیع پیمانے پر فوجی کارروائی شروع کر دی۔ اسی سال سید المہدی وفات پا گئے۔ سید المہدی کے صاحبزادے سید محمد الادیس اُس وقت صرف ۱۲ سال کے تھے اور نہایت کمٹھن نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، چنانچہ تحریک کی زمام قیادت ان کے عم زاد بھائی سید احمد الشریف نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سید احمد الشریف ۱۸۷۳ء میں جنوب میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے چچا کی ذاتی سرپرستی میں حاصل کی۔ نئے قائد کے سامنے پہلا فوری مسئلہ مغربی سامراج کے ساتھ زندگی اور موت کی کشمکش کا تھا۔ انتہائی جان نڈر جدوجہد کے بعد سنو سیوں کو ۱۹۱۹ء میں شکست ہو گئی۔ فرانس افرادی طاقت، غیر محدود ذرائع، جدید ترین ہتھیاروں اور سامان جنگ میں کہیں زیادہ طاقتور تھا، چنانچہ پورا وسطی افریقہ کا سیاسی اقتدار سنو سیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں سب سے بدتر مصیبت نے آیا۔ اٹلی نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور طرابلس اور بلغازی پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی افواج بھیج دیں۔ ترکی کا وزیر جنگ انور پاشا فوج لے کر میدان جنگ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ سید احمد الشریف بھی اپنے جنگجو قبائلیوں کو لے کر اس کے ساتھ آئے۔ اپنی اُن تھک توت عمل اور جوش و خروش کے ذریعے انور پاشا نے سنو سی قبائل کو مذہب کی خاطر آخر دم تک لڑنے پر آمادہ کر لیا جو دونوں کا مشترکہ مقصد تھا۔ عرب اور ترک رہنماؤں کے درمیان اس موثر تعاون کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اطالویوں کی جارحانہ یلغار روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر اچانک، کسی پیشگی انتباہ کے بغیر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی تمام نوآزاد ریاستوں نے پخت و پز کے بیک وقت ترکی پر ہتھ بول دیا۔ اب ترکی کا ملامٹ جانے کے خطرہ سے دوچار تھا۔ دشمن اُس کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اٹلی سے صلح کرنے، یسپا کو آزاد کر دینے اور اپنی افواج جلد سے جلد ترکی پہنچانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا، چنانچہ سنو سی جہاد جاری رکھنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

۱۹۱۷ء میں سید احمد الشریف نے سید محمد الادیس کو تحریک کی قیادت سونپی اور خود ترک

حکومت سے مؤثر امداد لینے کے لیے ایک اہدوز کے ذریعے استنبول پہنچے، لیکن وہاں انہیں سوائے ناکامی اور مایوسی کے اور کچھ نہ ملا۔ ترک حکومت خوفزدہ تھی کہ کہیں سید احمد الشریف خود عالم اسلام کا خلیفہ بن جانے کا اعلان نہ کر دیں۔ اس طرح ایک عرب خانوادہ عثمانی خلافت کا جانشین بن جائے گا۔ سید الشریف اگرچہ ایسے کوئی عزائم نہ رکھتے تھے، تاہم سیاسی ریشہ دوانیوں نے ان کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا۔ پہینے پر پہینے گزرتے چلے گئے۔ سید احمد کو جانے کی اجازت نہ ملی۔ ۱۹۱۸ء میں عثمانیوں کی شکست سے واپسی کی رہی سہی توقعات ہی جاتی رہیں، لیکن سید احمد نے مایوسی کے آگے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ اناطولیہ کے میدان طے کرتے ہوتے مصطفیٰ کمال آتارک سے جا ملے اور ترکی کو بربادی سے بچانے کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

محمد اسد لکھتے ہیں:-

”یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ابتداء میں وہ دینی جوش و جذبہ ہی تھا جس نے ان بھینٹک دنوں میں ترک قوم کو یونانیوں کی بے پناہ طاقت کیخلاف، جن کی پشت پر اتحادیوں کے بے پناہ وسائل تھے، رٹنے کی قوت بخشی۔ سید احمد نے ترکوں کی فوجی جدوجہد میں اپنے زبردست روحانی و اخلاقی اثر کو لگا دیا۔ اناطولیہ کے شہروں اور قصبات کا ان تھک و دورہ کیا۔ لوگوں کو ”غازی مصطفیٰ کمالی کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ سنوسی الکیبر کی مساعی اور ان کے نام کی غفلت نے اناطولیہ کے سیدھے سادھے کسانوں میں کمالی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بے پایاں کام کیا۔ ان لوگوں کے نزدیک قوم پرستانہ نعرے بے معنی تھے اور وہ پشت ہا پشت سے اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دینے کو عظیم سعادت سمجھتے تھے، لیکن جوں ہی غازی کو فتح نصیب ہوتی اس کے حقیقی عزائم آشکارا ہو گئے جو ترک عوام کی توقعات سے یکسر مختلف تھے۔ آتارک نے اپنے معاشرتی انقلاب کی اساس تجدید شدہ اسلام





تھے جو عملاً ایک وسیع قید خانے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دیکھ بھال کرنے والا جنگی طیارہ لاسلی کے ذریعے اپنی قریب ترین فوجی چوکی کو قبضہ آئی لشکر گاہ کی خبر دیتا۔ اطالوی فوج کے آنے تک وہ خود مشین گنوں کے ذریعے لوگوں کو منتشر ہونے سے روکے رکھتا۔ اتنے میں چند بکتر بند گاڑیاں پہنچ جاتیں جو اپنی زد میں آنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بلا امتیاز قتل کرتی ہوتی سیدھی خیموں میں گھس جاتیں۔ بچے کچے لوگوں اور موشیوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا اور ہانک کر شمال میں خاردار تاروں سے گھرے ہوئے وسیع و عریض اماطوں، اجتماعی کیمپوں میں پہنچا دیا جاتا، جو اطالویوں نے ساحل کے قریب قائم کر رکھے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر تک تقریباً ۸۰ ہزار بدوی اور لاکھوں موشی ہانک کر ایک ایسے علاقے میں جمع کیے جا چکے تھے، جہاں اس سے نصف تعداد کے لیے بھی کھانے پینے کا سامان نہ تھا۔ اس اثناء میں بھوک اور بیماری اندرون ملک میں بدوی آبادی کے بڑے حصے کو ہلاک کر رہی تھی۔

خود محمد اسد کو جن المناک واقعات کا تجربہ ہوا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

■ طلوع فجر سے پہلے ہم (اطالوی مقبوضہ علاقے کے عین قلب میں) عمر الغار کے اپنے گوریلادستے کے پڑاؤ پر پہنچے، جو اس وقت صرت دوسو سے کچھ اوپر مجاہدین پر مشتمل تھا۔ وہ ایک عمیق تنگ گھاٹی میں پناہ گزین تھا۔ معلق چٹانوں کے نیچے متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے الادردشت تھے۔ کچھ لوگ زمین پر پڑے سو رہے تھے۔ باقی صبح کاذب کے دھندلے سایوں میں کیمپ کے مختلف کاموں ہتھیار صاف کرنے، پانی لانے، کھانا پکانے اور درختوں کے ساتھ ادھر ادھر



بندھے ہوئے چند گھوڑوں کی خبر گیری کرنے میں مصروف تھے۔ تقریباً سب کے سب چھینٹروں میں ملبوس نظر آتے تھے۔ مجھے نہ تو اس وقت نہ بعد ازاں کوئی ایک شخص بھی صحیح سالم عیا یا چہنہ پہنے دکھائی دیا۔ بہت سے لوگوں نے پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ یہ گویا دشمن کے ساتھ تازہ وراثتوں کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ خلافتِ توقع مجھے کیمپ میں دو عورتیں بھی نظر آئیں۔ ایک خاتون بوڑھی تھی اور دوسری نوجوان تھی۔ وہ ایک الاؤ کے پاس بیٹھی تھیں اور ایک بھٹی پُرانی زمین کی سوتے سے مرمت کرنے میں منہمک تھیں۔ ہم جہاں کہیں جاتے ہیں یہ ہماری دو بہنیں ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ سیدی عمر نے میرے خاموش تعجب کے جواب میں کہا۔ ہم نے اپنی عورتوں اور بچوں کو مصر بھیج دیا ہے، مگر انہوں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔ ان کے گھر کے سارے مرد شہید ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ سیدی عمر نے بڑے افسردہ انداز میں ایک آدمی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ”یہ شخص آپ کو اپنی کہانی سنائے گا، یہ کل ہی میرے پاس پہنچا ہے۔“

”کفرہ سے آنے والا شخص میرے سامنے فرشِ خاک پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور بھٹی پُرانی عیا اپنے ارد گرد لپیٹ لی۔ وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ اُس کی آواز جذباتی ارتعاش سے یکسر خالی تھی، البتہ اُس کا وحشت زدہ چہرہ ان ہونٹوں کا منظر کا آئینہ دار تھا جو اُس نے دیکھے تھے۔“

انہوں نے تین اطراف سے ہم پر اچانک ہتھ بول دیا۔ ان کے ساتھ بہت سی بکتر بن گھاڑیاں اور بھاری توپیں تھیں۔ ان کے پیارے نیچے پرواز کر کے مکانوں، مسجدوں اور کھجور کے جھنڈوں پر بم باری کرنے لگے۔ ہم جنگ کے قابل صرف چند سو آدمی تھے۔ باقی سب عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ ہم نے ایک ایک گھر کے لیے

جنگ کی، لیکن وہ ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ طاقت ور تھے۔ بکتر بند گاڑیوں کے مقابلے میں ہماری رائفلیں بیکار تھیں؛ چنانچہ آخر کار وہ غالب آگئے۔ ہمسامہ دورے چند آدمی پنج نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں کچھوروں کے باغات میں چھپ گیا اور اطالوی مورچوں میں سے گزر کر نکل جانے کے موقع کا انتظار کرنے لگا۔ عورتوں کی چھپیں رات بھر سنائی دیتی رہیں۔ وحشی اطالوی اور ان کے بھاڑے کے ارٹیری ٹیٹوان کی عصمت درمی کر رہے تھے۔ اگلے روز ایک بوڑھی خاتون میری پناہ گاہ میں آئی اور روٹی اور پانی لا کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ اطالوی جرنیل نے زندہ پنج جانے والے سب لوگوں کو سید محمد المہدی کے مقبرے کے سامنے جمع کیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے قرآن مجید کو پارہ پارہ کر کے زمین پر پھینک دیا۔ پھر اُس پر کھڑا ہو گیا اور چلایا: تمہارا بد پیغمبر اگر تمہاری مدد کو پہنچ سکتا ہے تو اُسے بلا لو! پھر حکم دیا کہ نخلستان کاٹ دیئے جائیں، تمام کنوئیں تباہ کر دیئے، سید احمد کے کتب خانے کی تمام کتابیں نذرِ آتش کر دیں۔ اگلے روز اُس نے ہمارے بعض شیوخ اور علماء کو طیاروں میں سوار کر کے بلندی سے گرا دینے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ سب زمین پر گر کر شہید ہو گئے۔ دوسری رات بھی بے بس خواتین کی چھپیں اور فوجیوں کے تہمتوں اور گولیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ آخر کار میں رات کی تاریکی میں رینگ کر صحرا میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک آوارہ اونٹ ملی گیا جس پر سوار ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔

۱۹۳۲ء کے اواخر میں سندھی مزاحمت ختم ہو گئی اور اطالوی سارے لیبیا پر قابض ہو گئے۔ محمد اسد اس قصے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب میں نے مدینہ طیبہ کے چھوٹے سے سنوسی زاویہ کی دہلیز پر قدم رکھا موت اور مایوسی کی تدمم آوازیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ پھر سیرینیکا کی مہم کی یاد تازہ ہو جاتی رہی اور صرف درد باقی رہ گیا۔ ایک بار پھر میں سنوسی الکبیر کی خدمت میں حاضر تھا۔ میری نگاہیں اس سن رسیدہ مجاہد کی خوبصورت پیشانی پر تھیں جس پر غم و محن کے نقوش ثبت تھے۔ میں نے ایک بار پھر ان کا ہاتھ چوما۔ وہ ہاتھ جس نے زمانہ دراز تک تلوار تھامے رکھی تھی، اتنے عرصے تک کہ اب اس کی طاقت جواب دے گئی تھی۔“

”میرے بیٹے، اللہ تم پر برکت نازل کرے اور تمہاری راہ محفوظ کرے۔ ہماری پچھلی ملاقات کو سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اسی سال ہماری مقررہ مدت ختم ہو گئی، لیکن ساری حمد و ثنا اللہ کے لیے ہے اس کی مشیت جو چاہتی ہے وہی ہوتا ہے۔“

سید احمد پر یہ سال بلاشبہ نہایت بھاری گزرا تھا۔ ان کے منہ کے گرد لکیریں اور گہری ہو چکی تھیں اور ان کی آواز پہلے سے زیادہ پست تھی۔ بوڑھا شاہین پہلے سے کہیں کمزور ہو چکا تھا۔ اپنے مصائب پر گھٹری بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سفید برنس خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ چوپ چاپ ٹکٹکی باندھے دور کہیں دیکھ رہے تھے۔

”کاش ہم عمر المختار ہی کو بچا لیتے“ انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”کاش ہم انہیں مصر میں پناہ لینے پر آمادہ کر سکتے۔“

”سیدی عمر کو کوئی بھی نہ بچا سکتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ خود بچنے کے خواہشمند نہ تھے، وہ شکست کی صورت میں موت کو ترجیح دیتے تھے۔ میں جب ان سے رخصت ہو رہا تھا اسی وقت مجھے اس کا علم تھا، ہائے سید احمد۔“

سید احمد نے بطور اعتراض زور سے سر کو جنبش دی۔ ”ہاں مجھے بھی علم تھا۔  
 میں بھی جانتا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ وقت گزر چکا ہے۔۔۔۔۔ بعض اوقات خیال آتا  
 ہے سترہ برس پہلے میں نے استنبول کی دعوت پر لبیک کہہ کر غلطی کی تھی۔۔۔۔۔  
 لیکن میں اور کرتا بھی تو کیا جبکہ خلیفہ اسلام نے امداد کے لیے پکارا تھا۔ اللہ کے سوا  
 کون کہہ سکتا ہے کہ انسان جب اپنے منہمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے تو وہ حق پر ہوتا  
 ہے یا حق؟ بے شک کون کہہ سکتا ہے؟

سنوسی اعلیٰ کبیر کا سر درد کی شدت میں ادھر ادھر جھونٹنے لگا۔ ان کی آنکھیں  
 بخاری پوٹوں کے پیچھے چھپ گئیں۔ پھر جیسے فوری ایقان نے مجھے آلیا۔ میں  
 جانتا تھا ان آنکھوں میں اُمید کا شعلہ اب کبھی روشن ہونے نہ پائے گا۔





## شاہ ولی اللہ علیہ السلام

۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت بڑی سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہو گئی۔ نتیجہ ہندو مرہٹوں، سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیس میں انگریزوں کے عروج کی صورت میں نکلا۔ جب شاہ ولی اللہ ۷۰۳ء میں اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اس وقت تک قرآن و سنت پر مبنی صحیح اسلام کی تعلیمات ملک میں وسیع پیمانے پر نہیں پھیلی تھیں مغل و برادر تصنیف و تالیف کی زبان فارسی تھی اور عام لوگ اردو بولتے تھے۔ قرآن مجید کا ترجمہ تک نہ ہو پایا تھا، چنانچہ اکثر لوگ اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اسلام کی بقا کو اس قدر شدید خطرہ درپیش تھا کہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمان فی الواقع یہ اندیشہ محسوس کرنے لگے کہ مغلوں کا سیاسی زوال لوگوں کے مکمل مذہبی انتشار پر منتج ہوگا، لیکن یہ منحوس پیشین گوئی نہ صرف یہ کہ پوری نہ ہوئی بلکہ آنے والے دور نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک تازہ روحانی جذبہ موجزن پایا۔ یہ انقلاب احوال تنہا ایک شخص کی مساعی کا نتیجہ تھا اور وہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تھے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے والد ماجد مقامی حذیم شہرت کے حامل ایک فاضل بزرگ تھے۔ کچھ مدت نقلا اسلامی کی مشہور کتابات فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا کام کرتے رہے۔ تاہم انہیں مغل

دربار کی پرتکلف مصنوعی نضا پسند نہ تھی؛ چنانچہ اس کام کو چھوڑ دیا اور اپنا سارا وقت اپنی قائم کردہ درس گاہ — مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی اور ابھی مئیں بھی نہ بھیگی تھیں کہ انہی کے مدرسے میں طلبہ کو پڑھانے لگے۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ بارہ برس تک جاری رہا۔ پھر حج کرنے اور مکہ و مدینہ کے ممتاز ترین فضلاء و اساتذہ سے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے ارادہ سے عرب تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ کے زمانہ قیام میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے خواب میں دیکھا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتاب سنت کی خاص تعلیمات پر مبنی نئے سلسلے کے بانی کی حیثیت سے خلعت سے نوازا اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔ یہ خواب مستقبل کی تمام سرگرمیوں میں ان کے لیے روحانی تقویت کا باعث ہوا۔ ہندوستان میں ان دنوں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی؛ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے اقرباء نے مشورہ دیا کہ وہ سر دست عرب ہی میں رہیں، لیکن شاہ صاحب اپنا صحیح مقام وطن عزیز ہی کو سمجھتے تھے اس لیے اس مشورہ کو قبول نہ کیا اور ۹ جولائی ۱۷۳۲ء کو دہلی واپس پہنچ گئے۔ زندگی کا باقی حصہ اپنے شاگردوں کو علوم اسلامی کی مختلف شاخوں میں تربیت اور طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے تیار کرنے میں گزارا۔ وہ اپنا تمام فاضل وقت غنیمت تصانیف لکھنے میں صرف کرتے؛ چنانچہ جب ۱۷۶۲ء میں فوت ہوتے تو فی الواقع وہ تمام علوم اسلامی پر حاوی ایک کتب خانہ مکمل کر چکے تھے۔ ان کی اہم ترین اور بلند پایہ تصنیف ”حجۃ اللہ البالغہ“ ہے۔ یہ کتاب عالم اسلام کے علماء میں بے حد مقبول ہوئی اور قاہرہ کی جامع الازہر کے نصاب میں ایک مدت تک شامل رہی۔

عالم دین ہونے کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کو روکنے اور تجدید و احیائے اسلام کی ہر وہ تدبیر کی جو ان کے بس میں تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں برسر اقتدار گروہوں کی بد اعمالیوں پر تیز و تند تنقید کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور کہا کہ وہ دنیوی لذات کے پیچھے دوڑنا چھوڑ دیں اور اپنے گناہوں سے تائب ہوں۔

”اسے امیر، تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؛ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو چکے ہو، جن لوگوں کی نگرانی اور تحفظ کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، ان سے غافل ہو گئے ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ طاقت ور لوگ کمزوروں کو کھاتے جاتے ہیں۔ تم نے اپنی ساری ذہنی توانائیاں پرتکلف کھانوں، نرم و نازک اور حسین و جمیل عورتوں، اعلیٰ طبہ رسات اور شاندار محلات پر صرف کر رکھی ہیں۔“

فوجیوں سے کہا کہ وہ غیر اسلامی افعال سے باز آئیں اور اپنے اندر جہاد کی روح پیدا کریں، نیز نظم و ضبط کے فقدان، فرائض کی انجام دہی سے اعراض، شراب اور فساد سریشیات کی عادت اور عامۃ الناس پر جبر و ظلم کی مذمت کی۔

اہل حرفہ، مزدوروں اور علماء سے خطاب کرتے ہوئے امانت و دیانت کے فقدان، دینی فرائض سے تغافل، توہمات پر اعتقاد، خاندانی ذمہ داریوں سے گریز، اہل و عیال کی ضرورت سے بے توجہی اور غیر اخلاقی اعمال پر گہرے غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ انہیں نصیحت کی کہ وہ اپنے شام و سحر نماز میں گزاریں، دن کا بڑا حصہ کسب معاش کے لیے وقف کریں، مصارف کو آمدنی سے کم رکھیں اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں، جو کچھ پس انداز کریں اُسے مسافروں اور محتاجوں پر صرف کریں اور تھوڑا بہت ہنگامی مصارف اور ناگہانی مصائب کے لیے ضرور رکھ چھوڑیں۔

عوام کو تلقین کی کہ وہ اپنی زندگیوں کی اصلاح کریں۔ حرام و حلال میں امتیاز رکھیں، امرات و تہذیر سے کام نہ لیں، مصارف میں میانہ روی اختیار کریں اور حلال ذرائع سے روزی کمائیں۔ شاہ ولی اللہ نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ ہر محنت مند آدمی حلال اور نیکو ذرائع — زراعت، تجارت اور صنعت سے روزی کمائے۔ ہندوستان میں اسلام کی ایک بڑی کمزوری وہ ہندوانہ رسوم تھیں، جنہیں جاہل نو مسلم اپنے ساتھ لے آئے تھے اور ان پر بدستور عمل پیرا تھے۔ شاہ ولی اللہ نے ان رسوم کو ترک کرنے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عمل اختیار کرنے پر زور دیا۔ وہ معاشرتی خرابیاں جن کا منبع ہندوانہ رسوم تھیں، مثلاً بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی، پیدائش، شادی بیاہ اور موت پر مسرفانہ مصارف، ان سب پر



شاہ ولی اللہؒ نے سخت تنقید کی۔

شاہ ولی اللہؒ ملکیت کے قائل نہ تھے۔ ان کی نظر میں مغل حکمران رومی شہنشاہوں اور فارسی ساسانیوں سے ذرا بھی بہتر نہ تھے جو گونا گوں ٹیکسوں اور دوسرے متشددانہ اقدامات کے ذریعے اپنے عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک مسلمان معاشرہ کے لیے بہترین حکومت وہ تھی جو خلافت راشدہ کے منہاج پر قائم کی جاسے۔

عربی زبان سے نابالذ لوگوں میں قرآن کریم کی تعلیمات عام کرنے کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ پہلی بار فارسی زبان میں کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں نے اُسے اُردو میں منتقل کیا۔ پوری اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک عالم دین نے قرآن مجید کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا۔ اس عظیم الشان دینی خدمت کا صلہ قدامت پسند علماء نے شدید مخالفت کی صورت میں دیا۔ قرآن کریم کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں ایک قابل ذکر پہلو اور بھی تھا۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں یہودی مآخذ سے لیے جانے والے غیر مصدقہ قصص شامل کر لیے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان پر کڑی تنقید کی اور قرآنی لٹریچر میں اسرائیلیات کی شمولیت کو اسلامی فکر کی آفت قرار دیا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ نے تعلیم حدیث کے سلسلے میں بھی بہت دُرُوس اور مؤثر خدمت سرانجام دی۔ اس ضمن میں ان کا حقیقی کام فاضل اساتذہ کی تربیت تھا تاکہ وہ اس کام کو ان کی وفات کے بعد بھی جاری رکھ سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے واقعی پر سخت تنقید کی، جس نے کتاب المغازی میں قرآن کی آیات کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے داستانِ سرائی کی حد کر دی ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ قرآن کریم کی مختلف ہدایات و احکام کا مقصد حقیقی بگڑے ہوئے عقائد اور مضر افعال اور انسانی کردار کی اصلاح تھا، لہذا ضمنی واقعات جن کا ذکر واقعی نے کیا ہے کوئی اخلاقی اور تاریخی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشینوں نے جن اصلاحات کی دعوت دی چونکہ ان میں سے

اکثر عرب کے وہابی مصلحین کی اصلاحات سے ملتی جلتی تھیں اس لیے مغربی مبصرین غلطی سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں تحریکیں ایک سی تھیں۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ بھی محمد بن عبدالوہاب کی طرح امام ابن حنبل اور امام ابن تیمیہ کے مکتب فکر کے پُر جوش طالب علم تھے اور دونوں مجددین ہم عصر بھی تھے تاہم دونوں کے درمیان نمایاں اختلافات پاتے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنے افکار و نظریات میں محمد بن عبدالوہاب کی بہ نسبت کہیں زیادہ اعتدال پسند اور وسیع القلب تھے۔ انہوں نے بھی تصوف کی خرابیوں پر کھل کر تنقید کی تاہم اس کو بالکل مٹا دینے کا مقصد ان کے پیش نظر نہ تھا۔ مسلمانوں کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرنے ہی کی کوشش میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شیعہ اگرچہ متعدد اہم ترین مسائل میں سنت رسولؐ سے الگ ہو چکے ہیں تاہم وہ مسلمان ہیں، کافر نہیں ہیں۔

یہ دعویٰ بار بار کیا جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، سرسید احمد خاں ایسے تہجد و پسندوں کے پیشرو تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو عقلی توجیہ دہتیا کی جس کی، مغرب کے جدید طور و اطوار اور جدت پسندیوں کو اسلام میں داخل کر لے کے لیے سخت ضرورت تھی۔ اس دعویٰ میں صداقت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

”جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے وہ اول و آخر اسلام کے ایک عظیم اور راست فکر عالم تھے۔ انہیں (برصغیر کی دینی تاریخ میں) جو مستند اور قابل اعتماد مرتبہ حاصل ہے اس کی وجہ سے یہاں ہر ”مصلح“ ان کا نام استعمال کرتا ہے۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ”ٹور ٹور کر پیش کرتا ہے۔ جس شخص نے بھی ان کی عربی اور فارسی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سہارے کے یہ متلاشی کس قدر بددیانت ہیں۔ جو نظریات ان کی تحریروں میں بالکل نہیں ملتے، ان کو ثابت کرنے کے لیے یہ لوگ ان کے الفاظ کی عجیب و غریب اور طرفہ تادیل

کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے "عقیدت کی برتری" کی کبھی تائید و کالت نہیں کی، نہ انہوں نے "عربی اجزاء" کو اسلام سے خارج کر دینے کی کوئی کوشش کی۔ وہ چاروں فقہی مذاہب کے زبردست مداح تھے۔ انہوں نے ان میں سے کسی ایک فقہی مذاہب کو خارج کر کے کوئی نیا نظام قانون مستنبط کرنے کی اُرزو نہیں کی تاہم ان قدیم اور مقدس فقہی مذاہب کے کثرین اور ان کی باہمی خصوصیت کے پیش نظر انہوں نے یہ خیال ضرور ظاہر کیا تھا کہ حنفی اور شافعی مذاہب فقہ کی تحلیل و ترکیب سے ایک نئے قانونی نظام کا استنباط زیادہ مناسب ہوگا، لیکن اس اظہار خیال سے اگے بڑھ کر انہوں نے کبھی کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اسلام میں اُن کا صحیح مقام مجددِ دکان ہے۔ وہ مجدد نہ تھے۔

شاہ ولی اللہؒ ذہنی و فکری انقلاب کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ یہی ذہنی اور فکری انقلاب سیاسی احیاء اور صحیح اسلامی ریاست کا نقیب بن سکتا تھا، اسی کے لیے انہوں نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ تحریر و تصنیف سے فراغت پاتے تو علماء کی ایک جماعت کی تربیت میں مصروف ہو جاتے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد ازاں اپنی زندگی اپنے استاد کے دینی، معاشرتی اور سیاسی نظریات کو پھیلانے کے لیے وقف کر دی۔

## سید احمد شہید علیہ رحمۃ اللہ

شاہ دلی اللہ کے کام کا سب سے بڑا حاصل یہ تھا کہ خارجی میدان میں انگریزوں اور سکھوں کی طاقت، اور داخلی زندگی میں اخلاقی و روحانی مفاسد کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے ایک زبردست تحریک اٹھ کھڑی ہوتی۔ شاہ دلی اللہ کے مشن کو پورا کرنے کی جدوجہد جس شخص نے سب سے بڑھ کر کی وہ سید احمد شہید تھے۔ سید احمد، ۸، ۱۷ میں مکھنوسے تقریباً ۵۰ میل دور ایک چھوٹے سے قصبے رائے بریلی میں پیدا ہوئے، تاہم سید احمد، شاہ دلی اللہ کی طرح معرفت معنوں میں عالم نہ تھے۔ بچپن میں انہوں نے چند الفاظ لکھنے اور قرآن مجید کی چند سورتیں یاد کرنے کے سوا اور کچھ نہ پڑھا۔ وہ بے حد قوی ہیکل تھے۔ عنفوانِ شباب کا بڑا حصہ جسمانی ریاضت اور پہلوانی میں گزارا۔ پیراکی کے سجد شائق تھے اور اس فن میں بڑے بڑے پیراگوں پر سبقت رکھتے تھے۔ بھاری وزن اٹھانا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی حیرت انگیز طاقت اور دلیری کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد تلاشِ روزگار کی ضرورت پڑی تو گھر سے نکلے اور مکھنوپہنچے۔ وہاں تین مہینے رہے، لیکن کوئی روزگار نہ ملا۔ آخر کار شاہ دلی اللہ کے صاحبزادے اور عالم بے بدل شاہ عبدالعزیز کے آگے زانوئے تلمذتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ دہلی پہنچے اور شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب کو جب پتہ چلا کہ



سید احمد شاہ ولی اللہ کے تنہا بیٹے سے ان کے ایک جدی عزیز ہیں، تو بے حد خوش ہوئے۔  
 سید احمد رحمہ اللہ اسلامی طریقِ آداب پر عامل تھے۔ جب حاضر خدمت ہوتے تو اسلام علیکم کہا۔ شاہ  
 عبدالعزیز رحمہ اللہ بے حد مسرور ہوتے، کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان گھرانوں میں  
 سلام مسنون کارواج تقریباً اٹھ چکا تھا۔ دورانِ تعلیم میں سید احمد ایک عجیب و غریب تجربہ  
 سے دوچار ہوئے۔ جب بھی پڑھنے بیٹھتے کتاب کے الفاظ غائب ہو جاتے۔ قرآن و حدیث  
 کی تعلیم بڑے جوش اور دلولے سے حاصل کرتے لیکن دوسرے مضامین میں ان کے لیے کوئی جاذبیت  
 نہ تھی۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ کسی طبعی عارضہ میں مبتلا ہیں، لیکن درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے  
 ایک اشارہ تھا کہ انہیں لکھنے پڑھنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ بائیس سال کی عمر تک انہوں نے  
 اتنی عربی فارسی پڑھ لی جو قرآن و حدیث جاننے کے لیے ضروری تھی۔ اب ان کے اساتذہ نے انہیں  
 تصوف سے روشناس کیا۔ سید احمد رحمہ اللہ وجہیہ اور دراز قامت نوجوان تھے۔ ان کا جسم گٹھیل اور  
 رنگ سرخ و سفید اور خوش گن تھا۔ آنکھیں سیاہ بڑی بڑی اور تفکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ  
 شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مدرسہ سے ان کی دعوت قرآن و حدیث کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے  
 پُر جوش علمبردار بن کر نکلے۔ راستے بریلی پہنچے تو ان کے وسیع و تقویٰ، سادگی اور مثالی کردار کی بنا پر  
 لوگ انہیں ولی سمجھنے لگے۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ساتھ ربط و ضبط سے ان کی شہرت میں اور اضافہ  
 ہو گیا۔ وہ جہاں کہیں جاتے لوگ انہیں خدا رسیدہ انسان سمجھ کر نگاہِ دیدل فرشتہ راہ کرتے۔ سید احمد  
 اسلام کی تجدید و احیاء کا مقصد اپنے سامنے رکھتے تھے۔ وہ اسے ہندوستانی اور عجمی توہمات  
 سے پاک صاف کرنا چاہتے تھے۔ انہیں فروعیات میں مؤشگافی اور نظری اختلافات سے  
 کوئی سروکار نہ تھا۔ توحید اور احکام الہی کی اطاعت اور اس کی ضرورت و اہمیت ان کا پیغام  
 تھا، جس کی وہ رات دن تبلیغ و اشاعت کرتے۔

جولائی ۱۸۶۱ء میں سید احمد فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

حج بیت اللہ ایک دینی فریضہ ہے اور ہر صحت مند اور استطاعت رکھنے والے مسلمان پر

فرض ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمان اس فریضہ کی ادائیگی کو تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ بہانہ یہ تھا کہ مکہ مکرمہ تک سفر نہایت پرخطر بن چکا ہے۔ سید احمد رح کے ہمراہ تقریباً چار سو افراد کی ایک بڑی جماعت بھی گئی۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مصارف سفر کے لیے اگرچہ ان کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، تاہم انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کریمی پر کامل بھروسہ کریں، چنانچہ جب حج کر کے واپس آئے ان لوگوں کے پاس نہ صرف کافی اشیائے خورد و نوش بلکہ کئی سو روپیہ بھی بچ رہا تھا۔ سید احمد عرب میں متعدد علماء اور فضلاء سے ملے اور عالم اسلام کی تمام اہم تحریکوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان میں غالباً وہابی تحریک بھی شامل تھی؛ تاہم یہ سمجھنا غلط ہے کہ سید احمد رح نے جس تحریک کا آغاز کیا وہ وہابیت کی شاخ ہی تھی۔ اکثر یورپی مصنف اسی غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ہندوستانی مسلمان (THE Indian Musalmans) اس کی ایک مثال ہے۔ سید احمد رح کی تحریک کے اہم انکار عرب روانہ ہونے سے پیشتر ہی تشکیل پا چکے تھے۔

حج سے مراجعت فرماہوئے تو سید احمد رح نے ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار کے جوئے سے آزاد کرانے اور صحیح اسلامی مملکت قائم کرنے کے لیے قی بنیادوں پر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ سید احمد رح اپنے سربراہ اور وہ مرید شاہ اسماعیل سمیت ۸۳۱ آدمیوں سے رٹے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہو گئے۔ سکھوں نے اپنے مسلمان حریف سے انتقام اس طرح لیا کہ سید صاحب کی لاش کو منائع کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ ان پڑھ پٹھانوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اگر جسم کو مہلا ڈالا جائے تو انسان کی روح کو نہ تو کبھی چین نصیب ہوتا ہے اور نہ وہ بہشت ہی میں داخل ہو سکتی ہے۔ سید صاحب اور ان کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور اصحاب رسول کے معیار کردار کو اپنانے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے پہلے سکھوں کو دعوت دی کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دیں۔ ہتھیاروں سے کام اُس وقت لیا جب اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ دوران جنگ میں اسلامی احکام کی کامل

پابندی کی۔ کبھی کسی وحشیانہ فعل کا ارتکاب نہیں کیا۔ ان کے سپاہی نہ شراب پیتے تھے نہ زانی اور بدکار تھے۔ کسی ایک جنگ میں بھی کسی عورت کی عصمت دری یا کسی کا مال لوٹنے کی مثال نہیں ملتی۔ خدا کے یہ سپاہی فی الواقع دلی تھے۔ جن کے دن گھوڑوں کی پشت پر بسر ہوتے تھے اور راتیں تہجد اور نوافل میں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اخوت کے حساب کتاب اور اللہ کے اُگے جوابدہی کے احساس سے غافل نہ ہوتے تھے۔

• ان کی ناکامی بلحاظ ظاہر ہے نہ کہ بلحاظ حقیقت۔ حقیقی کامیابی تو مسلمان کے نزدیک بس یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے اقامتِ دین کی سعی کرے جیسا کہ سعی کرنے کا حق ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرات یقیناً کامیاب رہے۔ البتہ ان کی ناکامی دنیوی نتائج کے اعتبار سے ہے کہ وہ عملاً جاہلیت کا اقتدار ختم کر کے اسلام کا غلبہ قائم نہ کر سکے۔

ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان مصیبین نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ اب جس کسی کو تجدیدِ دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصلاحات سے روز و اشارات سے، لباس و اطوار سے، پیری مریدی سے، اور ہر اُس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرانے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسری چیز جو ایک شخص کو تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اس علاقہ کو اس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ



ہر تجدیدی تحریک میں غلط رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جی ہوئی نہ ہوں وہ نقش بر آب ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان بزرگوں کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دُور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کسی قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکے؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پاسکتے جب تک کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ معاثر تاریخ کے سرسری خاکہ پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے مگر وہاں قومیں کی قومیں جاگ اٹھی تھیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا۔ یہاں ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنوں پر قابض ہو گئیں۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا اس کی طاقت کو تراڑ دے ایک پلڑے میں رکھتے اور دوسرے پلڑے میں اس طاقت کو رکھتے جس کے ساتھ ان کی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی تب آپ کو پورا اندازہ ہو گا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کا فرما ہیں ان کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا؟ اس لیے جو نتیجہ فی الواقع رونما ہوا اس کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔



یہ تمام اسباب و عوامل مل کر سید احمد رء کی بالاکوٹ کے مقام شہادت پر منہج ہوئے،  
 لیکن ان کے اثرات اس قدر قوی تھے کہ ان کی درخشاں مثال مسلم ہندوستان میں تجدیدِ اسلام  
 کی تمام آئندہ کوششوں کی محرک بن گئی۔

---

## شہزادہ سعید حلیم پاشا

شہزادہ سعید حلیم پاشا محمد علی والی مصر کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ محمد علی ایک جوشیلہ مغرب پرست تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو مغربی تعلیم دلوائی۔ شہزادہ سعید حلیم پاشا "نوجوان ترکوں" کے ایک لیڈر تھے اور کمال اتاترک کے عہدِ حکومت سے پہلے ترکی کے وزیرِ اعظم رہ چکے تھے۔ وہ تحریکِ احیائے اسلام کے ایک ممتاز علمبردار تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر انہیں اپنی جان بچانے کے لیے ترکی سے بھاگنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک آرمینی پناہ گزین نے انہیں دھوکے سے قتل کر ڈالا۔

سعید حلیم پاشا زمانے کے گرم و سرد سے آگاہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ مدبر تھے۔ جدید یورپی سیاسیات میں گہرا درک رکھتے تھے۔ وہ ایک مُصلِح تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور ان کے مسائل کے متعلق سوچ بچار میں بسر کی۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی کے نظریات کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی تعلیمات اور تفسیر و فقہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی قیادت کرنے اور مستقبل کی پالیسی کے سلسلے میں اُسے مشورہ دینے کی اعلیٰ صلاحیت سے بہرہ مند تھے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ مسلمان مغرب زدگی کے بجائے اسلام کو

اپنائیں۔ انہوں نے اپنے نظریات اپنی کتاب "اسلامشمنق" میں مفصل بیان کیے ہیں۔ مشہور  
نومسلم محمد مارماڈوک پکٹھال نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ ذیل میں اس کے چند  
اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ اسلامی نظام حکومت کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کی یہ  
قابلیت پہلی کامیاب کوشش تھی:

”یہ بات میرے لیے بے حد اطمینان بخش ہے کہ عامۃ المسلمین خوابِ گراں  
سے بیدار ہو رہے ہیں اور ان کے اندر غیر ملکی اقتدار کا جو اتار پھینکنے کی تڑپ پیدا  
ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالآخر وہ سمجھ گئے ہیں کہ آزادی حاصل کرنا  
مسلمان کا مقدس ترین فریضہ ہے۔ آزادی کے بغیر نہ تودہ مسرت و خوشحالی سے  
ہمکنار ہو سکتے ہیں نہ حقیقی ترقی سے۔ تاہم مجھے اعتراض ہے کہ میرا یہ اطمینان  
بے آمیزش نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے روشن خیال طبقات کے  
نمائندوں کی بھاری اکثریت اپنے ملکوں کو مغربی اداروں کے مصنوعی چربوں سے  
نوازنے پر تلی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہندو آریائی دنیا کے اصولوں  
اور تصورات کو اپنا کر ہی نشاۃ ثانیہ سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اس طبقے کی یہ  
ذہنی کیفیت میرے لیے بے حد پریشان کن ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ  
اب ان لوگوں کو یہ احساس تک نہیں رہا کہ اسلام ہمیں ایک خدا کی عبادت کرنے  
کی تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عقیدہ توحید سے صادر ہونے والے  
اخلاقی اور معاشرتی اصول بھی عطا کرتا ہے۔ یہ اصول ہم پر ہمارا عقیدہ عائد کرتا  
ہے۔ تمام مسلمان معاشرے انہی کے ذریعے وجود میں آئے ہیں اور انہی کی بنیاد

Islamic Culture, Muhammad Marmaduke Pickthall,

pp. 153-154.

پر زندہ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی صاف عیاں ہے کہ ہمارے منتخب روشن خیال طبقہ کا یہ ایمان بھی نہیں رہا کہ اسلام سب ادیان سے برتر و افضل دین اور کامل و اکمل تہذیب ہے۔ جس طرح انسان اس کے حلقہ طاعت سے باہر رہ کر ابدی نجات سے ہمکنار نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کے بغیر وہ معاشرتی نجات بھی نہیں پاسکتا۔۔۔۔۔ میرے نزدیک یہ بات مسلمان ذہنیت کے بگاڑ کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمان معاشرہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مغربی معاشرہ میں جذب ہو جانا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ذہنی بگاڑ اس غیر ملکی استیلا کا منحوس اثر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ماننے والے لوگ برداشت کر رہے ہیں۔ اُس غیر ملکی غلبہ و استیلا کا اثر جس نے ان کے درمیان ذہنی گدازندہ کا کردار ادا کیا ہے۔ میں ان غلطیوں کو دفع کرنا چاہتا ہوں جن سے یہ ذہنیت گراں باہ ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اور معاشرتی نقطہ نظر سے عالم اسلام کا مغرب پر رشک کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان معاملات میں مغرب کو اسلام کے اگے زانوئے تلمذت کرنا چاہیے۔

اسلام کا سارا اجتماعی ڈھانچہ شریعت کی حاکمیت کے اساسی اصول پر مبنی ہے۔ مسلمان معاشرہ وہ ہے جو اس حاکمیت کے اگے تسلیم خم کر دے۔ شریعت ان فطری، اخلاقی اور معاشرتی سچائیوں کا کامل مجموعہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاق کائنات کی طرف سے نازل کردہ وحی کی بنا پر ہمیں بتائیں اور جن پر انسان کی راحت اور مسرت کا دار و مدار ہے۔ شریعت کی حاکمیت کا اصول یہ ہے کہ انسان اس اساسی سچائی کو تسلیم کرے کہ ہر قسم کی زندگی اس کی محکوم ہے۔ لہذا جس طرح انسان کی طبعی زندگی مخصوص طبعی قوانین کی محکوم ہے اسی طرح اُس کی معاشرتی زندگی بھی فطری معاشرتی قوانین کے ماتحت ہے، چنانچہ اسلام اس



اصول کو منوانے میں کامیاب ہو گیا کہ انسان اپنے کسی پڑوسی کے قانون کی اطاعت کرنے پر مجبور مطلق نہیں ہے، خواہ وہ قانون اس قوم یا گروہ کی بھاری اکثریت کی مرضی کا مظہر ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہ قانون لازماً کسی حد تک مستبدانہ ہو گا۔ اسلام نے تجربیت اور عقلیت کو زیر کیا، کیونکہ یہ دونوں غلطیوں اور تعصبات کا انبار تھے۔ یہی غلطیاں اور تعصبات اب تک معاشرتی نظام کی تشکیل اور نشوونما میں انسان کی رہنمائی کرتے رہے تھے۔ اسلام نے ایسے اصول و ضوابط پیش کیے جن کی بدولت لوگوں کو ان خیالی حاکمیتوں سے نجات ملی جو انہوں نے کسی ایسی باختیار ہستی کی فطری ضرورت پورا کرنے کے لیے خود بنالی تھیں، جو معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی نقطہ نظر سے نظم و ضبط کی ضمانت دینے کے قابل ہو۔ بلاشبہ یہ اسلام ہی ہے جس نے حکومت کا صحیح ترین تصور وضع کیا اور انسان کو یہ تعلیم دے کر اس کی حقیقی اہمیت سے آگاہ کیا کہ غیر متنازع قیہ اقتدار و اختیار کا مالک خدا تعالیٰ کی ذات بے ہمتا ہے اور یہ عملی شکل میں شریعت میں موجود ہے، جو اخلاقی و معاشرتی صداقت کا معیار اور بنابرین، مملکت کے نظام حکومت میں معاشرتی انصاف کا ضامن ہے۔ اسلام نے اس عقیدہ کا خاتمہ کر دیا کہ انسان کی کمزور و بے مایہ عقل سے حکومت و اقتدار اخذ کیا جاسکتا ہے، جس سے صادر ہونے والے اخلاقی و معاشرتی قوانین نے ہمیشہ جبر و ظلم پر مبنی مستبد اور غاصب طاقت کو جنم دیا ہے۔ ایک ایسی غیر طبعی اور غاصب حاکمیت کو، جو محض اپنے خود غرضانہ مقاصد کی تسکین کے درپے رہتی ہے اور اقتدار پر قابض ہاتھوں کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کس لیے نازل کی گئی؟ مشاہد اور سوچ بچار کی جن انسانی قوتوں نے سائنسی قوانین کو بے نقاب کیا، وہ اخلاقی و معاشرتی

قوانین کے انکشاف سے عاجز و درماندہ کیوں کر ہو سکتی ہیں؟ اس کا جواب بڑا سیدھا  
سادا ہے۔ ان دونوں باتوں میں بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر قوانین صرف  
انسان کے طبعی وجود کے مطالعہ کی بنیاد ہیں؛ چنانچہ وہ ایک خالص معروضی نظام  
دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مؤخر الذکر قوانین کا انسان کے ساتھ رشتہ اُس کے  
ایک اخلاقی، باضمیر اور معاشرتی مخلوق ہونے کی حیثیت سے ہے۔ بنا بریں اُن  
کا تعلق انسان کے حساس نفسیاتی نظام سے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ مریخی موضوعی  
ہیں اور مثبت آئین کی کوئی بنیاد نہیں دے سکتے۔ انسان اپنی مرضی اور ارادے  
کے دائرے سے باہر مختلف حقائق اور مظاہرِ فطرت سے نتائج کا استخراج  
پوری ذہنی آزادی اور غیر جنبہ داری سے کر سکتا ہے، کیونکہ یہ نتائج محض مکانیکی  
انداز میں سامنے آتے ہیں اور ان پر انسانی خصوصیات بالکل نظر انداز نہیں ہوتیں۔  
وہ ان سے حقیقت کے مطابق قوانین و ضوابط مستنبط کر سکتا ہے، لیکن جب انسان  
کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی تحقیق اور اس کی روش کو معین کرنے والے قوانین  
بنانے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انسان کا مشاہدہ اور استدلال، پورے انضباط سے  
کام لینے کے باوجود، غیر یقینی اور بالعموم ناقص رہنما ثابت ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ  
ہے کہ انسان کی کمزوریاں اُس کے اس مشاہدہ اور استدلال کو ہمیشہ غارت کر کے  
رکھ دیتی ہیں۔ انسان اس میدان میں انکشافِ حقیقت سے فطرۃً کتنا عاجز اور  
بے بس و نااہل ہے۔ اس کا نایاں ثبوت ان اخلاقی اور معاشرتی قوانین سے ملتا ہے  
جو اہل مغرب نے وضع کیے ہیں۔ یہ قوانین فطری اصولوں سے یکسر جہالت پر مبنی  
ہیں اور ان کی بدولت اہل مغرب، حد سے زیادہ ہندوب ہونے کے باوجود، آج  
تک دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نیز اس کا اندازہ ان مصائب سے ہو سکتا ہے  
جن سے وہ لوگ اس جہالت کے نتیجے میں دوچار ہیں، حالانکہ اپنی فطری صلاحیتوں

سے کام لیتے ہوئے وہ دوسرے فطری قوانین کا ادراک نہایت اعلیٰ پیمانے پر  
 پاسکے ہیں۔ بنا بریں یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے ان اخلاقی و معاشرتی قوانین کا انکشاف نہ فرمایا ہوتا جن پر انسانی زندگی کی  
 راحت و مسرت کا دار و مدار ہے، تو انسان ان سے کبھی آگاہ ہونے نہ پاتا۔  
 انسانی معاشرہ کی تنظیم کے سلسلے میں اسلامی نظریہ کی واضح برتری کے  
 باوجود آج مسلمانوں کی ذہنی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ وہ قومی منشائے اُس اصول  
 کو ترجیح دے رہے ہیں جو شریعت کی حاکمیت کے اصول سے نہ صرف کوئی  
 مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اُس کا مد مقابل بھی ہے۔ مسلمان دانشوروں  
 کی انکمیں مغربی معاشرہ کی مادی خوشحالی اور طاقت سے استقدر چکا چونکہ  
 ہر چکی ہیں کہ وہ مغرب کی اس باپادستی کی مدح و تعریف میں رطب اللسان ہیں  
 اور اسے قومی حکومت کے اصول کا اعجاز قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں  
 کہ شریعت کو مسلمان ریاست کا معیار اور ماخذ ہونے کی جو حیثیت حاصل  
 رہی ہے، اُسے ختم کر دیا جائے۔ ہم مقتدر قومی حکومت کا یہ نظریہ، حکومت  
 کے ان تمام دوسرے نظریات کی طرح غلط اور گمراہ کن ہے جو قبل ازیں مغرب  
 میں مروج رہے ہیں۔ قومی حکومت ایک خیالی نظریہ پر قائم ہوتی ہے جس کی رو  
 سے کوئی قوم اپنے معاملات کا فیصلہ خود اپنے اختیار اور حق قانون سازی کے  
 ذریعے کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ ان حکومتوں کی تہ میں ہمیشہ قوت کا اصول کارفرما  
 رہا ہے جس کا نتیجہ حصول اقتدار کی مسلسل کشمکش کی صورت میں نکلا ہے اور یہ کشمکش  
 ہمیشہ اپنے جلو میں معاشرتی بغض و عناد کی نہ ہرنا کی اور قومی طاقت کا مکمل ضیاع  
 لاتی ہے۔ لہذا ایسی حکومتیں محض بے قید اختیارات کا دوسرا نام ہیں جنہیں  
 ہیما نہ قوت کے بل پر لوگوں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کا احترام ان

کی فطرت میں گندمی ہوتی اخلاقی قدروں کی عظمت و شہرت کی بنا پر نہیں کیا جاتا وہ غضب و نہیب اور ظلم و ناانصافی کی علامت ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حقیقی حکومت صرف اوائے فرض سے وجود میں آتی ہے اور وہ اوائے فرضیہ کی محافظ ہوتی ہے۔ بصورت دیگر وہ غضب اور ظلم و ناانصافی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لوگ جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں کچھ فطری حقوق لے کر آتا ہے، جن میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ آزاد ہے، تو وہ اپنے خیال میں بڑی آزاد خیالی کا ثبوت دیتے ہیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط اور گمراہ کن، بلکہ میں تو یہ کہوں گا، آزاد خیالی کا مخالف دعویٰ اور کوئی نہیں ہے۔ انسان کوئی فطری حق نہیں رکھتا۔ وہ فطرۃً اپنے آپ کو صرف اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنے یا بالفاظ دیگر ان فطری قوانین کی پابندی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کی محکوم اس کی اخلاقی اور مادی زندگی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں وہ فرائض انجام دینے کی استعداد سے بہرہ ور ہے۔ فرض انجام دینے کے بعد ہی وہ یہ حق حاصل کر سکتا ہے کہ اُس کی تائید و حمایت کی جائے اور اُسے سہارا دیا جائے۔ نیکی پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ عزت و احترام کا مستحق گردانا جاسکتا ہے اور اپنے اخلاقی و معاشرتی فرائض کی تکمیل کر کے ہی آزادی کا کسی قدر محدود حق حاصل کر سکتا ہے۔ اس آزادی کا جوہر بھی ان اخلاقی اور معاشرتی فرائض میں پنہاں ہے جنہیں وہ انجام دیتا ہے اور جس انداز میں انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے لوگوں کو شریعت کے ذریعے اپنے فرائض انجام دینے کی تعلیم دی اور اس کے نتیجے میں مکمل اور پائیدار مسرت و راحت کے حق سے بہرہ اندوز ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا۔

آج مغربی ممالک میں ریاست کے اعلیٰ منصب کا دروازہ صرف دو قسم کے لوگوں کے لیے کھلا ہے۔ ایک وہ جو پیدائشی حق کی بنیاد پر چپ چاپ اندر پہنچ



جالتے ہیں، خواہ اپنے فرائض انجام دینے کے اہل ہوں یا نااہل۔ دوسرے وہ نہیں  
عوام اپنے درثوں سے منتخب کرتے ہیں۔ مگر الذکر طریقہ ہمارے دینی نقطہ  
نظر سے قطعاً قابل اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ انتخاب خوب غور و فکر کے بعد کیا  
جائے اور قوم کے بہترین اور آزمودہ خدام میں سے کیا جائے اور قوم کے بہترین اصحاب  
عقل و دانش کی مجلس شوریٰ منتخب کرے۔ پھر اسے زندگی بھر کے لیے یا اس  
وقت تک کے لیے منتخب کیا جائے جب تک وہ اپنے فرائض دیانت و امانت  
اور حق و صداقت کے ساتھ انجام دے۔ بایں ہمہ یہ مفاد جو پکڑ چکا ہے کہ اکثریت

لے یہ مقام ان متعدد مقامات میں سے ہے جن سے مترجم کو اختلاف ہے۔ موجودہ حالات میں اس سے چونکہ  
سخت غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے اس لیے چند سطور قلم بند کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ رائے شہزادہ  
سعید عظیم پاشا کی ذاتی رائے ہے۔ بے شک یہ بعض فقہاء کی رائے پر مبنی ہے، لیکن قرآن و حدیث میں کہیں  
بھی مسلمانوں پر یہ واجب نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمان ریاست کے سربراہ کا انتخاب صرف چیدہ اصحاب دانش  
کی مجلس کرے اور سربراہ لازماً زندگی بھر ہی کے لیے منتخب کیا جائے۔ قرآن و حدیث نے بس اصول دیئے  
ہیں۔ ان اصولوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابی اداروں کی ہیئت و وقت کے تقاضوں کے مطابق  
تبدیل کی جاسکتی ہے۔ خلفائے راشدین کے انتخاب کی نوعیت پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا  
ہے کہ مدینہ کی پہلی اسلامی مملکت میں حق انتخاب چند افراد کے بجائے بتدریج عامۃ المسلمین کی طرف منتقل  
ہو رہا تھا، اگر خلافت راشدہ کی جگہ مملکت نہ لے لیتی تو اسلامی ریاست کے دستوری اور انتخابی  
اداروں کی ہیئت واضح ہو کر سامنے آجاتی اور اس ہیئت میں عامۃ المسلمین کی رائے کو بنیادی اہمیت  
حاصل ہوتی۔ رہا زندگی بھر کے لیے سربراہ مملکت کا انتخاب، تو خود اسلامی تاریخ کے اس سبق کے بعد  
کہ اس کا نتیجہ شخصی حکومت، آمریت یا بادشاہت کی صورت میں نکلتا ہے، اس کو اپنا عقل و دانش کا  
اچھا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جب کہ نفس میں اس کے وجوب کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ہمیشہ حق پر ہوتی ہے؛ اسی مناسطہ کی بنا پر راستے دہندگی کا حق ایسے انبرہ کو دے دیا گیا ہے جو اس سلسلے میں صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت سے عاری ہے۔ یہ انتخاب بالعموم ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جن کے متعلق عقل و دانش کہتی ہے کہ انہیں پہلے ہی مرحلے میں میدانِ انتخاب سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ یہ لوگ بذاتِ خود طالع آزمائہ ہوتے ہیں اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ اختیار کرتے ہیں۔

مبارزتی (contested) انتخابات اسلامی اداروں کا جزو نہیں ہوتے کیونکہ اسلام نہ تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ انفرادی طور پر نا اہل اور خطا کار لوگ اجتماعی حیثیت سے اہل اور معصوم ہو جاتے ہیں اور نہ وہ جاہلوں کی اکثریت پر اعتقاد رکھتا ہے۔ حکمران کا انتخاب نہایت اہم معاملہ ہے اور صرف دانش مند اصحاب کو تفویض کیا جاتا ہے جو منقطع شخصیتوں سے گہرے واقف ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر مسلمان انتخاب میں کوئی حقتہ نہیں لیتے۔ وہ محض اس انتخاب کی توثیق یا اُسے نامنظور کر سکتے ہیں۔ مسلمان ریاست کا سربراہ ایک مختصر مدت کے لیے نہیں زندگی بھر کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اُسے حکومت کے تمام اختیارات دیئے جاتے ہیں۔ بمحاطہ عوام وہ ایک مطلق العنان فرمانروا ہوتا ہے، لیکن بمحاطہ شریعت وہ اپنی رعیت کے ایک ادنیٰ فرد کے برابر ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں ہر ایک مسلمان، جس کی نظر قیامت پر ہوتی ہے جب اُسے اپنے پورے کارنامہ حیات کا حساب دینا ہوگا۔ جب تک وہ استبدازی سے حکومت کرتا ہے، عامۃ المسلمین اُس سے نجات پانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، لیکن اگر وہ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے تو خود شریعت انہیں یہ حق دیتی ہے کہ اُس کا احتساب کریں اور ضرورت پڑے تو معزول کر دیں۔ مغربی جمہوری ملکوں میں عوام کے ووٹ سے کسی صدر کو راست روی پر بھی معزول کیا جاسکتا ہے۔ ہاں وہ ایک راست رو صدر کو اس بنا پر معزول کر سکتے ہیں کہ غلط روی کو ترجیح

دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اسلامی ریاست میں نئے قانون و قانون کے بنیادی اصولوں کے ماہر افراد ہی بنا سکتے ہیں۔ وہ ماہر افراد جنہیں روشن خیال اور قومی ضرورت کا ہم رکھنے والے علماء و فضلا کے گروہ میں سے مجلس عمومی نے منتخب کیا ہو۔ پھر اسلام میں قانون سازی روزمرہ کا کاروبار نہیں ہے بلکہ بہت کم اس کی ضرورت آتی ہے۔ اسلامی قوانین اسمبلی کی مشغول نفعی میں وہ لوگ نہیں بنتے جو اپنے مفادات کی خاطر قانون سازی پر تلے ہوئے ہوں۔ ان لوگوں کے علی الرغم جو مفاد پرستی ہی کی بنا پر اس کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اسلامی قوانین کی بنیاد محکم شریعت الہی ہے؛ چنانچہ یہ قوانین ہمیشہ جمعی سب لوگوں کے مفاد میں ہیں۔ اسلامی قانون سازی باہم مخالفت سیاست دانوں کا نہیں سنجیدہ اور ہوش مند ماہرین قانون کا کام ہے۔

قومی حکومت چرنکھ ایک باطل اصول کی ارتقائی صورت ہے اس لیے ارتقا کے تسلسل کی بدولت اپنی پیشرو حکومتوں کی طرح مٹ جانے والی ہے۔ مزید برآں جس چیز کو لوگ پوری قوم کی مرضی قرار دیتے ہیں وہ فی الحقیقت قوم کی اکثریت کی مرضی ہوتی ہے۔ یہ اکثریت صرف ایک ووٹ کی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ایک کمزوری اکثریت کی مرضی کے مقابلے میں ایک بہت مضبوط اقلیت کی مرضی غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہذا قومی حکومت کا اصول بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اکثریت کو اقلیت پر اپنی مرضی مستط کرنے کا حق دیدیا جاتا ہے۔ ایسی مرضی جو ہر لحاظ سے قانون ہوتی ہے، جس کے فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی، جس کا بالعموم عقل و انصاف سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں کو ایک ایسے مستقل سطح نظر سے نوازا جو ہمیشہ ان کے تہذیبی و معاشرتی ارتقا میں صدر نشین رہا۔ اس کی بدولت تیرہ صدی سے



زیادہ حرمت ملک، عزت و فذوال کے تمام اوراق میں، مسلمان قوموں نے اپنا مدد و شش کو  
 شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، حتیٰ الامکان اس کے احکام کی پابند  
 رہیں اور اپنی نجات کے لیے ہمیشہ اسی قانون کی طرف دیکھا۔ اسلام کے معاشرتی  
 نظام کا ایک اور ثمر یہ تھا کہ اقتدار کو وہ سطرت اور اثر و نفوذ حاصل ہوا جس کی  
 نظیر کہیں اور یا تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نہیں ملتی۔ یہ وہ اقتدار تھا جس  
 سے لگ بیک وقت خون بھی کھلتے، اُسے عزت و احترام کی نظر سے بھی  
 دیکھتے اور دل و جان سے محبت بھی کرتے تھے۔ وہ محبوب اس لیے تھا کہ  
 شریعت اُس کا موجب تھی، چنانچہ اسے بے داغ قانونی جواز حاصل تھا۔ وہ کسی  
 قزاقی یا غضب و نہب کے خیال تک سے آلودہ نہ تھا۔ اُس سے لگ بیک وقت  
 اس لیے کھلتے تھے کہ وہ ہمہ مقتدر تھا۔ یہ قوت اُس نے اپنے یکسر بے عیب ماخذ  
 سے اخذ کی تھی، نیز اُسے اخلاقی و معاشرتی صداقت کے معیار کی حقیقت حاصل  
 تھی۔ اس کے نام پر غلطیوں اور فرد گزاشتوں کا ارتکاب اُسے اُس احترام و  
 اعتماد سے محروم کر دیتا تھا جس سے وہ شریعت کی بدولت بہرہ مند تھا۔ پھر  
 اس کا ازالہ کبھی نہ ہو سکتا۔

ہر دور میں مسلمان عوام میں یہ احساس برقرار رہا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے  
 سامنے جس بے انصافی اور استبداد کا شکار ہوئے ہیں۔ اُس کا سبب نہ تو شریعت  
 کا اقتدار و حکومت ہے اور نہ اس سے مستنبط کیے جانے والے قوانین اور ادارے،  
 بلکہ ساری ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے اقتدار پر زبردستی قبضہ  
 کر لیا اور قانون کے نام پر من مانی کرتے رہے۔۔۔۔۔ ایسی افراط و تفریط  
 اور بے انصافیوں کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ حکمرانوں کو بدل کر تمام اقتدار ان  
 لوگوں کے ہاتھ میں دیدی جائے جن سے بادی النظر میں یہ توقع کی جاسکے کہ وہ شریعت



کی بہتر ناسدگی اور قانون کی موثر تطبیق کریں گے۔ شریعت نے ہمیں جو ہدایات دی ہیں ان کی قدر و قیمت تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔ ان کی بددلت مسلمان معاشرہ اس نسلی و طبقاتی افتراق اور جنگ و جدال سے محفوظ رہا جس نے مغربی قوموں کو پیہم پریشانی میں مبتلا رکھا ہے۔ عقل و دانش کا تعاضل یہ ہے کہ ہم ان ہدایت پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ ہمیں اپنے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام کو وجود میں لانے اور منضبط کرنے کے لیے لازماً فقہ کی طرف رجوع کرنا ہو گا، جو شریعت کی اساس پر وضع کی گئی ہے اور اس کی روح اور منشاء کی مکمل منظر ہے۔ ہمیں اس کے دامن میں مثبت قوانین کے وہ تحفظات ملیں گے جو کسی معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے محفوظ اور پاک رکھ سکتے ہیں جن میں مغربی معاشرے اور نظام مبتلا ہیں۔ ان سطور سے بلاشبہ مغرب گزیدہ اصحاب چراغ پا ہوں گے۔ مغربی قوموں کے طور اطور خصوصاً ان کے معاشرتی نظام سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان قوموں کی مادی خوش حالی سے مسحور ہو چکے ہیں۔ ٹھیک جس طرح مسلمان معاشرہ کو مادی پستی کا صید زبوں پا کر وہ بڑے لطراف کے ساتھ پورے اسلامی نظام سے اپنی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی معاشرہ کی مادی خوش حالی فنی دائرے میں اُس کی تنگ درد کا حاصل ہوتی ہے۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اس معاشرہ کا اجتماعی نظام بھی فائق و برتر ہے۔ بنا بریں کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں اگرچہ خوش حالی کا دور دورہ ہے، لیکن اُس کے معاشرتی احوال کی منزل آج بھی اصلاح و تکمیل سے بہت دور ہے۔ مغربی اقوام اپنے اجتماعی وجود کی متعلقہ قدر کو تبدیل کرنے کا تجربہ بار بار کر چکی ہیں بایں ہمہ اس تجربے کی ضرورت ختم ہونے نہیں پاتی۔

اس نقطہ نظر سے معاشرتی ارتقاء، تلاش و جستجو اور تحقیق و تجربہ کے تسلسل

کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو باعتبار نوعیت ہمیشہ تجربی رہا ہے اور جس کے معیار عمل میں تعصبات، وقتی ضروریات اور عدنی حالات کا فرما رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرہ اپنے لیے آج تک کوئی مستقل معاشرتی تصور نہیں کر سکا۔ اس کا معاشرتی تصور تغیر پذیر جذبات، مادی ضروریات اور فنی معلومات کی پکار پر پیہم بدلتا رہا ہے؛ چنانچہ یہ تصور، بلکہ صحیح تر الفاظ میں یہ تصورات ارتقائے عام کی قیادت نہیں کرتے بلکہ خود اس کا اتباع کرتے ہیں۔ اگر معاشرتی نظریہ مستحکم و متعین نہ ہو اور واقعات سے متاثر ہو کر ہر آن بدلتا رہے اور اگر وہ معاشرتی ارتقاء کا رخ معین کرنے کے بجائے اس پر انحصار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نظریہ بالکل کھوکھلا ہے اور اس کی بنیاد فطری، معاشرتی اور اخلاقی پچائیوں سے محروم ہے۔ ایسا نظریہ نہ تو انسان کی آزادانہ مرضی کا مرہون منت ہوتا ہے اور نہ انسان کی ذاتی قدر و قیمت کی بنا پر اُسے اپناتا، اس کا احترام کرتا اور خوش دلی کے ساتھ اس کو اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حکمرانوں کے ایک گروہ کے مستبدانہ اور من مانی فیصلہ پر مبنی ہوتا ہے۔

کسی معاشرتی نظام کا قانون اور عدم استحکام اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ معاشرہ کے صرف ایک حصے کو المینان بخشا ہے جب کہ دوسرا حصہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک طبقے کے لیے تو مفید ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے مفرت رساں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک معاشرتی نظام جتنا زیادہ غیر مستحکم ہوتا ہے اتنا ہی وہ جابر و متشدد بن جاتا ہے اور اتنی ہی شدت سے اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ لہذا یہ امر اپنے دامن میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ حکمرانی شاہی خانوادہ کرتا ہے یا کلیسا۔ زمام اختیارات عوام کے ہاتھ میں ہے یا اہل کلیسا کے۔ چند خواص کی حکومت کی جگہ نام نہاد جمہوریت لیتی ہے یا سرمایہ داری کے بجائے

سوشلزم اور کمیونزم تختِ اقتدار بچھاتا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بُرائی اپنا لبادہ اور لیبل تبدیل کر لیتی ہے۔ بُرائی خرابیوں اور مظالم کی جگہ نئی خرابیاں اور تازہ نا انصافیاں لے لیتی ہیں، جو خود اپنے وقت پر نئی خرابیوں اور نا انصافیوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شیطانی چکر رواں دواں رہتا اور آنے والی نسلوں کو مصائب میں مبتلا رکھتا ہے۔ لہذا ایسا معاشرہ خواہ وقتی طور پر کیسی ہی اقتصادی خوشحالی، طاقت اور مالی بہبود سے بہرہ مند ہو اُس کی راحت و مسرت چند روزہ اور ادھوری ہے، کیونکہ وہ استحکام سے محروم اور حقیقی اخلاقی بہبود سے تہی دامن ہے۔

اگر مغرب زدگی کے حامی کسی مسلمان قوم میں برسرِ اقتدار آجائیں تو عملاً کیا صورت رونما ہوگی؟ معاشرتی استحکام، جو اسلام کا ایک نہایت امتیازی وصف ہے، اس کی جگہ مغرب میں پائی جانے والی طبقاتی و نسلی رقابت اور نفرت و عداوت لے لے گی۔ وہ انفرادی آزادی اور مساوات کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ اس ضمن میں اُس قوم کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ وہ اندر سے نواں متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں نکلے گی، لیکن دوبارہ نہ پاسکے گی۔ اسلام کی دل پذیر اخوت کی جگہ مغرب کی بے رحم اور صلح کش نفرت لے لے گی۔ وہ مشترکہ نظریہ جس نے مسلمانوں کو متحد کر رکھا ہے، غائب ہو جائے گا اور خود غرضی اور لوگوں کی وقتی ضروریات سے جنم لینے والے ہر قسم کے گریز پا، غلط اور خیالی نظریات درآئیں گے۔ اس طرح معاشرہ افراد اور طبقات میں منقسم ہو جائے گا اور انہیں ایک دوسرے سے متنفر اور پیہم جنگ و جدال کا شکار بنا دے گا۔ پھر جب پانی سر سے گزر جائے گا اُس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ قوم کو اخلاقی اور معاشرتی طور پر پرانگندہ کرنے اور



معاشرتی انارکی میں وحکیل دینے سے نہ تو اقتصادی خوش حالی اور سیاسی طاقت کا احیاء ہو سکتا ہے اور نہ اُسے غیر ملکی استیلا سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔  
عالم اسلام جس نسبت سے مغرب زدگی کا شکار ہوگا اُسی نسبت سے اُسے نقصان پہنچے گا۔ یہ تہذیبی و نظریاتی تغیر جس قدر مکمل ہوگا عالم اسلام پُر اُس کے مضر اثرات اتنے ہی شدید مترتب ہوں گے حتیٰ کہ آخر کار وہ اسے مکمل تباہی سے دوچار کر دیں گے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ جب مسلمان دانش ور مغرب کی نقالی کے متعلق سوچتے اور اُس کے اصولوں سے فیضان حاصل کرتے ہیں تو گویا اپنے واحد نصب العین بلکہ مقصد وجود ہی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسلامی اقدار کی ٹھیک ٹھیک اور بدرجہ اتم نمائندگی کریں۔ انہیں حتیٰ الامکان اس طرح اپنائیں کہ اغیار سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنی رہنمائی آپ کریں اور دوسروں کی تقلید کرنے کے بجائے خود نمونہ بنیں۔“

کمالیوں کے زیر سایہ ترک کی جس المناک انجام سے دوچار ہوا، اُسے اگر نظر میں رکھا جائے تو مندرجہ بالا اقتباس کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ شہزادہ سعید حلیم پاشا نے عالم اسلام میں مغرب زدگی کے خطرناک نتائج کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ سب کی سب آج دردناک حقیقت بن کر سامنے آچکی ہیں۔ اگر مسلمانوں کا سامان رکھنے والے حکمرانوں نے ان حکیمانہ باتوں پر دھیان دیا ہوتا تو ان کے ممالک آج جس معاشرتی انتشار اور اخلاقی بدعنوانی کا شکار ہو رہے ہیں اُس سے بچ سکتے تھے۔





## بدیع الزماں سعید نورسی

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے عظیم مصلح پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے تجدید و احیائے اسلام کی جدوجہد کی۔ ترکی کے بدیع الزماں سعید نورسی ایسے ہی ایک مجدد تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مصطفیٰ کمال آقا ترک کے بدنام عہد حکومت کے مروجہ مفاسد اور بُرائیوں سے لڑنے کے لیے مسلمانوں کو عطا کیا۔ اس امر کو مرے کئی عشرے ہو رہے ہیں، لیکن نورسی کی تحریک احیائے دین آج بھی زندہ ہے۔ ان کے پیروکاروں میں بسرعت اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ ہر طرح کی رکاوٹوں اور مزاہمتوں کے علی الرغم اسلامی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ تمام باامن ذرائع سے کام لے رہے ہیں اور ادب، تحریر، تصنیف، تعلیم اور دوسرے میدانوں میں بڑی سرگرمی سے تنگ و زدو کر رہے ہیں۔

بدیع الزماں صوبہ بطلس میں ضلع ہزان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلا کرد تھے۔ ماں اور باپ دونوں طرف سے ان کا سلسلہ نسب کردوں کے ایک قدیم ممتاز خاندان سے جاملتا ہے۔ زبردس کے تھے کہ اُن کے بڑے بھائی نے انہیں گاؤں کے مکتب میں بٹھایا۔ چند سال بعد وہ اعلیٰ تعلیم کی طلب میں اپنے مولد سے نکل کھڑے ہوئے، اُس عہد کے متعدد بڑے بڑے علمی مراکز میں پہنچے اور فیض یاب ہوئے۔ مقوڑی ہی مدت میں

قرآن کریم، فقہ اسلامی، خطابت، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علوم و فنون پر عبور حاصل کر لیا۔ اللہ نے انہیں غیر معمولی قوتِ حافظہ دی تھی؛ چنانچہ قرآن مجید کے علاوہ لغت اور اسلامی تائون کی متعدد کتابیں از بر تھیں۔ بچپن ہی سے انہیں علومِ طبیعی کی ضرورت و اہمیت کا احساس تھا؛ چنانچہ اپنی مصروف زندگی کے ہر مرحلے میں ان علوم میں روز افزوں دلچسپی لیتے رہے۔ انہوں نے مختصر سی مدت میں ریاضی، حیاتیات اور بعض غیر ملکی زبانوں میں استعدادِ اہم پہنچالی۔ رسائل و جرائد میں ان کی حیرت انگیز قابلیت اور علم و فضل کا زبردست چرچا تھا۔ وہ سیاست میں شروع ہی سے دلچسپی رکھتے تھے اور روزانہ ہر صبح اخبارات کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ، راست بازارانہ اور منضبط تھی۔ مشتبہ امور سے کلیتہً مجتنب رہتے اور اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل پیرا تھے کہ ”اگر تمہیں کسی معاملے میں کوئی اشتباہ پیدا ہو تو اُسے چھوڑ دو اور وہ کام کرو جو شک و شبہ سے پاک ہو۔“ چنانچہ جب بھی کسی بے ڈھب اور خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوتے تو رہنمائی حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے۔ مشتبہ غذا سے اجتناب میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ترکاریاں حتیٰ کہ گھاس بھی کھا لیتے، لیکن مشتبہ کھانے کو ہاتھ نہ لگاتے۔ معمول تھا کہ اپنا کچھ کھانا چیموٹیوں کو ضرور ڈالتے۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو کہا: یہ خراجِ عقیدت ہے جو میں اس نعمتی سی مخلوق کو اس کی حیرت انگیز تنظیم اور جمہوری رُوح کی بنا پر پیش کرتا ہوں۔“

ایک روز ان کی توجہ برطانیہ کے وزیر نوآبادیات کے ایک بیان کی طرف مبذول کرائی گئی۔ اُس نے کہا تھا: جب تک مسلمانوں کے پاس قرآن موجود ہے وہ ہمارے راستے میں مزاحم رہیں گے اس لیے ہمیں قرآن کو اُن کی زندگی سے خارج کر دینا چاہیے۔ بدیع الزمان نے اپنے رفقاء سے کہا: ”میں اپنی زندگی اللہ کے نام پر قرآن کریم کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کرتا ہوں۔ برطانوی وزیر کے ناپاک عزائم جیسے کچھ بھی ہوں میں اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال دینے سے بھی گریز نہ کروں گا۔“

اس عزم و اعلان کے بعد وہ استنبول چلے گئے اور قاہرہ کی جامعہ الازہر کے خطوط پر زہرا یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس اتفاق سے اسی زمانے میں جامعہ الازہر کے شیخ استنبول آئے۔ دونوں دینی رہنما متعدد مرتبہ آپس میں ملے اور اسلامی امور پر طویل گفتگو میں رہے۔

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا تو بدیع الزمان کی مٹھ بھڑا ایک سیاسی تنظیم مجلس اتحاد و ترقی سے ہوئی۔ اس جماعت نے اگرچہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے، لیکن درحقیقت ان کی قیادت فری مینوں Freemasons کے ہاتھ میں تھی۔ بدیع الزمان نے بلا تاخیر اس چیلنج کو قبول کر لیا، جو ابلی تحریک شروع کی اور اتحاد محمدی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ اس جماعت کے نعرے بھی وہی اتحاد، آزادی اور اصلاحات تھے جو مجلس اتحاد و ترقی نے اپنا رکھے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ اتحاد محمدی کی پالیسی، پروگرام اور مقاصد اسلام کے قانون اور نظریہ کے عین مطابق تھے۔ انہوں نے اپنی دعوت کو فروغ دینے کے لیے مضامین لکھے۔ لوگوں کو قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور اُسے دھچھوٹنے کی تاکید کی۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ قرآن کے نظام حیات کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام زندگی اختیار کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مغرب کی خلائی قبول کر لی گئی ہے۔ پھر ترک صرف برائے نام ترک رہ جائیں گے۔

مجلس اتحاد و ترقی کے رہنما اس تحریک کو برداشت نہ کر سکے اور مارچ ۱۹۱۹ء میں بدیع الزمان کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ۱۹ رفیق پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ جس عدالت نے ان لوگوں کو سزائے موت دی اسی نے بدیع الزمان کے مقدمے کی سماعت کی۔ پندرہ اور رفتار کو سزائے موت دینے کا اعلان کرنے کے بعد جج خورشید پاشا بدیع الزمان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: ”کیا تم بھی اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہو؟“ بدیع الزمان کا جواب عزیمت کا آئینہ دار تھا: ”اگر مجھے ایک ہزار زندگیاں بھی مل جائیں تو میں انہیں اسلام کی خاطر بصد مسرت قربان کر دوں گا۔ میں ہر اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً میں عالم



بہشت میں منتظرِ آخرت کے لیے پیرِ ملک کھڑے ہوں۔ میں اپنے انورہ قیوں کے ساتھ جانا  
چاہتا ہوں جو یہ شہرِ شہر کے تھوڑے سے نجات پانچے ہیں۔ میں آخرت کی زندگی کے لیے  
بے تاب ہوں۔ خدا اس دیہاتی کا تعمیر کر دے جو استیلا کی تیش و عشرت اور شان و شوکت کی  
دست میں زندگی بھر سنبھال رہا ہو، ایسی اسے دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا ہو، اس کی وہی کیفیت  
کیسی ہوگی؟ ٹھیک وہی میری حالت ہے۔ اسی سے تم آخرت کی زندگی سے ہمکنار ہونے کے  
لیے میری بے تابی اور بے قراری کا اندازہ کر سکتے ہو۔ مجھ پر الزام ہے کہ میں نے دہریوں، محدوں  
اور ان کے اجیرم فیروں پر سخت تنقید کی ہے۔ میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ جس طرح ایک مجرم  
کا ہندہ کسی اہلِ بند شریف انسان کو زیب نہیں دیتا اسی طرح یورپ کی ثقافت اور نظامِ حیات  
استنبول کے لوگوں کے لیے زیبا نہیں ہے۔ اعظمہ اللہ والفتح للاسلام۔

بریتِ ارمین پر مقدمہ چلایا گیا، لیکن عوام کے زبردست احتجاج پر فوجی عدالت نے انہیں  
جیل ہی میں کر دیا۔

کچھ مدت استنبول میں مقیم رہنے کے بعد وہ دمشق چلے گئے۔ وہاں مسجدِ اموی میں فاضل  
عمار کے زبردست اجتماع میں ایک جوش انگیز تقریر کی اور ان اراکین کی شخصیات کی جن میں عالمِ نو  
بالعموم اور عالمِ اسلام بالخصوص مبتلا تھا۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے خاص طور پر مندرجہ ذیل  
امور پر روشنی ڈالی۔

۱۔ قنولیت کا دور دورہ۔

۲۔ معاشرتی اور سیاسی معاملات میں دیانت کا فقدان۔

۳۔ محبت کی جگہ عداوت کا ظہور۔

۴۔ افتراق بین المسلمین۔

۵۔ کلیت پسندانہ استبداد میں اضافہ۔

۶۔ خود غرضی اور انانیت۔

بدیع الزماں نے عربوں اور ترکوں کے اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ دار و مدار اسی اتحاد پر ہے۔ انہوں نے بڑے یقین افروز انداز میں فرمایا کہ اگر مسلمانوں نے سر توڑ جدوجہد کی تو اسلامی تہذیب مغربی ثقافت کو پسا کر دے گی، کیونکہ مؤخر الذکر ثقافت انسان کے سخی جذبات، باہمی افتراق اور ہدایت الہی کے فقدان سے عبارت اور فطرۃ سمخت فساد انگیز ہے۔

سفر دمشق کے بعد بدیع الزماں دینی و دنیوی تعلیم کی ہم آہنگی پر مبنی ایک نئی اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس میں ہمہ تن لگ گئے۔ اپنا وقت اور صلاحیتیں اس مقصد کی راہ میں جھونک دیں، لیکن جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ کام پاپیہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

پہلی جنگ عظیم چھڑی تو بدیع الزماں ترک فوج میں بھرتی ہو گئے۔ انہوں نے مختلف میدانوں میں بہادری اور سرفروشی کے نمایاں کارنامے انجام دیے، چنانچہ جلد ہی ترقی دے دے کر انہیں افسر بنا دیا گیا۔ بدیع الزماں اپنے کیمپ میں قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر درس دیا کرتے جس کو سننے کے لیے سینکڑوں سپاہی اٹھاتے۔ ایک جنگ میں ان کی ٹالین کے تقریباً تمام جوان شہید ہو گئے۔ وہ اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایک نہر میں چھپ گئے۔ ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، بائیں ہمدہ ۳۳ گھنٹے تک رانگیں ہاتھوں میں لیے ڈٹے رہے۔ آخر کار روسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

ایک روز روسی جنرل نکولاس نے جنگی قیدیوں کے کیمپ کا دورہ کیا۔ جو نہی وہ پہنچا سارے قیدی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور اُسے سلامی دی، لیکن بدیع الزماں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ جنرل نے پوچھا:

”کیا تم جانتے ہو ہمیں کون ہوں؟“

بدیع الزماں نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا:

”ہاں، میں خوب جانتا ہوں، تم نکولاس نکولاش ہو، لیکن تم جو کچھ بھی ہو، مجھے کیا؟“

میں ایک مسلمان ہوں۔ میرے نزدیک مسلمان کافر سے برتر و فائق ہے۔ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، تمہاری تعظیم و تکریم نہیں کر سکتا۔“

بدیع الزمان کا فوراً کورٹ مارشل ہوا۔ فوجی عدالت نے منزائے موت دینے کا حکم دیا۔ جب روسی انہیں گولی مارنے کے لیے لے گئے تو انہوں نے درخواست کی کہ پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ان کے بعض دوستوں نے بہت کہا کہ وہ روسی جنرل سے معافی مانگ لیں، لیکن ان کا صرف ایک جواب تھا: ”شاید یہ منزا مجھے ابدی جنت میں پہنچا دے۔“

آخر روسی جنرل ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے معذرت چاہی: ”براہ کرم مجھے معاف کر دیجیے! اُس نے کہا: ”میں آپ کی جرأت اور اپنے مذہب کے ساتھ مخلصانہ وابستگی سے بے حد متاثر ہوا ہوں؛ چنانچہ آپ کی منزا مسوخ کی جاتی ہے۔“

بدیع الزماں ڈھاتی برس تک سائبیریا میں مقید رہے۔ پھر فرار ہو گئے اور پیٹرز برگ، وارسا اور ویانا کے راستے استنبول پہنچ گئے جہاں علماء و مشائخ اور عامۃ المسلمین نے ان کا پُر جوش استقبال کیا۔ ۱۹۲۰ء میں ترکی میں انقلاب آیا تو مصطفیٰ کمال آتاترک نے انہیں انقرہ آنے اور یوم استقلال کی تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ بدیع الزماں انقرہ پہنچے، لیکن یہ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہوئے کہ مصطفیٰ کمال میں ایمان و کد کا شائبہ تک نہیں؛ چنانچہ تقریب آزادی میں شرکت کیے بغیر انقرہ سے چلے گئے۔ بایں ہمہ دس نکات پر مشتمل ایک بیان پارلیمنٹ کو بھیجا جس کا اجلاس مصطفیٰ کمال کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ بیان میں کہا گیا تھا،

”پارلیمنٹ کے ارکان، اُس دن کو یاد کرو جب تم وزیر جزاکے مالک، اللہ کے حضور پیش کیے جاؤ گے۔ اغیار کو شکست فاش دے کر جو نیکو نامی تم نے حاصل کی ہے، اُسے اپنی بد اعمالیوں اور نفس کی بد کاریوں سے ملیا میٹ نہ



کرد۔ اگر تم مغربی قوموں اور غیر اسلامی طور اطوار کی نقالی کو ترجیح دو گے تو عالم اسلام اپنی مدد اور حمایت کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنے لگے گا۔“

بیان کاظم پاشا نے پارلیمنٹ میں پڑھ کر سنایا جس کا معجزہ نما اثر ہوا۔ تقریباً ایک سو ساٹھ ارکان نے وہیں بیک آواز اسلامی زندگی بسر کرنے اور پنجگانہ نماز باقاعدہ پڑھنے کا حلف اٹھایا۔ اس صورت حال سے مصطفیٰ کمال سخت بھٹایا، اُس نے بدیع الزماں کو بلا بھیجا اور کہا: ”ہمیں ایک قائد کی حیثیت سے آپ پر فخر ہے، لیکن آپ نے آغازِ کار ہی میں نماز کی اہمیت پر زور دے کر قوم میں افتراق پیدا کر دیا ہے۔“ بدیع الزماں نے سختی سے سہ زلزلہ کی: ”پاشا، نماز پہلی علامت ہے جس سے ایک مسلمان پہچانا جاتا ہے اور تم اسی کے منکر ہو۔ نماز کا منکر اللہ کا باغی ہے، بنا بریں تمہاری حکومت ناقابلِ قبول ہے۔“

مصطفیٰ کمال نے تحریک کا دامن چھینکا۔ بدیع الزماں کو مطمئن کرنے کے لیے اس سے بڑا حربہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اُس نے سوچا، چنانچہ انہیں اناطولیہ کا میر و اعظم اور دارالحکمت یونیورسٹی کی مجلسِ عالمہ کا رکن نامزد کر دیا۔ رہائش کے لیے ایک عالیشان عمارت دی، لیکن بدیع الزماں نے ان سب چیزوں کو ٹھکرا دیا، انقرض سے نکل گئے اور وان کے نزدیک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہاں انہوں نے گرد و نوار کے نوجوانوں کو جمع کر لیا اور انہیں قرآن کی تعلیم دینے لگے۔ ان کا اندازِ تعلیم بے حد مؤثر تھا۔ پہلے معافی بیان کرتے، پھر ان کے دقیق مطالب و مفہوم واضح کرتے، کربات کی فصاحت و بلاغت اور دل کشی کی نشان دہی کرتے اور دنیوی و اخروی زندگی کے سلسلے میں ان کی روحانی، مادی اور منکری اہمیت پر خاص زور دیتے۔ انہوں نے ان لوگوں پر فطرت کے اسرار اور ان مختلف طاقتوں کو بالوضاحت آشکارا کیا جو انسان کی دسترس میں ہیں اور اگر کتاب و سنت کے مطابق فطری، راست بانا اور سادہ زندگی بسر کی جائے تو ان سے بہرہ اندوز ہوا جاسکتا ہے۔

جلد ہی حکومت نے انہیں ادران کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ بدیع الزماں کو آٹھ



سال کے لیے بار لا جیل بھیج دیا گیا۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے کڑے پہرے میں قید تنہائی میں گزارا کسی دوست کو ملنے کی اجازت دی گئی نہ اعزہ و اقارب کو۔ وہ خود کھانا پکاتے اور کپڑے دھوتے تھے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جیل کے پریداران سے متاثر ہونے لگے اور آخوان کے پرجوش مرید بن گئے۔ یہیں انہوں نے قرآن کی تفسیر رسالہ نور کے عنوان سے لکھنا شروع کی۔ پہرے داروں کے ذریعے یہ رسائی جیل کی چار دیواری سے باہر پہنچتے، جن لوگوں کو ملتے اپنے ہاتھ سے ان کی نقلیں تیار کرتے اور وسیع حلقے میں پھیلاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں قلمی پمفلٹ دیہات، قصبات، شہروں، سکولوں، کالجوں اور سرکاری دفاتر میں پہنچ گئے۔ تنہائی کے ان سالوں کا ذکر کرتے ہوئے بدیع الزمان نے کہا: "جلاد ملنی، قید و بند اور قید تنہائی کے ان مصائب و شدائد میں مجھے قرآن حکیم کی صداقت پر غور و فکر کرنے اور اللہ کی رحمت سے اپنا دامن بھرنے کا موقع ملا۔"

سات سال کے بعد رہا ہوئے تو اسپارٹا چلے گئے اور وہاں کچھ مدت تک تنہا رہے۔ یہاں تک کہ انہیں ۲۰ مریدوں کے ساتھ دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی ہے۔ عسکی شہر کی فوجداری عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ بدیع الزمان نے اپنے بیان میں کہا:

"میری دلیل یہ ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی کے امکان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی الحقیقت کامیاب ہو چکی ہے یا حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیاسلائی سے کسی مکان کے جلنے کا امکان ہے، لیکن جب تک مکان کو آگ نہیں لگتی مجھے آتش زنی کا مجرم نہیں گردانا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں حکومت و اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہشمند نہیں، میں تو لوگوں کو اللہ کے راستے پر چلانا چاہتا ہوں۔ ہمارا ہمارا قرآن مجید ہے، ہمارے ہادی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارا قانون شریعت

مطبوعہ ہے۔۔۔۔۔ ہماری کوئی تنظیم نہیں ہے اور نہ ہم کسی سیاسی سرگرمی میں مصروف ہیں۔ ہمارا رسالہ نور نقیین و ایمان کا ایک مدرسہ ہے۔ اس مدرسہ کی عمارت ہے نہ لائحہ عمل، تنظیم ہے نہ مایات، منتظم ہیں نہ اجرا و اجیر یہ صرف دلوں کی جمعیت ہے، اس کی درسی کتاب قرآن مجید اور اس کی تشریح و تفسیر پر مبنی رسائل نور ہیں۔ یہ مدرسہ زمان و مکان کی حدود سے بالا ہے اور ہر مخلص مسلمان اس کا رکن ہے۔ وکیل استغاثہ کے اندازہ کے مطابق ۱۹۴۷ء میں سائے اناطولیہ میں کم از کم پانچ چھ لاکھ افراد رسالہ نور کے باقاعدہ قاری ہیں۔ یہ سب لوگ۔۔۔۔۔ مزدور، طلبہ، اساتذہ اور سرکاری ملازم۔۔۔۔۔

اپنا روزمرہ کلام بڑی مستعدی سے کرتے ہیں۔ ان میں سے آج تک ایک شخص سے بھی کسی عام بد نظمی میں حصہ لینے کا تصور سرزد نہیں ہوا۔ کسی نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی، لہذا ایسا مدرسہ جو ترک عوام کی اس قدر بھاری تعداد کے دلوں میں قائم ہے، کیا اسے کبھی بند کیا جاسکتا ہے؟ آپ کہتے ہیں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے حکومت کی منظوری حاصل نہیں ہے، نیز اس مقصد کے لیے حکومت نے ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے اور مجھے اس کام کے لیے حکومت سے وائٹنس حاصل کرنا چاہیے۔ چر خوب، اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے کے لیے وائٹنس لیا جاتے؟ کیا تم قبرستان بند کر کے موت کو ابد الابد تک روک سکتے ہو؟ تم مجھے ہیٹ نہ پہننے پر مطلع کرتے ہو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ معزز عدالت کے احترام میں اسے سر سے اتار لیتے ہو۔ یاد رکھو، صرف چند لوگ ہیں جنہوں نے اس لعنت کو برضا و رغبت اپنے سر پر اڑھا ہے، ورنہ لاکھوں آدمی ظلم و جبر کے بل پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ماسونریوں (Freemason) کو اسلام پر حملے کرنے کی کھلی اجازت ہے، مغربی ثقافت کو مقبول عام کرنے کے لیے سرکاری

طور پر شراب خوری، قمار بازی اور زنا کاری کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ نہ تو حکومت کے لیے شرمناک ہے نہ رسوا گن، البتہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قرآن کے پیغام کی تبلیغ و اشاعت اور اللہ کا کام کرنے سے روکنا نہایت ضروری ہے۔

مجھ پر جمہوریت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کیا گیا ہے، حالانکہ میں ایام طفلی ہی سے اس کا نقیب و داعی رہا ہوں۔ میں اپنا کچھ کھانا چھوڑ بیٹوں کے آگے بلاناغہ ڈالتا ہوں۔ اس لیے کہ میں ان کے جمہوری نظام کا مداح ہوں۔ میرا ایک جرم یہ بھی ہے کہ میں صوفی ہوں، حالانکہ انسان صوفی بنے بغیر توحشت میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن اللہ پر ایمان لاتے اور اس کے قوانین کی پابندی کیے بغیر آخرت کی اس مسرت بخش زندگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ تیس برس میں تین حکومتیں، دو عدالتیں، حتیٰ کہ خود مصطفیٰ کمال میری زندگی کی چھان بین کر چکے ہیں، لیکن میری ذاتی سی کمزوری بھی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ دشمن ریاست ہونے کا الزام تو بہت بڑی بات ہے۔ لہذا مجھے اپنا مشن پُر امن طریقے سے جاری رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

چند سال بعد بدیع الزماں پراکفین کی عدالتِ عالیہ میں پھر مقدمہ چلایا گیا۔ وہی پرانا الزام۔ ریاست کے خلاف بغاوت تھا، لیکن جلد ہی عدالتِ عالیہ نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیدیا۔ کیا کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ میرے پیش نظر مفاد پرستی اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہے اور میں اللہ کا کام اپنا اُتو سیدھا کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟ میں نوے برس کا ہو چکا ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ میں نے کوئی جائیداد ہی بنائی ہے۔ میری ساری زندگی جنگ کے میدانوں، جنگی قیدیوں کے کیمپوں، جیل خانوں اور عدالتوں میں پے درپے پیشیاں بھگتنے میں گزری ہے۔ مجھے دنیاوی مسترتوں سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ مجھے شہر شہر گشت کروایا گیا، اپنے خاندان اور احباب



کے ساتھ ملنے جلنے سے روک دیا گیا۔ ایسی زندگی پر تو ایک عام انسان موت کو ترجیح دیتا ہے، لیکن میں مسلمان ہوں اور اپنے دین پر ایمان محکم رکھتا ہوں، مسائلِ نورِ مکہ کو میں نے پانچ لاکھ مسلمانوں کو عذابِ آخرت سے بچا لیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں جنت کا مشتاق ہوں نہ جہنم سے خوف کھاتا ہوں۔ اگر زمین قرآن کے ماننے والوں سے خالی ہو تو میں جنت میں رہ کر بھی مضطرب اور پریشان رہوں گا۔ اس کے برعکس اگر میں دیکھوں کہ میرے ملک میں دینِ حق محفوظ و سلامت ہے تو آتشِ جہنم میں جلتے ہوئے بھی میں مسرور و شادماں رہوں گا۔

یہ ایک معروف قانونی اصول ہے کہ کسی شخص کو ایک ہی جرم میں دوبارہ سزا نہیں دی جا سکتی؛ چنانچہ بعض جرموں اور اکثر و کلاء کو اس مقدمے کے جواز کے بارے شک ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شدید حفاظتی اقدامات کے باوجود وہی جج جنہوں نے میرے مقدمہ کی سماعت کی تھی، میرے مداح اور میرے مشن کے حامی بن گئے۔

لیکن جیسا کہ کلیت پسند آمریتوں کا خاصہ ہوتا ہے کمایوں کی ظالم لادینی حکومت کے لیے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا جذبہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ جو پروگرام لے کر اٹھی تھی اور جو مقاصد اپنے سامنے رکھتی تھی، یہ جذبہ اُس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ وہ بدیع الزماں کو آزادی اور دعوتِ دین کی اشاعت و تبلیغ سے محروم کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ آخر کار مقدمہ عدالتِ مرافعہ کو بھیج دیا گیا، جہاں وہ اگلے بیس ماہ تک زیرِ سماعت رہا۔ اس اثناء میں یہ بوڑھا مجاہد اسپارٹا کے جیل میں پڑا سڑتا رہا۔

وفات سے صرف دو مہینے پہلے بدیع الزماں اجازتِ خصوصی سے پہلے انقرہ گئے اور پھر استنبول۔ جہاں لوگوں نے ان کا دلہانہ استقبال کیا۔ انجارات کا رویہ بھی گرم جوش تھا۔ پہلے صفحے پر ان کی تصویر شائع کی جس میں انہوں نے عمامہ باندھ رکھا تھا، لیکن ماسوئی اور لیساری (leftist) عناصر ان پر پوری سفاکی سے ٹوٹ پڑے؛ چنانچہ انہیں دوبارہ حوالہ زنداں کر دیا گیا۔



وسطِ رمضان میں وہ اچانک شدید بیمار ہو گئے۔ اپنے دو شاگردوں سے کہا کہ انہیں  
 خفیہ طور پر ارنالے جائیں، جہاں وہ ۲۷ رمضان ۱۲۷۹ھ کو وفات پا گئے۔ انتقال کے وقت  
 ۸۶ برس کے تھے۔ اس طرح اسلام کی راہ میں جلا وطنی اور قید و بند کے مصائب جیتے ہوئے  
 بدیع الزمان کی مجاہدانہ زندگی ختم ہو گئی۔ وہ زندگی جو ہمیشہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد پر عمل پیرا تھی:  
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتُوا اللَّهَ وَأَبِئْتُمْ إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدہ: ۲۵)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے حضور میں باریابی کا ذریعہ تلاش  
 کی راہ میں جدوجہد کرو شاید کہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ۔“

# سید جمال الدین افغانی علیہ رحمۃ اللہ

## انجامِ عالمِ اسلامی کے معمار

غالباً جمال الدین افغانی جسے بڑھ کر عالم اسلام کی کسی شخصیت نے معاصر تاریخ پر اثر نہیں ڈالا۔ وہ ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے شہر اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مسجد کے مکتب میں پائی۔ ذرا بڑے ہوئے تو افغانستان اور ایران میں فاضلِ اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تمام علوم اسلامی میں دستگاہ حاصل کر لی۔ ہندوستان میں بھی وہ ڈیڑھ برس رہے۔ یہاں انہوں نے کچھ انگریزی بھی پڑھی اور مغربی علوم کا مطالعہ بھی کیا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ حج کرنے مکہ معظمہ گئے۔ پھر اپنے وطن واپس چلے آئے اور کئی سال تک مقیم رہے، حتیٰ کہ ناسازگار سیاسی حالات نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

افغانی کی زندگی کا اہم ترین دور وہ ہے جو انہوں نے قاہرہ میں گزارا۔ یہاں وہ جامعہ الازہر میں پڑھتے بھی تھے اور طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ اور تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ فلسفہ دینی کو اپنا کراہیائے اسلامی کا کام کیونکر انجام دیا جاسکتا ہے؟ جدید تعلیم خصوصاً طبی علوم کی تحصیل ضروری ہے اور معاصر علم اور قرآنِ کریم کی تعلیمات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کا موضوع بحث یہ تھا کہ عالم اسلام کی سیاسی آزادی کو مغربی جہانگیری کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ایک مضبوط قیادت

کے پرچم تلے متحد و مجتمع ہوں۔ افغانی کا نقطہ نظریہ تھا کہ اسلام کی "حقیقی روح" اس کے متحرک کردارہ "جدید تصورات" کو جذب کرنے کے اشتیاق اور اسلامی نظریات کی لبرل تعبیر اور انہیں جدید افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں پرشیدہ ہے۔ افغانی نے اپنے خطبات میں عالم اسلام کے شاندار ماضی، اس کی عظیم سیاسی بالادستی، مادی آب و تاب اور ثقافتی ذہنی کارناموں پر مفصل بحث کرتے۔ اس طرح اپنے شاگردوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے کہ اسلامی اصولوں کی پیروی کا لازمی نتیجہ دنیا اور آخرت میں خوش حالی اور کامیابی کی صورت میں نکلے گا۔ لازم ہر ہی میں ان کی ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوتی جو ان کے ممتاز ترین شاگرد اور معاون ثابت ہوئے اور آگے چل کر جامع کے شیخ اور مصر کے مفتی بنے۔ اس طرح ملک کے ایک اہم ترین منصب پر فائز ہو گئے۔

افغانی نے انقلابی نظریات ہی کچھ کم خطرناک نہ تھے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ برطانوی سامراجیت کے سخت مخالف تھے، چنانچہ مصر کے حکمران توفیق پاشا نے ۱۸۷۹ء میں انہیں ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مصر سے اخراج کے بعد وہ ہندوستان گئے اور حیدر آباد کن میں مقیم ہو گئے۔ یہیں انہوں نے اپنی کتاب "ابطال الملحدین" لکھی۔ افغانی اگرچہ جدید علوم کی تحصیل کے زبردست حامی تھے تاہم سرسید احمد خاں کی اسلام کو فوق الفطرت تصورات سے محروم کر دینے کی مساعی اور برطانیہ کے ساتھ اشتراک و تعاون کی روش کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے سرسید کی اس روش اور ان کے افکار و نظریات پر شدید تنقید کی۔

۱۸۶۴ء میں جمال الدین افغانی پیرس میں مقیم تھے کہ ان کے شاگرد اور ساتھی شیخ محمد عبدہ بھی پہنچ گئے۔ انہیں عرب قوم پرستوں کی بغاوت کے ساتھ ہمدردی کے جرم میں مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ اب استاد اور شاگرد دونوں نے مل کر عربی کا مشہور ہفت روزہ اخبار "العروۃ الوثقی" نکالا۔ اخبار کا مقصد تمام مسلمان قوموں کو بیدار کرنا اور مغربی غلبے اور استیلاء کے خلاف متحد کرنا تھا۔ برطانوی حکومت نے مصر اور ہندوستان میں "العروۃ الوثقی" کا داخلہ بند کر دیا اور جن لوگوں کے

پاس یہ اخبار آتا تھا، ان کے خلاف شدید اقدامات کیے۔ چونکہ اخبار کے زیادہ تر خریدار انہی دو ملکوں میں تھے اس لیے اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی اور بند ہو گیا؛ تاہم بند ہونے سے پہلے وہ عالم اسلام کے ایک کونے سے دوسرے تک ذہنوں میں پھیل برپا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اخبار بند ہونے کے بعد جمال الدین افغانی ۲۰ روس تشریف لے گئے، جہاں وہ چار سال مقیم رہے اور اخبارات میں متعدد مضامین شائع کرتے رہے۔ ان مضامین کا مقصد عالم اسلام کو برطانیہ کی ناپاک ریشہ دوانیوں سے متنبہ کرنا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں شاہ ایران یورپ کے دورے پر گئے تو جمال الدین افغانی ۲۰ میونخ (جرمنی) میں تھے۔ شاہ سے ملاقات ہوتی تو اُس نے انہیں وزارت جنگ کا منصب قبول کرنے کی ترغیب دی۔ افغانی ۲۰ ایران آگئے، مغربی سامراجیت کے خلاف ان کی فصیح و پرجوش تقریروں نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا اور وہ افغانی ۲۰ کے گرد جمع ہونے لگے۔ شاہ کو فکر پیدا ہو گیا کہ کہیں افغانی کی شخصیت اُس کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائے؛ چنانچہ اُس نے انہیں ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ جمال الدین افغانی ۲۰ ترکی چلے گئے اور اپنی وفات (۱۸۹۷ء) تک قسطنطنیہ میں قیام پذیر رہے۔

جمال الدین ۲۰ نے اپنی ساری زندگی دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ محدود قوم پرستانہ تعصبات سے بالکل آزاد تھے۔ وہ ہر ملک ملک ماست کے قائل تھے اور اقبال کی طرح اسلام کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔

دلفریڈ کنٹوبیل سمٹو اپنی کتاب (Islam in Modern History)

میں لکھتے ہیں:

وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ صورتِ حال کے ہر پہلو کو ٹھیک ٹھیک جانپ

لیتے تھے۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ کسی ایک مسلمان ملک کو نہیں سارے

کے سارے عالم اسلام کو مغرب کے طاقت ور اور متحرک وجود سے زبردست خطرہ





عالم گیر خلافت کے پرچم تلے مسلمانوں کے اتحاد کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ تاہم مصر، ترکی اور ایران میں ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ وہ جس قسم کی ابن الوقتی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ قیادت کی ہمیشہ پر زور مذمت کرتے رہے تھے اسی کے سائے میں ہند اور کٹر قوم پرستی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مسلمانوں کو اگر اسلام کے اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے دی جاتی ہے کہ اس طرح وہ سیاسی قوت، اقتصادی خوشحالی اور سائنسی یا فنی مہارت سے ہمکنار ہوں گے تو یہ بجائے خود اسلام کی بے حرمتی اور توہین ہے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ اپنے جلو میں بے شک ذہنی فوائد بھی لے کر آئے گی، لیکن یہ ذہنی فوائد نہ تو کسی سچے اور مخلص مسلمان کی آخری منزل ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ مسلمان کو کسی چیز سے اول و آخر کوئی سروکار ہے تو وہ آخرت کی زندگی میں کامیابی اور نجات ہے۔ افغانی نے اسلام کے ذہنی کامرانہوں کی کلید سہونے پر جوردور یاد دہر حقیقت مادہ پرستانہ نقطہ نظر تھا۔ اسی تناقض نے ان تمام بھیانک اور مکرہ رجحانات میں اضافہ کیا جن کا آج عالم اسلام میں دور دورہ ہے اور جن کے خلاف افغانی نے بڑی شدید جدوجہد کی تھی۔



## سید رشید رضا اور تحریکِ معارف

سید محمد رشید رضا شیخ محمد عبدہ کے نہایت مختص اور ممتاز شاگرد، سوانح نگار اور ان کی تعلیمات کے نہایت مستند ترجمان تھے۔ وہ شام کے ایک گاؤں کلامون میں ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان سادات سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے علم و فضل، اتباعِ کتاب و سنت میں سارے علاقے میں ممتاز تھے۔ اُس کے پاس اسلامی کتب کا عظیم الشان ذخیرہ تھا۔ گاؤں کی مسجد سید رشید رضا کے اجداد میں سے ایک بزرگ نے تعمیر کروائی تھی۔ جس گھر میں سید رشید رضا پیدا ہوئے اور بچپن گزارا وہ اس مسجد سے کچھ فاصلے پر تھا۔ بچپن کے زمانے کا جو نقش اُن کے ذہن پر ہمیشہ اجاگر رہا وہ مؤذن کی آواز تھی۔ یہ آواز اتنی موثر اور دلکش تھی کہ گاؤں کے عیسائی تک اپنے کام سے ہاتھ روک لیتے اور تحریزِ عالم میں سُسنے لگتے۔

رشید رضا نے اسی مسجد کے مکتب میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ قرآن حفظ کیا، لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب کتاب سیکھا۔ شیخ محمد عبدہ بچپن میں قوتِ طلب کھیلوں کے شوقین تھے، وہ زبردست شہسوار اور پیراک تھے۔ رشید رضا اپنے استاد کے بالکل برعکس تھے۔ بچوں کیساتھ کھیلنے کودنے کے بجائے اپنا وقت کتابوں کی صحبت میں تنہا گزارتے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر چکے تو ان کے والد نے اسلامی موضوعات کی اضافی تعلیم کے لیے ایک اتالیق رکھ لیا۔ سترہ برس



کی عمر میں انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے طرابلس بھیج دیا گیا۔

زمانہ طالب علمی میں امام غزالی رحمہ کی کتاب "احیائے علوم الدین" ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ اگے چل کر انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا کہ یہ کتاب میرے دل پر براہ راست اثر انداز ہوئی، تاہم وہ انقلابی مجلہ "العروة الوثقی" تھا جس نے ان کی زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔ یہ مجلہ جمال الدین افغانی رحمہ اور شیخ محمد عبدہ پیرس سے نکلتے تھے۔ اس کی دعوت یہ تھی کہ دنیا بھر کے مسلمان مغربی سامراج کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں اور عظمتِ رفتہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ سید رشید رضا کو اس مجلہ کی خبر محض اتفاقیہ طور پر ہوئی۔ ایک شام وہ اپنے دوستوں کی ایک محفل میں شریک ہوئے۔ اس محفل میں لائپٹن کی مدم روٹنی میں ایک شخص بلند آواز سے "العروة الوثقی" پڑھتا اور باقی خاموش بیٹھے سنا کرتے تھے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی اس پیکار کو سن کر یہ نوجوان طالب علم بے قرار ہو گیا اور جب تک اس مجلہ کی مکمل جلد اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں سے نہ مل گئی چین سے نہ بیٹھا۔ اس نے اس کا ایک ایک شمارہ اول سے آخر تک جوش انگیز جذبے کے ساتھ پڑھا۔

۱۸۹۷ء میں سید رشید رضاؒ نے "عالم" کی سند حاصل کر لی؛ چنانچہ طرابلس میں تعلیم مکمل کرتے ہی استنبول جانے اور جمال الدین افغانی رحمہ کے ساتھ اچھلے اسلام اور مغربی سامراجیوں کے خلاف عالم اسلام کو متحد کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا، لیکن اسی سال افغانی رحمہ انتقال کر گئے۔ اس طرح ان کے منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ گئے، تاہم افغانی رحمہ کا انتقال انہیں اپنی زندگی کے نویافتہ مشن سے باز نہ رکھ سکا۔ اب سید رشید رضاؒ نے قاہرہ جانے اور شیخ محمد عبدہ کے حلقہ تلامذہ سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کے والدین نے اپنے صاحبزادے کے اس فیصلے کی مکمل حمایت و تائید کی۔ رشید رضا رحمہ شیخ محمد عبدہ کی پیاری شخصیت، بلند کرداری اور تعصوبیت سے بچد متاثر ہوئے۔ اس طرح استاد و شاگرد نے باہمی تعاون سے جمال الدین افغانی رحمہ کا کام جاری رکھا۔ اس گہری رفاقت میں وقت کی

دفتر کے ساتھ ساتھ اصناف ہر تاج چلا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں شیخ محمد عبیدہ فوت ہو گئے اور سید رشید رضاؒ اپنے استاد کے کام کو جاری رکھنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

برطانوی حکومت نے ”العروة الوثقی“ بند کر دیا تو سید رشید رضاؒ نے ۱۸۹۱ء میں اپنا مجلہ ”المنار“ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں یہ ہفت روزہ تھا، مگر جلد ہی ماہوار شائع ہونے لگا۔ اس کا مقصد ”العروة الوثقی“ ہی کے نظریات کی تبلیغ و اشاعت تھا، لیکن چونکہ برطانوی حکومت کے سامنے میں اشتعال انگیز سیاسی تحریک کا جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا اس لیے اسے اپنے پروگرام سے خارج کر دیا۔ المنار کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک حصہ شیخ محمد عبیدہ کی تفسیر قرآن اور ان کے فتاویٰ کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ زیادہ تر مضامین خود سید رشید رضاؒ کے قلم سے ہوتے تھے، تاہم اس کے قلمی معاونین میں مصر اور متعدد ملکوں کے ممتاز اصحاب قلم مثلاً امیر شکیب ارسلان اور فرید و جیدی وغیرہ شامل تھے۔ علاوہ بریں عالم اسلام کے ہر حصے سے تعلق رکھنے والے ہمدرد اہل قلم بھی حصہ لیتے تھے۔

اپنے کیریئر کے آغاز ہی سے رشید رضاؒ نے اس اصلاحی لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جو ان کے استاد سے مرتب کیا تھا۔ یہ لائحہ عمل مندرجہ ذیل امور پر مشتمل تھا،

- ۱۔ اسلام کو ناسد اثرات خصوصاً توہمات اور تصوف کے مختلف سلسلوں کی بے اعتدالیوں سے پاک صاف کرنا۔

- ۲۔ عصر جدید کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی اصلاح۔

- ۳۔ فکر جدید کی روشنی میں اسلام کی تعبیر نو۔

- ۴۔ یورپی اثر و نفوذ اور مسیحی حملوں کے خلاف اسلام کا دفاع۔

شیخ محمد عبیدہ کے نزدیک تیسرا نکتہ اولیٰ اہمیت رکھتا تھا۔ سید رشید رضاؒ نے اپنی ساری توجہ جو تین نکتے پر مرکوز کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ استاد اور شاگرد کے نظریات میں اختلاف بڑھتا چلا گیا۔

شیخ محمد عبیدہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے بدترین دشمن یورپ کے وہ مسیحی مشنری ہیں جو مصر اور  
دوسرے مسلمان ملکوں کی پسماندگی کا ذمہ دار اسلام کو گمراہ دانتے ہیں، لیکن اب یہی الزامات خود مغرب زدہ  
مصریوں کے فکر و ذہن کا اہم حصہ بن چکے تھے۔ اس لیے رشید رضا کی حتمی رائے یہ تھی کہ اصل خطرہ  
داخلی ہے اور اس خطرے سے نبرد آزما ہونا ہی سب سے بڑا کام ہے۔ (Nadav Safran) مکتبہ ہے۔

رشید رضاؒ اور المناری فطری طور پر مسلمانوں میں کام کرنے والی جدید قوم پرست  
تحریکوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کسی ایک معاملے میں نہیں بلکہ بہت معاملوں  
میں سید رضاؒ مصر کے ان چند مسلمان مفکرین میں سے تھے جنہوں نے اس خطرے کو  
ابتدا ہی سے اور صاف طور پر بھانپ لیا تھا جو قوم پرستی کے تصور کے ہاتھوں  
اسلامی مبادی و عقائد کو درپیش تھا۔ انہوں نے ہمیشہ قوم پرستی کے ان  
نظریاتی پہلوؤں کی مذمت کی جو پچھلی صدی کے اواخر سے مصر اور دوسرے عرب  
ملکوں میں رواج پذیر چلے آ رہے تھے۔ سید رضاؒ کہا کرتے، مغرب زدہ قوم پرستوں  
کی اس خواہش سے بڑھ کر خطرناک شے اور کوئی نہیں ہے کہ اسلامی اتحاد کے  
جذبے کی جگہ قومی و نسلی افتخار کو دے دی جائے۔ ان کے نزدیک قوم پرستی  
مسلمانوں میں انتشار کا نیا دروازہ کھولنے ہی کے مترادف نہ تھی بلکہ وہ اس کو  
ارتداد کے لگ بھگ قرار دیتے تھے۔ سید رضاؒ نے قوم پرستوں پر نکتہ چینی  
کرتے ہوئے بڑے طنز و انداز میں لکھا: اگر ایک مسلمان اور ایک عرب اُس  
ملک کی خاک سے تعلق نہیں رکھتے جس سے وہ رکھتے ہیں تو یہ قوم پرست انہیں  
اجنبی اور بیگانہ قرار دیتے ہیں۔ ایسا بیگانہ کہ ان کے نزدیک حجاز یا شام کا  
شرعیہ (اولادِ رسولؐ) چین کے کسی کافر سے بہتر نہیں ہے۔ سید رضاؒ  
خود ان کی اپنی زبان میں استدلال کرتے ہوئے کہتے: کیا یہ لغوبات نہیں ہے



کہ یہ لوگ بدیسی نظریات کی غلامانہ جستجو میں ان تمام چیزوں کو طیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں جو کسی قوم کی قوتِ تخلیق اور علامتوں کو جو دین میں لاتی ہیں۔

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹا تو سید رشید رضاؒ نے ان کی خدمت کی اور کہا کہ یہ محمدین کا ایک گروہ ہے جو فراماسی (Freemasonry) کے زیر اثر ہے اور انہی کے اشارے پر چل رہا ہے۔ مصطفیٰ کمال آتارک نے اصلاحات نافذ کیں تو سید رشید رضاؒ نے ان کی بھی اسی شد و مد سے مخالفت کی خصوصاً عربی زبان کے خلاف اس کی ہم کے خوب لیتے بیٹے اور اسے کھلی بے اعتقادی اور ارتداد قرار دیا۔ ۱۹۲۵ء میں شیخ علی عبدالرزاق نے ایک مقالہ شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ اسلام کا جزد نہیں ہے اور مصر کو چاہیے کہ وہ ترکی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مکمل لادینی قومی ریاست کی صورت اختیار کرے۔ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر طحطاہ حسین نے زمانہ جاہلیت کی شاعری پر اپنی بدنام زمانہ کتاب لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں قرآن و سنت کے مستند ہونے کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ سید رشید رضاؒ نے ان دونوں کتابوں پر بڑی سخت تنقید کی اور المنار میں پے در پے ادارے قلم بند کیے اور انہیں بد عقیدگی قرار دیا۔

اپنے کیرئیر کے اس مرحلے میں سید رشید رضاؒ پر یہ حقیقت صاف طور پر آشکارا ہو گئی کہ موجودہ صورت حال کی ذمہ داری بڑی حد تک اُن کے استاد کے مرعوبانہ استدلال کے بوسے پن پر عاید ہوتی ہے۔ بایں ہمہ چونکہ وہ اپنے استاد کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق رکھتے تھے اس لیے اُن پر براہِ راست زبانِ تنقید دراز کرنے سے ہمیشہ استراز کیا، لیکن استاد اور شاگرد میں بڑا واضح فرق تھا اور آپس میں کوئی مشابہت نہ تھی۔

۱ Egypt in Search of a Political Community,  
Nadav Safran, Harvard University, Press, 1961, p 82.



اپنے استاد کی تعلیمات میں انہیں سب سے بڑا نقص یہ نظر آیا کہ شیخ محمد عبدہ نے احادیث کی بڑی تعداد کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ جدید تحقیقیت کی روشنی میں قرآن کریم کی تعبیر ہی اصل اسلام ہے۔ رشید رضا خوب سمجھتے تھے کہ ان کے استاد کی یہ تعلیم اسلامی احیاء کی امیدوں پر ضرب کاری ہے کیونکہ اس سے مغرب زدہ لوگوں کو قرآن و حدیث کے ساتھ من مانے تعلیم کی گھلی چھٹی مل جاتی ہے، چنانچہ سید رشید رضا نے لادینی اور ہیومنسٹ فلسفے کی مذمت کی اور قرآن و سنت کو بلا چون و چرا لفظ بہ لفظ قبول کرنے پر زور دیا۔

ترکی میں جمہوری حکومت کے ہاتھوں عثمانی خلافت کی تباہی کے بعد سید رشید رضا نے اپنی ساری توجہ بحالی خلافت پر مرکوز کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس اسی مقصد کے لیے منعقد ہوا۔ اس میں جن ممتاز ترین مندوبین نے شرکت کی ان میں سید رشید رضا بھی تھے۔ اس وقت ان کے خیال میں شاہ ابن سعود کی حکومت اسلام کی نشاۃِ جدیدہ کی روشن ترین توقعات کا مرکز تھی۔ انہی توقعات کے نتیجے میں انہیں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مکتب فکر کی اس تعبیر نے اپنی جانب کھینچ لیا جو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور عرب کے مصلح محمد بن عبد الوہابؒ نے پیش کی تھی۔

شیخ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید کے مابین نمایاں ترین امتیاز مغربی تہذیب کے بارے میں ان کا طرز عمل تھا۔ شیخ یورپ اور اس کی ثقافت کے پُر جوش مداح تھے۔ وہ اکثر انگلستان اور فرانس جاتے رہتے تھے۔ یورپ کے بعض نامور اشخاص کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط تھے۔ وہ زندگی بھر اس بات پر زور دیتے رہے کہ فکر جدید کی روشنی میں اسلام کی تعبیر نو کی جائے۔ ان کے برعکس سید رشید رضا کے دل میں جدید مغرب کے خلاف شدید نفرت و عداوت پروان چڑھتی رہی۔ ایک مرتبہ انجمن اقوام میں شام پر فرانس کی جارحیت کا مسئلہ پیش کرنے کے لیے جینوا گئے۔ اس کے علاوہ بھی کئی بار یورپ کا سفر کیا، لیکن جب بھی وہ یورپ گئے کسی شدید ضرورت کے تحت گئے۔ اپنے استاد کے برعکس یورپینوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم کرنے سے ہمیشہ محترز رہے۔

سید رشید رضاؒ نے بحالی خلافت اور قانون شریعت پر مبنی ایک خالص اسلامی ریاست کے ظہور و قیام کی جو امیدیں اپنے دل میں پالی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں، چنانچہ اکثر مسلم و غیر مسلم مبصرین کی غلط طور پر یہ رائے ہے کہ سید رشید رضاؒ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ زیادہ سے زیادہ چند دانشوران سے متاثر ہو کر کے ندف سفران (Nadav Safran) رقمطراز ہے:

• ان کی تنقید پسندی (Revisionism) قدامت پرستوں کے لیے

نہایت جرأت آزمائی تو ان کی اختیار پسندی (Puritanism) عامۃ الناس کے لیے حد سے زیادہ خشک۔ اسی طرح ان کی بندشیں اور قیود مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بہت سخت تھیں۔ ان کی پوزیشن اس قدر کمزور ہو گئی کہ جب ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے تو بہت کم لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو سکی ہے۔

بے شک مصر میں جنم لینے والے رجحانات حوصلہ شکن تھے اور سید رشید رضاؒ کی کامرانی کے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے، لیکن صورت حال اس قدر مایوس کن نہ تھی جس قدر کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے۔ سید رشید رضاؒ کے حلقہ احباب و معادین میں بلا ناغہ شریک ہونے والوں میں ایک ذہین نوجوان بھی تھا جو اسلام کی عظمت اور نشاۃ ثانیہ کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس کا نام شیخ حسن البناؒ تھا اسی نوجوان نے آگے چل کر الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی جو عرب دنیا میں سب سے بڑی اور متنازعہ فیہ تحریک ہے۔ یہ حسن البناؒ ہی تھے جنہوں نے سید رشید رضاؒ کے انتقال پر المنار کی ادارت اور اشاعت کا کام سنبھالا۔ یہ حسن البناؒ ہی تھے جنہوں نے زبردست جوش و جذبہ کے ساتھ سید رشید رضاؒ کے پروگرام کے انتہائی ضروری پہلوؤں کی تجدید کی اس

۱ Egypt in Search of a Political Community, op. cit., p. 34.

طرح عملیہ ثابت کیا کہ ان کی زندگی بھر کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

---

## شیخ حسن البناؒ

مصر کے قلعے محمودیہ میں ۱۹۰۶ء میں وہ بڑا پیدا ہوا جس کے مقتدر میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی راہ کا پرچم جلا ہونے لگا دیا تھا۔ یہی وہ بڑا تھا جسے جدید دور کی عرب دنیا شیخ حسن البنا کے نام سے جانتی ہے۔

حسن البنا نے ایک ایسے دیندار مسلمان گھرانے میں پرورش پائی کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسلام میرا باپ ہے۔ ان کے والد خود اپنے دور کے زبردست عالم اور صاحبِ درجہ و تقویٰ بزرگ تھے۔ وہ باہر گھڑی ساز تھے اور اسی پر پورے خاندان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ یہ ایک خاصا خوش حال گھرانہ تھا۔ وہ رات کے وقت کام کرتے تھے۔ دن بھر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے، مقامی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے اور وعظ کہتے۔ فراغت کے اوقات اپنے کتب خانے میں گزارتے۔ فقہ اسلامی سے ان کو خاص طور پر دلچسپی تھی۔ مولانا امام ماکہؒ اور مسند امام شافعیؒ ان کی نہایت پسندیدہ کتابیں تھیں۔ انہوں نے مسند امام احمد بن حنبلؒ کی شرح بھی لکھی تھی۔ حسن البنا نے قرآن کریم اپنے والد ماجد ہی سے حفظ کیا۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو باپ نے اپنے کتب خانے کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اجازت دیدی کہ وہ جو کتاب چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح حسن البنا نے خالص اسلامی تعلیم



اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی۔ عربی زبان پر انہیں زبردست قدرت تھی۔ اس کے سوا اور کوئی زبان انہوں نے نہیں سیکھی۔

اسلام کی خاطر جوش و جذبہ اور قیادت کی فطری صلاحیت بچپن ہی سے آشکارا ہونے لگی۔ سبھی چھوٹے سے تھے کہ حسن البناء اور ان کے بھائی نے ایک انجمن "امریا المعروفہ" نامی عن المنکر قائم کی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک اشتہار لکھا جس میں مردوں کو نصیحت کی کہ وہ سورنہ کی انگشتریاں یا ریشمی کپڑے نہ پہنیں۔ یہ اشتہار مساجد کے دروازوں پر چسپاں اور شہر کے بڑے بڑے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ بارہ برس کی عمر میں ہم حسن البناء کو نماز پڑھاتے اور اذان دیتے دیکھتے ہیں۔ وہ صبح صادق کے وقت اٹھتے، اگلی کوچوں میں گشت کرتے، گھر گھر جا کر دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دیتے، لوگوں کو جگاتے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ وہ مؤذنین کو بھی بیدار کرتے۔ رمضان کے علاوہ رجب اور شعبان کے مہینوں میں بھی روزے رکھتے۔ گھر میں ہوتے یا مدرسے اور کوچہ و بازار میں، قرآن کریم در زبان رہتا۔ سولہ برس کے تھے کہ ان کے والد نے انہیں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا جہاں اساتذہ کو تربیت دی جاتی تھی۔ قاہرہ پہنچے تو لوگوں کو اخلاقی انحطاط اور اسلام سے بے اعتنائی کا شکار دیکھ کر سخت برہم ہوتے۔ ابھی وہ دارالعلوم میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی گمراہ کن کتاب "جاہلی عرب کی شاعری" لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن و سنت کو مشکوک اور ساقط الاعتبار ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔ انہی دنوں شیخ علی عبدالرزاق کی بدنام زمانہ کتاب "اسلام اور حکومت کے بنیادی اصول" شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کو لادینیت اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ادھر اخبارات اور جرائد میں "مصر یورپ کا حصہ ہے" ایسے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اُدھر قوم پر ملک کو ثقافتی فیضان سے بہرہ اندوز کرنے کے لیے فرعونوں کے دور کی طوط پٹنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ انا ترک نے ترک کی کہ مسلمانوں پر مغرب زدگی کی جو لعنت بزورِ قوت مستطی تھی اس کی نقالی کا

لاقتنا ہی شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ حسن البنا نے جب دیکھا کہ مصر کی انتہائی معزز اور بااثر شخصیتیں  
تجدد پسندوں کی صف میں شامل ہو چکی ہیں اور عوام الناس کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں تو بے حد  
مضطرب ہوئے۔ اسی غم و اندوہ کے عالم میں وہ تسکین قلب کی تلاش میں سید رشید رضاؒ اور ان  
کے شاگردوں کی مجلس میں پہنچے۔ انہی مجالس میں ان کے دل میں ایک ایسی عظیم و منظم تحریک شروع  
کرنے کا خیال پیدا ہوا جو جدید دور کی اس تاریک خیالی کو بلیا میٹ کر کے رکھ دے اور اہل وطن  
کے دل میں ایک ایسی لگن پیدا کر دے کہ وہ ان کی شخصی اور عوامی زندگی کا رہنما بن جائے۔ جب آخری  
امتحان میں طلبہ سے پوچھا گیا کہ مستقبل کا کون سا منصوبہ ان کے پیش نظر ہے، تو حسن البنا  
نے لکھا:

”میں مشیر اور استاد بنوں گا۔ صرف بچوں ہی کو تعلیم نہ دوں گا بلکہ ان کے  
والدین کو بھی اسلام سکھاؤں گا اور اس راہ میں دن رات ایک کر دوں گا۔ مینا میں  
لکھوں گا، تقریریں کروں گا، مذاکرات میں حصہ لوں گا اور قریہ قریہ شہر شہر کا دورہ  
کروں گا۔ اول الذکر کام کو جذبہ شکر و رجاء کے ساتھ اور موخر الذکر کو صبر و ثبات  
اور سرفروشی کے ساتھ انجام دوں گا۔ اس کے لیے میں بالکل تیار ہو چکا ہوں۔  
ایک مصلح کے لیے یہ دونوں کام ضروری ہیں اور اس کی کامیابی کا راز انہی میں  
پہنا ہوا ہے۔ ایک مصلح کے عملی وسائل میں دو باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ طویل  
عرصے تک مطالعہ اور اسلامی نظریات کو اپنانے اور ان سے ہمدردی رکھنے  
والے لوگوں کے بارے میں علم۔ میں نے ایک جسم، جو چھوٹا اور بولا چلا ہونے کے  
باوجود سختیاں پہنے کا خوگر اور مشکلات سے مانوس ہے اور ایک جان خدا کے  
حوالے کر دی ہے۔ یہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس کو میں  
یہاں ضبط تحریر میں لارہا ہوں، جس کا گواہ میں اپنے استاد کو بنانا ہوں، جس پر  
سوائے ضمیر کے کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی اور جو خدا بے لطیف و خیر کے سوا کسی

فہم وادراک میں نہیں آسکتا۔ وَمَنْ آذَنِي بِمَا حَاذَكَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَسَيُؤْتِيهِ  
أَجْرًا عَظِيمًا۔

حسن البنا نے ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم سے سند حاصل کی۔ اُس وقت وہ ۲۱ برس کے تھے۔  
وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور اپنی جماعت میں اول آتے تھے۔ جلد ہی اسماعیلیہ کے سرکاری  
پرائمری سکول میں استاد مقرر ہو گئے۔ اسماعیلیہ منتقل ہونے چند ماہ گزرے تھے کہ انہوں نے  
”الاخوان المسلمون“ کی بنیاد رکھی۔ اس عظیم الشان تحریک کی اولیں اینٹ رکھنے میں ان کے  
چھ وفادار ساتھی اور طالب علم بھی اُن کے ساتھ شریک تھے۔ حسن البنا اکثر بڑے بڑے قہرہ خانوں  
میں جاتے اور جہنم کی ہولناکیوں اور جنت کی مسرتوں کا ذکر کرتے۔ اُن کی آواز بڑی ہی پُر تاثیر اور  
درود سوز سے مملو تھی۔ رفتہ رفتہ غفلت کی نیند کے ماتے جاگنے لگے۔ اُن کا معمول تھا کہ مغرب کی  
نماز ایک قریبی صوفی زاویے میں پڑھتے اور پھر قہرہ خانوں میں پہنچ جاتے جہاں رات گئے تک  
تذکیر و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوتیں تو اسماعیلیہ سے نکل کھڑے  
ہوتے۔ مصر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے۔ پیدل بھی اور گاڑی سے  
بھی۔ جس قصبے کے پاس سے گزر ہوتا وہاں ضرور جاتے۔ غریب کسانوں کے دُور افتادہ  
ڈیروں تک میں پہنچتے۔ رات وہیں گزارتے۔ مسجد میں لوگوں سے خطاب کرتے، انہیں  
خواب غفلت سے جگاتے۔ دن کے پر اور کارگاہوں میں جاتے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے  
اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے۔

اس کا عظیم کے لیے اللہ نے حسن البنا کو زبردست صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ نہ  
صرف بلا کی ذہانت عطا کی تھی بلکہ ایک مضبوط و توانا جسم بھی دیا تھا۔ قد تو اُن کا چھوٹا تھا، لیکن  
مردانگی اور شجاعت کا پیکر تھے۔ ساری زندگی بھر پور صحت سے پہرہ درپے رہے۔ عربوں کے دل  
پر خطابت کے سحر کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے اور حسن البنا اس وہی کمال کے مالک تھے۔  
ان کی بحر طراز خطابت، اور کشش انگیز شخصیت سے اُن پڑھ مزدور بھی متاثر ہوتے تھے اور



فائل شیوخ بھی، چنانچہ ان کی بڑی تعداد ان کے ارد گرد جمع ہو گئی۔

۱۹۳۳ء میں حسن البنا نے اخوان کا مرکز اسماعیلیہ سے قاہرہ منتقل کر دیا۔ اگلے تین برس

تحریک نے لوگوں کو اسلامی زندگی کو اپنانے کی دعوت و تعلیم اور مصر کے ہر حصے میں مسجدوں، مدرسوں اور سماجی بہبود کے مراکز کا جال بچھانے میں گزارا۔ وہ نوجوان جو چند سال پہلے خوابیدہ مؤذنین کو جگایا کرتا تھا اب سارے ملک کو جگا رہا تھا۔ حسن البنا نے وہ کام کیا جو الازہر کے معزز علماء بھی نہ کر سکے۔ قاہرہ ایسے شہر میں جہاں جاہلیت جدیدہ کے اثرات اتنے زبردست تھے کہ مسلمان سپک مقامات پر نماز پڑھتے ہوئے گھبراتے تھے، جہاں سکول کے بچوں کو اسلام کے ذکر تک سے متنفر کیا جا رہا تھا۔ حسن البنا نے سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان میں سے بعض آگے چل کر ان کے جانشین بن گئے۔

اخوان المسلمون شدید مرکزیت کی حامل تحریک تھی جس پر اس کے بانی کو مکمل اختیار

حاصل تھا۔ اخوان حسن البنا کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے۔ وہ ان کے مخلص وفادار اور سچے جانشین تھے۔ اس باب میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی ان کے ہمسر نہ تھے۔ جب یقین ہو گیا کہ اخوان ملک میں ایک موثر قوت بن چکے ہیں تو حسن البنا نے اپنے لائحہ عمل کو وسیع قومی پیمانے پر عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا سطح نظر شریعت کی کڑی پابندی کرتے ہوئے مصری معاشرہ کی مکمل اصلاح تھا۔

اخوان پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں حکومت کا مرکز توجہ بنے۔ شیخ حسن البنا نے بادشاہ اور

ملک کے خالی تربیت و زراعت کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں مغربی طرز اطوار کو چھوڑ دینے اور اسلامی قوانین کی اطاعت کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اختلاط مرد و زن، سرکاری تقریبات میں شراب نوشی، قمار خانوں کے طواف، گھڑ دوڑیں، شرمکٹ، شہینہ بلبوں میں شمریت اور سینما بینی سے باز رہیں، اپنی بیوی بیٹیوں کی تصویریں اخبارات میں شائع نہ کر لیں، پانچوں وقت نماز پڑھیں، گھروں میں انگریزی یا فرانسیسی بولنے کے بجائے عربی بولیں، اپنے



بچوں کے لیے یورپی اطالین رکھنے یا انہیں غیر ممالک میں بھیجنے سے احتراز کریں۔ اس طرح مصری عوام کے لیے ایک نمونہ قائم کریں۔

تحریک کے تمام مختلف پہلوؤں میں سے حسن البناء سب سے زیادہ اہمیت و فہمیت کی تعلیم کو دیتے تھے۔ مختلف مواقع پر انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ درس گاہوں اور تعلیمی اداروں کو اسلام کی بنیادوں پر از سر نو منظم کیا جائے، مخلوط تعلیم پر پابندی لگائی جائے اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ نصاب تیار کرنے کی ضرورت پر غور کیا جائے۔ خاص طور پر ان کی خواہش یہ تھی کہ طبیعی علوم کو جدید مادیت کے سیاق و سباق سے الگ کر کے رائج کیا جائے، تاکہ مصری تمام مفید علوم سے مکمل طور پر بہرہ مند ہو سکیں اور ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام تک اخوان المسلمون کے اثر کا یہ عالم تھا کہ وہ عملاً حکومت و حکومت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مصر بھر میں مشکل ہی سے کوئی شہر اور قصبہ ایسا ہو گا جہاں اس کی ایک دو شاخیں موجود نہ ہوں۔ حسن البناء نے خود اپنا ایک جامع اور مکمل نظام تعلیم قائم کر لیا تھا۔ اخوان درس گاہیں، مسجدیں اور معاشرتی بہبود کے مراکز اور دم بدم نمونے اور بڑھتے ہوئے تجارتی ادارے ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے اخبارات، پمفلٹ، رسائل اور کتابوں کا حلقہ اشاعت روز افزوں تھا۔ اب اخوان کا اثر مصر کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلنے لگا تھا۔ پڑوسی ملکوں کے نوجوانوں کی نظریں رہنمائی کے لیے حسن البناء کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شام، لبنان، اردن، فلسطین، مراکش اور سوڈان میں اخوان المسلمون کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔

جمال الدین افغانی کی طرح شیخ حسن البناء بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ دشمن اجنبی اقتدار کے سامنے میں کسی اسلامی معاشرہ کا پیچھا ناممکن ہے، چنانچہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ کے سیاسی اور اقتصادی سامراج کیخلاف جہاد کا اعلان کیا جائے اور آخر دم تک جنگ کی جائے۔ برطانیہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ نہر سوئز سے اپنا قبضہ اٹھالے۔ حسن البناء کو صہیونیت

اور اس کے عزائم سے شدید دل نفرت تھی۔ انہوں نے اس خطرے کے خلاف آخر دم تک لڑنے کا حلف اٹھایا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے خلاف جنگ میں اخوان عرب فوجوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ شجاعت سے لڑے۔ اخوان کے رضا کار لشکروں نے صہیونیوں کو ناکوں چنے چیرائے۔ ایسے مہلک اور سخت دشمن سے اُسے پہلے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔

اخوان کی ہر دلعزیزی اور اثر و نفوذ میں اضافے کے ساتھ ساتھ حکمران گروہ انہیں اپنے اقتدار کے لیے سخت خطرہ سمجھنے لگے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مصری حکومت، برطانیہ کے دباؤ اور جبر کے آگے جھک گئی۔ اور تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ہزاروں اخوان جیل خانوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ اس اقدام پر مشکل دوہینے گزرے تھے کہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو کسی نامعلوم قاتل نے قاہرہ کے ایک بھرے بازار میں حسن البنا کو گولی مار کر شہید کر دیا، لیکن اخوان کے حوصلے اپنے محبوب مرشد کی شہادت سے بھی پست نہ ہوئے۔ تحریک پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگی۔ ۱۹۵۴ء تک یہ تحریک زور شور سے ترقی کرتی رہی۔ پھر اسے نہایت سنگدل اور غیر انسانی طریقوں سے گھیل ڈالا گیا۔ ایسے غیر انسانی طریقوں سے جو کلیتہً پسندانہ آمریتوں کا طرہ امتیاز بن چکے ہیں اور جن سے ساری دنیا خوب واقف اور آشنا ہے۔

شیخ حسن البنا نے بچپن کے ادائل سے آخر دم تک اپنی ساری صلاحیتیں اسارے افکار، اساری توانائی، سارا وقت اور ساری جائداد حتیٰ کہ آخر میں اپنی جان بھی اللہ کی راہ میں دیدی۔ بلاشبہ انہوں نے ہر وہ چیز قربان کر دی جو ان کے پاس تھی۔ وہ حقیقی اور اعلیٰ ترین معنوں میں راہِ خدا کے شہید تھے۔ اللہ اُن پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہر دم تازہ رہے اور ہم سب ان کی زندگی سے جوش و جذبہ حاصل کرتے رہیں۔

٢٥٢

## الاخوان المسلمون

پہلی عالمی جنگ کے بعد مصر میں مغربیت کی حامی قوتیں نہایت زور پکڑ گئیں۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت ختم کر دی۔ یہ گویا عالم اسلام میں قوم پرستی کی انتہا تھی۔ تحریک نسواں بھی خاصی قوت اختیار کر گئی۔ اُونچے طبقے کی مصری عورتوں نے پردہ اتار پھینکا۔ مغربی طرز کا لباس پہننے لگیں۔ معاشرتی تقریبات کے سلسلے میں جو مخلوط محفلیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر منعقد ہوتی ہیں ان میں شریک ہونے لگیں اور مطالبہ کیا کہ مردوں کی طرح انہیں بھی یونیورسٹیوں میں داخلہ دیا جائے۔ اس زمانے میں شیخ حسن البنا دارالعلوم میں استاد بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ خود اور ان کے رفقاء اس صورت حال سے کس قدر متفکر اور مضطرب تھے، اس کا ذکر انہوں نے اپنی یادداشت میں کیا ہے:

”بس خدا ہی جانتا ہے کہ ہم نے کتنی راتیں قومی امور اور ان کی بگڑتی ہوئی کیفیت پر غور و خوض کرنے، زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ اس کے تعلق کا جائزہ لینے، اس بیماری کے اثرات اور اس کے مداوا کے مختلف طریقے تلاش کرنے میں گزاریں۔ ہم اپنے فیصلوں پر بار بار ایسے جذباتی انداز میں غور کرتے کہ ہماری آنکھیں اکثر اشکبار ہو جاتیں۔ پھر جب ہم اپنے جذباتی فیصلوں کا مقابلہ قہرہ خانوں



میں بیکار وقت ضائع کرنے والے بے فکرے اور حالات سے بے تعلق اور غیر جانبدار  
عوام کے ساتھ کرتے تو ہمیں شدید صدمہ ہوتا۔

اسی یادداشت میں حسن البنا بتاتے ہیں کہ انہیں تحریک شروع کرنے کا خیال پہلے پہل  
قاہرہ میں لوگوں کی اسلام سے بے خبری اور غفلت کو دیکھ کر ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں  
کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے محض مسجدیں اور ان کے واعظ کافی نہیں ہیں۔ وہ دیکھ  
رہے تھے کہ روایتی علماء تجدّد پسندوں کا سد باب کرنے سے قاصر ہیں اور کفر و الماد کے فتوے  
صادر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ انتہائی یاس انگیز بات یہ تھی کہ نام نہاد رجال الدین  
(نذہبی لوگ) حکمران طبقے کی کاسہ بیسی اور دنیا کی خوشنودی کے لیے اسلامی اصولوں کا سودا کرنے پر  
ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ قاہرہ کے علماء تو وقت و پستی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے  
شیخ الازہر کے اس فتویٰ کی توثیق کر دی تھی کہ شاہ فاروق خلافت کے لیے موزوں ترین امیدوار  
ہیں۔ وہ ایک متقی اور خدا ترس مسلمان ہیں اور نسبتاً خانوادہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے  
تعلق رکھتے ہیں۔

حسن البنا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اندوہناک منظر کو بدل کر رہیں گے اور اس سلسلے میں  
ان سے جو کچھ بنائے گا اُس سے دریغ نہ کریں گے، چنانچہ دارالعلوم سے فارغ ہوتے ہی  
۱۹۲۹ء میں الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھ دی۔ جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبده رحمہ اور سیّد  
رشید رضا رحمہ ایسی بااثر مسلمان شخصیتوں نے اپنی اسلامی سرگرمیوں کو تحریر و تقریر کے دائرے تک  
محدود رکھا تھا۔ شیخ حسن البنا ابتدا ہی سے ایک ایسی ہمہ گیر اسلامی تحریک جاری کرنا چاہتے  
تھے جو پوری قوم کی رہنمائی کرے اور اس کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے تمام میدانوں  
کو اسلامی نظریات کے رنگ میں رنگ دے۔

الاخوان المسلمون ایک نہایت منظم تحریک تھی۔ اس کے ارکان مختلف مدارج میں منقسم  
تھے۔ صفت اول، صفت دوم، ہمدرد اور فعال کارکن۔ کوئی رکن مقررہ آزمائشوں سے گزرے بغیر

اعلیٰ مدارج کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔ جب کوئی رکن سرگرم کارکن بن جاتا تو ان خاص اجلاسوں میں شرکت کا مستحق قرار پاتا تھا جس کی صدارت خود حسن البنا کیا کرتے تھے۔ فعال ارکان کی بہت نگرانی کے لیے انہیں مرکزدں، زادیوں، گھرانوں اور کتاب میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جب کسی شاخ کے ارکان کی تعداد بڑھ جاتی تو اسے ترقی دینے کا انتظامی وحدت میں تبدیل کر دیا جاتا جس کی اپنی مجلس شوریٰ ہوتی۔ اس مجلس کے ارکان کو جمعیت عمومی (General Assembly) منتخب کرتی تھی۔ ہر شاخ کو ہدایت تھی کہ وہ اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ اور لائحہ عمل کا گوشوارہ جمعیت عمومی کے اجلاس سے کم از کم دس دن پہلے مرکز عام کو بھیج دے تاکہ اس اجلاس میں وہ اپنا نامزدہ بیج سکے۔ مقامی شاخ کی جمعیت عمومی جو فیصلے کرتی مرکز عام سے اُن کی توثیق کر دانی پڑتی۔ مرکز عام کسی بھی نئی شاخ یا انتظامی وحدت کو منظور یا نامنظور کر سکتا تھا۔ اس کو انہیں توڑ دینے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ مرکز عام نے متعدد کمیٹیاں قائم کر رکھی تھیں تاکہ کام بے رک ٹوک ہو سکے۔ مثلاً ایک شعبہ معاشرتی خدمات کی نگرانی سے متعلق تھا۔ ایک اور شعبہ دنیائے اسلام سے رابطہ برقرار رکھنے کا فرض انجام دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

قاہرہ کا مرکز عام تحریک کی سب سے اہم شاخ تھی۔ یہ شاخ مجلس تاسیسی کے تقریباً ایک سو ارکان اور مکتب الارشاد العام (Office of the General Direction) کے بارہ ارکان سے عبارت تھی۔ مکتب کے ان ارکان کو حسن البنا خود مجلس تاسیسی کے ارکان میں سے چنتے تھے۔ جماعت میں شمولیت کے وقت تمام ارکان بیعت اور عہد کرتے تھے کہ وہ تحریک کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کریں گے، اپنے قانین پر مکمل اعتماد کریں گے، ان کے فیصلوں کو نافذ کریں خواہ شخصی طور پر انہیں ان فیصلوں سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہر اجلاس میں ہر ایک رکن تجدید بیعت کرتا اور عہد اطاعت دہراتا۔

فعال ارکان کی زندگیوں سے شیخ حسن البنا خوب اچھی طرح واقف تھے۔ ہر رکن کو حکم تھا کہ وہ اپنی روزمرہ کی سرگرمیاں ظلم بند کرتا رہے۔ ان سرگرمیوں میں حفظ قرآن، نماز باجماعت میں

حاضری، قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مبادی کا مطالعہ، مختلف ہتھیاروں کا استعمال اور فوری طبی امداد کا طریقہ بھی شامل تھا۔ مطالعہ کے اختتام پر امتحان لیا جاتا۔ شیخ حسن البنا کی دعوت پر ہر دو سال کے بعد اخوان کی شاخوں کے تمام رہنماؤں کی کانفرنس منعقد ہوتی۔

اپنی تحریروں میں شیخ حسن البنا و اخوان کو چند متعین اصول اپنانے کی تلقین کرتے۔ اول یہ کہ اخوان کو فروعی مذہبی اختلافات کی رزم گاہ ہرگز نہ بنائیں۔ اس ضمن میں وہ ایک پیرطریقیت کی نصیحت پر عمل پرستے۔ ان بزرگ کے وہ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے بے حد متاثر تھے۔

یہ صوفی بزرگ اپنے مریدوں کو ہمیشہ تنبیہ فرماتے رہتے تھے کہ نہ تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھیں نہ ملحدوں، آزاد خیالوں یا عیسائی مشنریوں کے دلائل کو کھٹے عام دہرائیں۔ نجی محفلوں میں ان پر کلام بھی کیا جاسکتا ہے اور باہم دیگر بحث مباحثہ بھی، لیکن عام لوگوں کے سامنے صرف ایسی موثر باتیں کہنی چاہئیں جن سے وہ اطاعتِ خداوندی کی طرف راغب اور متوجہ ہوں۔

دوم شیخ حسن البنا نامور لوگوں سے شجرت بذلن تھے۔ وہ جب تحریک میں شامل ہونے کی درخواست کرتے تو ان کے ارادوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ صرف دولت کے پجاری اور دنیوی مفادات کے بندے ہیں۔ ان کے سب کاموں کے پیچھے یہی خواہش

کار فرما ہوتی ہے۔ شیخ حسن البنا اور ان کے ہمدرد اپنی تحریروں میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے کہ تحریک کو فطری تدریجی انداز میں ترقی کرنی چاہیے اور اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے عوام کی طرف سے اس کے نظریات کی زبردست حمایت و تائید ضروری ہے۔ اخوان اپنے پردگام

کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خالص دینی و اعتقادی طاقت اور اپنے ارکان اور ہمدردوں کی دستِ فکر و عمل اور مقاصد میں ہم آہنگی پر انحصار کرتے۔ وہ طاقت استعمال کرنے کے قائل نہ تھے اسے

بس آخری چارہ کار سمجھتے تھے۔ حسن البنا و اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس بات کی پُر زور ترویج کرتے کہ ان کی تحریک انقلاب لانا یا حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخوان

اس قسم کے طور طریقوں کے موثر اور مفید ہونے پر یقین نہیں کرتے۔ تحریک کی اہم ترین سرگرمیوں



میں اخوان تعلیم اور مختلف قسم کی درس گاہیں کھولنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر مصری حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری اسکولوں میں دینی تعلیم رائج کریں اور نوخیز نسل کو اعلیٰ اخلاقی نظریات کی تعلیم دیں۔ اس پروگرام کے چار اہم مقاصد تھے: دینی اعتقادات کا فروغ، اعلیٰ اخلاقی معیار، قوم کے اسلامی ماضی کی میراث پر فخر و ناز، سائنس کے تمام شعبوں میں متخصصین (specialists) کی تیاری تاکہ ایک مضبوط و مستحکم بنیاد پر اسلامی نشاۃِ نو کا دور شروع کیا جاسکے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ نصبِ تعلیم میں اسلامی تاریخ، قومی تاریخ اور عمومی اسلامی تہذیب پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اسی طرح یونیورسٹی کی سطح پر مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جاتے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ جو لوگ اخلاقی طور پر بدکردار، اپنے دین ایمان سے غافل اور ملک کی فلاح و بہبود میں غیر مخلص ہیں، انہیں تعلیمی پیشے سے نکالا جائے اور مخلوط تعلیم پر پابندی عائد کی جائے۔

اخوان نے تعلیم کے فروغ و اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مرکز میں ایک کمیٹی بنائی جس کا کام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ابتدائی، ثانوی اور فنی مدارس قائم کرنا تھا، ایسے مدارس جن کی امتیازی شان اسلامی کردار ہو، ناخواندگی ختم کرنے کے لیے اخوان نے متعدد اسکول کھولے جن میں مزدوروں اور کسانوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اسکول دن رات کام کرتے تھے۔ دن کے وقت قرآن کریم حفظ کرایا جاتا اور شعبینہ اسکولوں میں وہ بالغ تعلیم پاتے جنہیں دن کے وقت فرصت نہیں ملتی تھی۔ امتحان میں ناکام ہونے والے طلباء کے لیے خصوصی اسباق کا انتظام کیا گیا۔ یہ اسباق یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نوجوان پڑھاتے تھے۔ اسی طرح لڑکیوں کی تربیت کے لیے "اہبات المؤمنین" اسکول قائم کیے گئے۔ تعلیم کی اشاعت پر اخوان نے اتنا زیادہ زور دیا کہ تحریک کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس کا اپنا اسکول نہ ہو۔

اخوان سماجی بہبود کی ہر طرح کی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ مصری دیہات کا معیار زندگی بلند کرنے اور دیہاتی علاقوں کی اصلاح کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی۔ ایک شخص نے اپنی اراضی میں ایک ماڈل فارم بنایا۔ ایک اور گاؤں میں غریبوں کے لیے چار قبرستان





اشعار سے بھرپور ہوتے۔ پمفلٹوں کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے۔ "اخوان کا لائحہ عمل" "نظریہ اسلامی کا ارتقاء اور اس کے مقاصد" "ہم عوام تک اپنی دعوت کیونکر پہنچائیں" "رشتہ کی طرف" "ہمارے مقاصد اور اصول" "ہماری دعوت" "ہماری تحریک" "امروز فردا کے درمیان" "دعوت جہاد" "نوجوانوں سے خطاب" "اخوان المسلمون قرآن کے پرچم تلے" "مسلمان بہنوں کے فرائض" اور "روحانی تعلیم کا ایک پروگرام"۔ چند ایک کتابوں کے نام یہ ہیں: "اخوان المسلمون صداقت کی میزان پر" "اسلامی ممالک کے مسائل" "فلسطین اور شمالی افریقہ" "جدید مغربی تہذیب کا زوال" "اسلام آگے بڑھتا ہے" "اخوان نے حسن البنا کے اتہائی اہم علمی مضامین، خطوط اور مذاکرات کے مجموعے شائع کیے۔ اخوان کی مطبوعات اور رسائل و جرائد مصر ہی میں نہیں عربی زبان بولنے والے تمام ممالک میں بے حد مقبول ہوئیں۔ اس تحریک نے اسلامی نظریات کو بڑے جوشیلے اور کامیاب انداز میں پیش کیا۔ اس کے اعلیٰ درجے کے اصحاب قلم نے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، نہایت مؤثر اور توانا لٹریچر دیا۔ اس لحاظ سے زمانہ قریب میں عرب ممالک میں ایسی کوئی اور اسلامی تحریک نظر نہیں آتی۔

اخوان نے اپنی تحریک میں خواتین کو روزِ اول ہی سے شامل کیا۔ "اخوات المسلمون" کی شاخوں کے بھی وہی نظریات تھے جو مردوں کے تھے۔ بس انہیں خواتین کی ضروریات کے مطابق بنالیا تھا۔ ان کا مقصد خواتین کو عزت، نیکی اور عصمت و عفت کے مدارجِ عالیہ سے ہمکنار کرنا تھا۔ "اخوات" کی سرگرمیاں تعلیم اور سماجی بہبود کے امور پر مرکوز تھیں۔

سرخوان کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاد کی زبردست اہمیت پر مسلسل زور دیتے تھے۔ جہاد کے بارے میں ان کا نقطہ نظر وہی تھا جو ابتدا ہی سے مسلمانوں کا رہا ہے۔ اسی نقطہ نظر کی وہ تبلیغ کرتے اور کسی قسم کی مرعوبانہ ذہنیت اور معذرت پسندانہ مصلحت سے کام نہ لیتے تھے اور نہ معذرت پسندوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت روا رکھتے تھے۔ اخوان کی دعوت یہ تھی کہ جب تک کوئی مسلمان اپنے دین کے دفاع کے لیے جان تک قربان کرنے پر آمادہ نہیں

ہوتا اس کا نماز روزہ اور دوسری عبادات بے لالہ ہیں۔ پھر نیت بھی پاک صاف ہونی چاہیے  
کوئی دنیوی منفعت مقصود نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی، محبت اور آخرت پیش نظر ہے۔

انخوان المسلمون نے جذبہ جہاد کو فروغ دینے کی خاطر نوجوانوں میں فوجی طرز پر ورزشوں اور جسمانی  
ریاضتوں کی حوصلہ افزائی کی، سکاؤٹ تحریک میں بھرپور دلچسپی لی اور بالآخر اپنی فوج قائم کرنے  
کی کوشش کی تاکہ بوقت ضرورت اپنا دفاع کر سکیں۔ حسن البنا نے مصریوں کو برطانیہ کی خلاف  
جہاد کرنے پر ابھارا اور انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے نکال باہر کرنے پر زور دیا۔

وہ اس معاملے میں کسی قسم کی مہمت یا مصلحت گوارا کرنے پر تیار نہ تھے۔ وہ مذاکرات اور امن  
کانفرنسوں کے قائل نہ تھے جو ہمیشہ بے نتیجہ رہتی ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین کے دوران میں

انخوان کی رضا کار فوجوں نے عربوں کی طرف سے جنگ کرنے والی باقاعدہ افواج سے زیادہ  
ثابت قدمی اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ جب اقوام متحدہ نے صہیونی ریاست کے قیام کا اعلان کر  
دیا تو شیخ حسن البنا نے اپنے ہفت روزہ اخبار ”الدعوة“ میں مسلمان ملکوں سے مطالبہ کیا کہ  
وہ اقوام متحدہ سے فوراً الگ ہو جائیں اور بنیان مرموص بن کر یہودیوں کے خلاف جہاد کریں۔

شیخ حسن البنا اور ان کے حامی ہی پوری قوم میں اتنے جرات مند تھے کہ وہ اٹھ کھڑے  
ہوئے اور کھلے عام اعلان کیا کہ امت جن مفاسد میں مبتلا ہے ان سب کا حل اسلام اور صرف  
اسلام ہے۔ الاخوان المسلمون کا سب سے بڑا مقصد ایک اسلامی معاشرہ اور مقدس شریعت  
پر مبنی حکومت کا قیام تھا۔ حسن البنا نے کہا:

”جب تک ہم قرآن کریم کو ایک مؤثر دستور کی حیثیت سے نافذ العمل نہیں

دیکھ لیتے ہم نہ تو اطمینان سے بیٹھیں گے اور نہ خاموش رہیں گے۔ ہم یا تو اس مقصد

کی خاطر زندہ رہیں گے یا اس کی جدوجہد میں ختم ہو جائیں گے۔“

الاخوان المسلمون کے لیے بعض یہ بات اطمینان بخش نہ تھی کہ دستور میں اس مفہوم کی ایک دفعہ  
شامل کر لی جاتی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ قانون سازی شریعت کے



مطابق کی جائے اور حکومت اور معاشرہ اسلامی قانون کی اطاعت کرے۔

حسن البنا نے اپنی ایک اور تقریر میں کہا:

”اخوان المسلمون اسلام کو ایک ہمہ گیر اور مکمل نظام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کی نگرانی اسلام ہی کو کرنی چاہیے۔ ہر چیز کو اس کی حکمرانی کے ماتحت اور اس کی تعلیمات کے مطابق ہونا چاہیے۔ وہ شخص جو عبادت کی حد تک تو مسلمان ہے، لیکن دوسرے تمام معاملات میں غیر مسلموں کے نقش قدم پر چلتا ہے کسی کافر سے بہتر نہیں ہے۔“

اپنے عہد کے ایک سیاسی لیڈر کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

”ہم آپ کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں، اسلام کی تعلیمات کی طرف، اسلام کے

ضوابط کی طرف اور اسلام کی ہدایت اور رہنمائی کی طرف۔ اگر آپ کے نزدیک یہ

سیاست ہے تو ہم کہیں گے کہ ہاں یہ ہماری سیاست ہے۔“

چونکہ مصر میں صحیح معنوں میں جمہوریت موجود نہ تھی اس لیے شیخ حسن البنا نے مطالبہ کیا کہ

سیاسی جماعتوں اور پارلیمانی نظام کو ختم کر دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جماعتیں اور پارلیمانی نظام

صرف ہوس اقتدار اور اخلاقی بگاڑ کو جنم دے رہے ہیں۔ شیخ حسن البنا اور ان کے ہمدردوں

کو یقین کامل تھا کہ ان سیاسی جماعتوں میں سے کوئی جماعت بھی نہ تو اسلامی قانون کے نفاذ کا

ارادہ رکھتی ہے نہ اسلامی نظریات کو پسند کرتی ہے۔ اخوان مصر میں ایک مضبوط اور متحدہ

اسلامی مملکت چاہتے تھے جس میں چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ حسن البنا اس

اصول پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ اتنا زور کہ اخوان کا رکن بننے والے ہر شخص کو یہ اعلان کرنا

پڑتا تھا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اخوان المسلمون اگرچہ مصر کو غیر ملکیوں کی غلامی سے چھٹکارا دلانے اور عرب اتحاد کو وقت

کی ضرورت قرار دینے کی حد تک لادین عرب قوم پرستوں کے ہم خیال تھے، لیکن ان کے نزدیک



یہ دونوں باتیں بجا تھے خود نصب العین نہ تھیں بلکہ نصب العین تک پہنچنے کا ذریعہ تھیں۔ عرب  
اتحاد اسلامی اتحاد کی منزل کی جانب محض ایک قدم تھا اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی کا مطلب یہ  
تھا کہ اس طرح اسلامی قانون پر مبنی ایک ریاست قائم کرنے کا موقع ملے گا۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب جس نے شاہ فاروق کی بساط اقتدار الٹ کر رکھ دی، بدقسمتی  
سے اپنی پیشرو حکومتوں کی مغرب پسندانہ پالیسی کو جاری رکھنے پر تلا ہوا تھا؛ چنانچہ اُس نے خلافت  
قوم پرستانہ لادین ریاست قائم کر دی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ نئی حکومت اخوان المسلمین  
کی اتنی ہی دشمن ہے جتنی کہ پرانی حکومتیں تھیں۔ مطلق العنان اقتدار کی طلب میں تو وہ ان حکومتوں  
سے زیادہ حریص اور ظالم و جابر نکلی۔ اخوان اپنے لیے اقتدار کے طالب نہ تھے۔ انہوں نے  
بار بار یہ وعدہ کیا کہ جو حکمران بھی اسلامی قوانین نافذ کرے گا وہ اس کی حمایت کریں گے، لیکن  
نئی فوجی آمریت نے ان کی اس پیش کش کو دھوکا مسترد کر دیا۔ صدر جمال عبدالناصر نے کہا:  
"میں نے اخوان المسلمون کے مرشد عام سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھ سے  
کئی مطالبات کر دیئے۔ پہلی بات یہ کہی کہ ہم عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم جاری کریں۔  
پھر مزید مطالبات کیے۔ مثلاً سینما اور تعمیر بند کر دیئے جائیں۔۔۔۔۔ بالفاظ دیگر  
زندگی کو تیروتا راد اور افسردہ و حزین بنا دیا جاتے۔ بلاشبہ ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔"

دسمبر ۱۹۵۲ء میں صدر جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے نے وہ مثالی بہانہ فراہم کر دیا جس کی  
حکومت منتظر تھی۔ اخوان نے اگرچہ لاکھ انکار کیا، لیکن اس واقعہ کی ساری ذمہ داری ان کے سر  
مقرب دی گئی۔ ہزاروں اخوان گرفتار کر کے جیلوں میں مٹونس دیئے گئے اور چھ کو عالم اسلام  
کے گوشے گوشے سے اٹھانے والے احتجاج کے علی الرغم پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بارہ برس کے

بعد ۱۹۶۶ء میں اسی حکومت نے اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کے لیے اخوان کو ایک بار پھر قربانی کا بکرا بنانے کا فیصلہ کیا، چنانچہ صدرِ ناصر کی حکومت نے "اخوان المسلمون" کی رجعت پسند تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور شر پسند اخوان کو فوجی طاقت اور عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے نیست نابود کرنے کی تمام ممکن تجویزیں پیش کرنے کے لیے اعلیٰ اختیارات کی حامل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں ان میں سے چند مکہ مکرمہ کے اخبار الندوہ کے حوالے سے درج کی جاتی ہیں:

۱۔ دینیات اور اسلامی تاریخ کے مضامین ملک بھر کے تعلیمی اداروں سے مکمل طور پر ختم کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ سوشلزم کے اصولوں سے ہم آہنگ نیا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے۔  
۲۔ مذہب کا نام و نشان مٹانے کے لیے کمیونزم کو ہر طرح کے حربے اختیار کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک میں مذہبی لوگوں کا مرتبہ و مقام ختم ہو جائے۔ ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام مذہب دشمن کمیونسٹ مرگرمیوں کو زور شور سے جاری رہنے کی اجازت دے۔ اس کے برعکس مذہب کو ان تمام مواقع سے محروم کر دے۔

۳۔ جن مذہبی لوگوں کا اخوان المسلمون سے تعلق تو نہیں ہے، لیکن ٹھیک انہی کا کردار ادا کر رہے ہیں، ان کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "مذہب بازوں" کے یہ دونوں گروہ فکر و عمل میں یک رنگ ہیں۔ بنا بریں انہیں ایک دوسرے سے الگ تھک رکھا جائے، ان کے باہمی روابط بالکل کاٹ دیئے جائیں، ورنہ وہ دن قریب ہے جب یہ دونوں متحد ہو کر حکومت کے خلاف کھلی بغاوت کر دیں گے۔ اس وقت ان کے درمیان امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہذا دانش مندی کا تقاضا ہے کہ اس خطرے کو ابتدائی مرحلے ہی میں گچل ڈالا جائے اور تمام "مذہب بازوں" اور رجعت پسندوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ ان کی ترقی کے تمام راستے بند اور فکری و عملی کام کرنے کے مواقع ختم کر دیئے جائیں۔ ان کی باہمی ملاقاتیں اور صلاح مشورہ کے بارے میں مسلسل تحقیقات کی جاتی رہے۔ مذہب کے تمام پرستار خواہ

ان کا تعلق کسی بھی تنظیم سے ہو، ان کا قصہ بلا تاخیر چکا دیا جائے۔ اخبارات اور نشر و اشاعت کے ذرائع، قومی، معاشرتی اور سرکاری تقریبات کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جائیں۔

۴۔ اخوان اور ان سے ہمدردی رکھنے والے تمام لوگوں کو قید و بند کے عذاب اور تہدو  
تخلیص کا مسلسل ہدف بنایا جائے۔ ان کی املاک کو ہر قسم کے تحفظ سے محروم کر دیا جائے اور  
صاف صاف کہہ دیا جائے کہ حکومت ان کے تحفظ کی ذمہ دار بالکل نہیں ہے۔ ان لوگوں کو  
گوناگوں جبر تشدد، تعذیب و اذیت کا ہدف بنایا جائے اور ان کے ساتھ امانت آمیز سلوک  
روا رکھا جائے اور اس دردناک عذاب سے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی نجات نہ ملنے پاتے۔  
اس پالیسی کے نتیجے میں عورتوں سمیت ہزاروں اخوان گرفتار کر لیے گئے، انہیں  
صفائی کا قانونی حق بھی نہ دیا گیا اور انتہائی بے دردی سے تعذیب و اذیت کی بھٹی میں جھونک  
دیا گیا۔ حسن اسماعیل ابھینیسی ملک کے ایک نامور جج اور فاضل شخص تھے، شیخ حسن البناء کی جگہ  
مرشد عام منتخب ہوئے انہیں بڑھاپے اور کمزور صحت کے باوجود بھاری بھر کم زنجیروں سے  
پیٹا گیا۔ ۲۹ اگست کو اخوان کے تین رہنماؤں کو موت کی سزا دے دی گئی۔ ان شہداء میں ممتاز  
ترین شخص سید قطب تھے جن کا شمار عرب دنیا کے انتہائی نامور فضلا اور مصنفین میں ہوتا تھا۔  
ان کے بھائی محمد قطب، جو خود بھی ایک مشہور مصنف تھے، اور بہن امینہ قطب چند ماہ پہلے  
ظلم و تشدد کی تاب نہ لا کر جیل ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ ان کی ایک اور بہن حمیدہ قطب کو  
دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی جو جیتے جی موت کے مترادف تھی۔

شیخ حسن البناء ۲۷ کئی سال پہلے ان آفات و مصائب کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔

لے بحوالہ ویکی نیٹ پاکستان ڈھاکہ ۲۷ اکتوبر ۲۰۱۶ء ص ۶ مقالہ۔

“Atrocious Methods to Crush Religion in Egypt.”



انہوں نے اپنے پیروکاروں کو متنبہ کیا تھا کہ ان کا تسخّر اڑایا جائے گا، ان کی مخالفت کی جائے گی، ان کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں گے، انہیں گچھلا اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا، ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جائیں گے۔ لیکن بالآخر دنیا اور آخرت میں نفع و کامرانی انہی کو حاصل ہوگی۔

اخوان اگرچہ اپنی سرزمین میں کچلے جا چکے ہیں، تاہم شام، اردن، لبنان اور سوڈان میں وہ اب بھی سرگرم عمل ہیں۔ شیخ حسن البناؤ کے داماد ڈاکٹر سعید رمضان جنہیں جمال عبدالناصر کی حکومت نے عبدالقادر عودہ وغیرہ کے ساتھ سزائے موت دی تھی، لیکن وہ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، جینیوا (سوئٹزرلینڈ) میں مقیم ہیں اور مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت کو بڑے جوش و جذبے کے ساتھ پھیلا رہے ہیں۔ اخوان کی سرگرمیوں کے بارے میں جماعت اسلامی حلقہ کراچی کے امیر خود پوری غلام محمد نے چند سال پہلے کہا تھا:

”یہ تصور غلط ہے کہ اخوان المسلمون کی دعوت مرچکی ہے۔ ان سطور کا راقم مصر اور شام جا چکا ہے۔ وہاں اس نے اس تحریک کے اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک غیر حقیقی صورتِ حالات کی بنا پر اخوان کی تنظیم عارضی طور پر منظر سے غائب ہو جانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تنظیم کا وجود فی الواقع ختم ہو چکا ہے۔ نظریاتی تحریکیں اس طرح کبھی نہیں مرتیں۔ ان کے پیغام کی اشاعت جاری رہتی ہے۔ اخوان کی دعوت آج بھی نگری، معاشرتی اور ثقافتی میدانوں میں ترقی پذیر ہے اور نئے نئے میدان فتح کر رہی ہے۔ جب بھی استبداد کی عائد کردہ بندشیں دور ہوں گی یہ

نہ جب سے بعث پارٹی نے فوج کے ذریعے ملک کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹا ہے، اخوان کی سرگرمیاں شام میں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ سیکٹروں اخوان کارکن اور رہنما قید و بند کی سختیاں جیل رہے ہیں اور متعدد دوسرے غیر سرسلسٹ عرب ممالک میں پناہ گزین ہیں۔ (مترجم)



تحریک انشاء اللہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور بن کر ابھرے گی۔ یہ ہے اخوان  
کی حقیقی حیثیت، لیکن مصر کی لادین سیاسی پارٹیوں کا کیا بنا؟ وہند پارٹی آج  
کہاں ہے؟ سعد پارٹی کہاں گئی؟ ہمارے ملک کے دانشور ذرا مصر جاتیں اور دیکھیں  
کہ کون سی جماعت زیادہ سخت جان ثابت ہوئی ہے؟»

---

## مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

آزادی ہند اور اسلام کی روحانی سالمیت و اتحاد کے پرجوش نقیب مولانا محمد علی جوہر ۱۸۷۹ء میں رامپور میں طبقہ امراء کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبد العلی، نواب رامپور کے درباری تھے اور رامپور کے ہر پابند وضع امیر کی طرح قرض کے بارے میں دے دیتے تھے۔ محمد علی ابھی بچہ ہی تھے کہ ان کے والد کو مہینہ ہوا اور چند گھنٹے بیمار رہنے کے بعد جوانی ہی میں چل بسے۔ ان کی والدہ اس وقت صرف ۲۷ برس کی تھیں، تقریباً نصف درجن بچوں کی دیکھ بھال کا بار اُن پر اُڑا، لیکن وہ بڑی بہادر اور قابل خاتون تھیں۔ انہوں نے دوسری شادی کرنے یا کسی سے مالی امداد لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ناخواندہ ہونے کے باوجود بے حد ذہین تھیں۔ انہیں خوب علم تھا کہ اُن کے بچوں کی دنیوی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ انہیں انگریزی تعلیم دی جائے۔ جاننا اور کا انتظام محمد علی کے چچا کے ہاتھ میں تھا اور وہ انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ والدہ نے خفیہ طور پر اپنے زیرِ رات رہن رکھ کر قرض لیا اور اپنے دو بڑے بیٹوں ذوالفقار اور شوکت کو سکول میں داخل کروا دیا۔ جب چچا کو پتہ چلا کہ اُن کے ساتھ داد کھیلا گیا ہے تو بادلِ خواستہ محمد علی کو بھی سکول میں داخل کرنے کی اجازت دیدی۔ محمد علی نے پہلے رامپور میں پڑھا، پھر بریلی میں اور آخر کار علی گڑھ میں۔ بچپن میں محمد علی میں کوئی خاص امتیازی بات نظر نہ آتی تھی۔ وہ عام صحت مند

بچوں کی طرح اپنے سگے اور عم زاد بہن بھائیوں کے ساتھ دھماچو کڑی کرتے اور غل غپاڑہ مچا کر کھیلے تھے۔ البتہ وہ بے حد اودھم باز اور مشریت تھے اور اپنی ماں کے لیے جو سدا کی رودگی تھیں، وہ بال جان بنے رہتے تھے۔

زندگی کا دریا کسی ہنگامے کے بغیر خاموشی کے ساتھ رواں دواں تھا۔ ۱۸۹۶ء میں محمد علی نے الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان میں اول آکر سب لوگوں کو چونکا دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی ان دنوں پورے اتر پردیش، بعض متصلہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے سکولوں اور کالجوں کے طلباء کا امتحان لیا کرتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اُن کے بڑے بھائی شوکت علی نے جو ان دنوں سرکاری ملازم تھے، مصارف کا انتظام کر کے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ محمد علی نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں آنرز کی ڈگری لی۔ وطن واپس آئے تو ریاست رامپور کے محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر دیئے گئے۔ پھر چار برس تک ریاست بڑودا میں ملازمت کرتے رہے یہیں انہوں نے سول سروس چھوڑ کر مصافحت کے ذریعے اپنے ملک کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انہیں اس میدان میں پہلے کوئی تجربہ نہ تھا، تاہم انہوں نے بڑی جرات مندی کے ساتھ انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو اخبار "ہمدرد" کی بنیاد رکھی۔ انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی اور اس میدان میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ برطانوی حکومت کی کمزوریوں پر اُن کی تنقید بڑی ذہانت پر مبنی ہوتی۔ ملک کو جو انتہائی اہم مسائل پیش تھے، اُن کا بڑا گہرا تجزیہ کرتے۔ اُن کی ان خوبیوں نے پوری قوم کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ برطانوی حکومت ایسے شخص کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ اسی زمانے میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ محمد علی نے ایک طویل اور یادگار ادارہ لکھا جس کا عنوان تھا: ترکوں کا انتخاب، اس ادارے میں ترکوں کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ چونکہ انگلستان اور اس کے اتحادیوں نے مسلمانوں کے اقتدار کے ساتھ سخت دغا بازی اور نفرت و عداوت سے کام لیا ہے اس لیے کوئی دیر نہ تھی کہ ترک

جرمنی کا ساتھ نہ دیتے۔ انگریزی حکومت نے "کامریڈ" کو بند کر دیا اور محمد علی اور اُن کے بڑے بھائی شوکت علی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

جس زمانے میں وہ کامریڈ اور سہمدرد کے ایڈیٹر تھے، ان کا اسلامی شعور بیدار ہونا شروع ہوا۔ محمد علی اور شوکت علی اُس وقت بالکل نوجوان تھے اور دوسرے سینکڑوں انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی طرح انگریزی برلتے اور مغربی طور اطور رکھتے تھے۔ جیسا کہ محمد علی نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ اُن کے اندر مسلمانوں کے ملی وجود کا احساس ۱۹۱۱ء میں اس وقت پیدا ہوا جب جنگ بلقان میں ترکی اور عثمانی سلطنت کا وجود تک خطرے میں پڑ گیا تھا۔ قسطنطنیہ صرف ترکی کا دار الحکومت ہی نہ تھا بلکہ خلافت کا مرکز ہونے کی وجہ سے عالم اسلام کا دل بھی تھا۔ ایسا دل جس کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا احساس یہ تھا کہ ترکی کی سالمیت کو اگر کوئی خطرہ درپیش آتا ہے تو گویا خود ان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں کے ملی وجود کا احساس کس طرح پیدا ہوا اس کی وضاحت میرے بھائی شوکت علی کی داستان سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے انجمن خدام کعبہ کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ اس انجمن کا مقصد حرم مکہ، حرم مدینہ اور حرم بیت المقدس (یروشلم) کی بزرگی اور تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے تمام فرقوں کے مسلمانوں کو مجتمع اور متحد کرنا تھا۔ میرے بھائی کو فوری طور پر بمبئی جانا پڑا کیونکہ حاجیوں کو بحری سفر کے لیے جگہ حاصل کرنے میں سخت وقت پیش آرہی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے محسوس کیا کہ اس متمول بندرگاہ میں اللہ کے ان ہزاروں مہمانوں کی تکالیف کا ازالہ کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حاجیوں کا ایجنٹ بننے کا اجازت نامہ لیا جائے۔ اس پیشے نے ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ کو یکسر بدل ڈالا۔ وہ برطانوی حکومت کے ایک نہایت چاق و چوبند



نیم فرنگی اور فیشن ایبل افسر تھے۔ علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم کے مشہور کپتان ہونے کی حیثیت سے کھیل کے میدان میں ان کے کارناموں کی دھوم تھی، چنانچہ جم خانوں اور کلبوں میں اُن کی بڑی مانگ تھی۔ وہ ریشمی قمیصوں کا بڑا حسین ذوق رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اب وہ بمبئی والا بن گئے۔ جس کے جسم پر گھٹیا اور بوسیدہ کپڑے اور ایک عجیب وضع قطع کا ڈھیلا ڈھالا سبز کوٹ تھا۔ ہموار چکنے رخساروں اور ٹھوڑی پر اب بھاڑ سی ناہموار ڈاڑھی نظر آتی تھی جس کے بارے میں وہ خود کہا کرتے تھے کہ یہ اُن کا یورپ اور عیسائی دنیا کے خلاف انتہائی پُر جوش احتجاج ہے۔“

محمد علی جب بچے تھے تو انہیں قرآن کی چند چھوٹی سورتیں زبانی یاد کرائی گئی تھیں جن کے ایک لفظ کے معنی بھی انہیں نہ آتے تھے۔ اسی طرح انہیں دستور کرنا اور روزانہ پنج وقتہ نماز پڑھنا بھی سکھایا گیا تھا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے کے جوش و خروش میں علی گڑھ کے نصاب تعلیم میں اسلام کو تقریباً بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ”دینیات کے گھنٹے“ میں عربی اور فارسی کی تعلیم دینے کے لیے ”بے کار سے لوگ“ رکھے گئے تھے جنہیں تنخواہ بھی تھوڑی سی دی جاتی تھی۔ ”دینیات کا گھنٹہ“ لڑکوں کے لیے اس قدر غیر دلچسپ ہوتا تھا کہ وہ یا تو کلاس سے بھاگ جاتے تھے یا ہر طرح کا ستم ظریفانہ مذاق کرتے اور لُٹ لُٹا کر اندوز ہوتے رہتے تھے۔ ”اکسفورڈ سے سند فراغت حاصل کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محمد علی کو یہ احساس ہوا کہ تعلیم پوری کرنا تو دور کی بات ہے ابھی انہوں نے شروع ہی نہیں کی۔ نظر بندی کے دوران میں انہوں نے قرآن و حدیث ترجمے سے پڑھی اور اس طرح زندگی میں پہلی مرتبہ ان کے معانی و مفہوم سے آشنا ہوئے۔ اسلام



دنیا کی سیاست سے اسلام کے اثرات کو ختم کرنا ہے اس لیے انہوں نے ترکی کی شکست کو اپنی شکست سمجھا۔ در اس، مکھنوا، دہلی اور دوسرے مقامات پر مسلمانوں نے زبردست مظاہرے کیے اور فاتحین ترکی کے ساتھ جو شرمناک سلوک کر رہے تھے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پھر ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ کیونکہ غیر مسلموں کو بھی اس میں حصہ لینے کی اجازت تھی اس لیے خلافت کے جلسوں میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو ایسے ممتاز رہنما بھی شریک ہوتے تھے۔ محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی جیل سے رہا ہوئے تو وہ تحریک خلافت کی روح رواں بن گئے۔ مولانا محمد علی ایک وفد لے کر انگلستان گئے اور برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا یہ مطالبہ رکھا کہ عثمانی سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے اور اس کے حصے بخرے نہ کیے جائیں۔ برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا۔ آخر کار محمد علی نے یورپ کی راستے عامہ کو ترکی کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ پیرس اور لندن میں زبردست تقریریں کیں اور بڑی طاقتوں کی دغا بازیوں اور ناپاک مقاصد کو بے نقاب کیا۔ خلافت و فدا بھی لندن ہی میں تھا کہ ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سیورے طے پا گیا جس کی رو سے عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ اسی موقع پر مہاتما گاندھی نے بڑی عیاری سے یہ تجویز پیش کی کہ تحریک خلافت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان کے عدم تشدد کے طریقوں کو اپنا لے۔ اس طرح محمد علی سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ انہوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس عظیم اسلامی تحریک کی قسمت ہندوؤں کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ گئی تاہم اس وقت محمد علی اپنی ہلک غلطی کا پورا اندازہ نہ کر سکے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل رہے جو ان کے نزدیک آزاد اور خوش حال ہندوستان کے لیے نہایت ضروری تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: ”جہاں تک خدا کے احکامات کا تعلق ہے میں اول و آخر مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اول بھی ہندوستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں ہوں۔“



۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت اپنے پورے عروج پر تھی۔ ٹھیک اس وقت ہاتھ لگانا گاندھی نے انگریزوں کے خلاف تحریک بند کر دینے کا اچانک اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو جس نے بھی سنا بھونپکا ہو کر رہ گیا، خود ان کے ہندو حامی بھی اس فیصلے پر دم بخود تھے۔ گاندھی جی کے اس طرز عمل سے مسلمان بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ گاندھی جی نے تحریک خلافت میں شرکت اس لیے نہیں کی تھی کہ انہیں تحریک کے نظریات اور مقاصد سے واقعی ہمدردی تھی بلکہ اس طرح وہ اپنی سیاسی طاقت کو بڑھانا اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے اقتدار کو مستط کرنا چاہتے تھے۔

مولانا محمد علی سے ناوانتگی میں خواہ کیسی ہی غلطی سرزد ہوتی ہو، وہ اسلامی مقصد کی راہ میں ثابت قدم رہے۔ اسلامی نظریات سے ان کے اخلاص کامل اور ان کی خاطر اپنی زندگی وقف کرنے کا واضح ثبوت اس وقت ملا جب ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ترکوں سے لڑنے کے لیے برطانوی فوج میں شامل نہ ہوں۔ اس پر انہیں، ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو اور ان کے درستیوں کو جن میں سے ایک مشہور ہندو مذہبی رہنما تھا، مسلمان فوجوں کو برطانوی تاج سے بغاوت پر اکسانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا محمد علی نے عدالت میں اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”کیا برطانوی رعایا کے کسی فرد کے لیے خدا کا قانون زیادہ اہمیت رکھتا

ہے یا بادشاہ کا قانون۔۔۔۔۔ ایک انسان کا بنایا ہوا قانون؟ اسلام میں ہر انسان کی نجات کا انحصار ان باتوں پر ہے کہ وہ خدا اور رسول پر اعتقاد ایمان رکھے۔ اس اعتقاد و ایمان کے مطابق عمل کرے اور اس اعتقاد و ایمان کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ وہ شخص جو اسلام پر ایمان رکھتا ہے نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ اور صدقات دیتا ہے، رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا ہے، حج کے لیے مکہ معظمہ جاتا ہے اور کسی کو دکھ نہیں دیتا، لیکن کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ محض ان باتوں سے نجات پا جائے گا؟ نہیں، کیونکہ



قرآن ان اصولوں کی تبلیغ و اشاعت کا حکم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم محض اپنے آپ کو بچانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ تم یہاں اپنے پڑوسیوں کو بھی بچانے کے لیے آئے ہو۔ اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ دوسرے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے، لیکن وہ جانتا ہے اور اُسے قتل کر دیتا ہے، ایسے شخص کو نجات نہیں مل سکتی۔

فرمن کیجئے اُس کا ایمان ہے کہ مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے، چنانچہ وہ خود تو قتل نہیں کرتا، لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کو کھلی چھوٹ دیدیتا ہے کہ وہ اس کو قتل کر دیں تو اس صورت میں بھی نجات سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ نجات صرف اُسی شخص کو ملتی ہے جو دوسروں کو خبردار کرتا ہے کہ مسلمان کا قتل حرام ہے اور اگر اس کی جدوجہد ناکام ہوتی ہے تب بھی اس راستے پر ثابت قدم رہتا ہے۔ پھر اگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ اور دفعہ ۱۱ کے تحت مصائب میں گرفتار ہو جائے، تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اُسے چاہیے کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے۔ لیکن ہے اُس کو پھانسی دے دی جاتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غرق کر دیا جائے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کی جان بخشی کر دی جاتے، لیکن اُس کو ہر حالت میں اپنے رشتہ میں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اسی صورت میں وہ نجات پا سکے گا اور ابدی عذاب سے محفوظ رہ سکے گا۔ اُسے خدا کے قانون میں ایک نقطہ بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ہر صورت اس قانون کی اطاعت کرنی اور اس کے نتائج کا سامنا کرنا چاہیے۔۔۔۔۔

۱۔ The Writings and Speeches of Maulana

Mohammad Ali, edited by Afzal Iqbal, Vol. H, pp. 72-73.

اگرچہ ہر شخص متوقع تھا کہ علی برادران کو موت کی سزا نہ ملی تو عمر قید کی سزا تو ضرور ملے گی، لیکن جوڑی نے متفقہ طور پر انہیں "بے قصور" قرار دیا۔

مولانا محمد علی صحیح معنوں میں "کٹر" مسلمان تھے۔ علی گڑھ مکتب فکر کے برعکس، جہاں اُن کی فکری تربیت ہوئی تھی، تجدید پسندی اُن کے عقائد کو چھوٹنے بھی نہ پائی تھی۔ اگر میرے سمیت کوئی بھی فانی انسان من گھڑت تعبیر و تطبیق کے نام پر خدا کے حکم میں کوئی رد و بدل کرتا ہے تو انتہائی سخت گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر ہندو یا کسی دوسرے "ترقی پسند" مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے متعلق کوئی قانون سازی کرنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے کریں، مجھے ان پر ذرا بھی اعتراض نہیں، لیکن میرا مذہب ترقی پسند نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ دُعا۔ جب کبھی موقع محل کا تقاضا ہوگا، میں دھیان رکھوں گا کہ اسلام انسانی قانون سازیوں سے بالاد برتر رہے۔ اس حقیقت کو پس پشت ڈالے بغیر کوئی مسلمان کسی انسانی دستور کا وفادار رہنے کی حامی نہیں بھر سکتا، خواہ وہ دستور ہندوستانی پارلیمنٹ نے بنایا ہو یا برطانوی۔ ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی نے بدنام زمانہ شارڈ ایکٹ کی، جو ۱۹۱۹ء میں منظور کیا گیا تھا اور جس کے تحت ۴ سال سے کم عمر لڑکی اور ۲ سال سے کم عمر لڑکے کی شادی ممنوع قرار دیدی گئی تھی، اس قدر شدید مخالفت کی تھی۔ مولانا محمد علی خوب سمجھتے تھے کہ اس ایکٹ کے ذریعے شریعت پر مبنی مسلمانوں کے شخصی اور خاندانی قوانین کو ختم کر دینے کا آغاز ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس ایکٹ کے خلاف رائے عامہ کو ابھارنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ ٹکاب بھر کا اندرہ کیا اور جوش انگیز تقریریں کر کے مسلمانوں کو اس قسم کی بے بنیاد قانون سازی کے خطرات سے خبردار کیا۔ انہوں نے کہا:

• شخصی قانون میں عدم مداخلت کی ضمانت کو بنیادی قوانین کا ایک حصہ قرار دیا جائے اور مذہبی آزادی برقرار رکھنے کا یقین دلا جائے۔ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کے تجویز نام نہاد ہندو مسلم سمجھوتے کو جو مسترد کر دیا ہے تو اس کی ایک

وجہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے شخصی قانون کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی، حالانکہ برطانوی حکومت بار بار اس کی ضمانت دے چکی ہے۔۔۔۔۔

اسلامی قانون مسلمان مردوں اور عورتوں کو آزادی دیتا ہے کہ وہ کسی عمر میں بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ اسلامی قانون کا اطلاق تمام احوال، تمام ملکوں اور ہر قسم کے حالات پر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ایک مثالی قانون ہے، لیکن اب جس قسم کا قانون نافذ ہونے چلا ہے وہ نہ صرف انسانی آزادی کو پاؤں نہ بچیر کر دیتا ہے بلکہ خود قانون کو بھی سخت اور بے لچک بنا دیتا ہے۔ قانون کے لیے ضروری ہے کہ انسان فطرت کو منضبط کرے نہ کہ اس کے راستے میں حائل ہو۔ اسلام غلطی کرنے کو قبول نہیں کرتا تاہم نہاد "مصلحین" انسان کی۔ طبعی و اخلاقی۔ فطرت کے متعلق اپنے خالق کے مقابلے میں یقیناً کچھ بھی نہیں جانتے۔ اسلام ان کے طور طریق کی پیروی کرنے کے بجائے معاشرے کی اخلاقی پاکیزگی کا تحفظ کرتا ہے۔ (ص ۳۲۶)۔۔۔۔۔

شارد ایکٹ بچپن کی شادی کو مستوجب سزا ٹھہراتا ہے۔ وہ ناجائز تعلقات کو ممنوع قرار نہیں دیتا۔ بالفاظ دیگر وہ کہتا ہے: "تم شادی نہیں کر سکتے، البتہ زنا کر سکتے ہو" بلکہ عملاً بعض حالات میں وہ کہتا ہے: "تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیئے" ہاں اس کے بجائے تمہیں زنا ضرور کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے: "تم کسی عمر میں بھی شادی کر سکتے ہو، لیکن زنا کے قریب تک نہیں پیش کر سکتے۔" یہ تضاد امتداد واضح اور یقین پرور ہے کہ مسلمان اس امر کا فیصلہ کہ کون سا راستہ سیدھا و مستقیم ہے جس پر چلنا چاہیئے، کسی بھی ایسے صاحب فکر شخص پر چھوڑ سکتے ہیں جس کے دماغ پر تعصب نے پردہ نہیں ڈالا۔ (ص ۲-۳۳۱)۔۔۔۔۔ یہ درست ہے کہ آج کے انحطاط پذیر ادوار میں، جب کہ اسلام پر بُرے دن آگئے ہیں اور وہ بدزبانوں کا ہدف بن گیا ہے، اسلامی قانون کی روح کا







ہے۔ یہ مسئلہ بڑی سنگین نوعیت کا ہے اور یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے کسی خاص قوت کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کا شخصی قانون سخت خطرے میں ہے۔ (ص ۲-۳۴۱) اے

زندگی کے آخری دنوں میں مولانا محمد علی ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں متشکک ہو گئے تھے۔ وہ ذیابیطس کے مرض میں شدت سے مبتلا تھے اس کے باوجود دم توڑتی ہوئی اُمید کی ایک کرن ان کے دل میں باقی تھی چنانچہ سخت بیمار ہونے کے باوجود انہوں نے گولی میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن کا سفر کیا۔ وہاں کانفرنس میں اپنی زندگی کی آخری تقریر کی۔ اس میں انہوں نے کہا:

”میں اپنے وطن صرف اس وقت واپس جاؤں گا جب میرے ہاتھ میں

آزادی کا پر واند ہوگا۔ بصورت دیگر میں ایک غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں

گا۔ اگر تم ہمیں آزادی نہیں دیتے تو پھر مجھے یہاں ایک قبر دینی ہوگی۔“

تقریر کے بعد مولانا محمد علی کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری آرزو پوری ہو گئی۔ وہ ایک

غلام ملک میں لوٹ کر نہ آتے۔ بعض ممتاز عرب رہنماؤں کی درخواست پر ان کی میت

بیت المقدس بھیج دی گئی جہاں انہیں مسجد صخر کے جوار میں دفن کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی کی نمایاں ترین خصوصیت ان کا اخلاص تھا۔ وہ عجیب و غریب شے،

جو سیاست کی دنیا میں شاد و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کے لیے مخلص تھے،

اپنے آپ کے لیے مخلص تھے۔ راست باز، صاف گو اور بے باک تھے۔ خواہ مقصد درست ہوتا

یا نادرست موقع شناسی اور جوڑ توڑ تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔ اگر مقصد درست ہوتا تو اسے

انجام تک پہنچانے کے لیے اپنی شخصیت کا سارا وزن اس کی جدوجہد میں ڈال دیتے۔ اگر نادرست ہوتا

تو اس کے خلاف اُخردم تک سخت جنگ لڑتے۔ ان کا یقین و اذعان نہایت گہرا اور جوش و جذبہ بے پایاں تھا، ان کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔

یہ وصف مولانا محمد علی میں انتہا درجے کا تھا اور اسی کی بدولت وہ اسلام کے صعیبِ اول کے مجاہد بن گئے تھے۔

۲۸۰

## پیم اقبال

اسلامی معاشرہ میں مغربی استیلا کے لاتے ہوئے تند و تیز تہذیبی انتشار کے درمیان حکیم الامت شاعر مشرق علامہ محمد اقبال جدید مسلم لٹریچر میں یکساں مقام رکھتے ہیں۔ عرب دنیا میں مصر کے احمد شوقی (۱۸۹۸-۱۹۶۲) اور ابراہیم حافظ (۱۸۷۱-۱۹۳۲)، شام کے خلیل مطران (۱۸۹۹-۱۹۶۹) اور عراق کے معروف الرضائی (۱۸۷۵-۱۹۶۵) ان کے ہم عصر شعراء تھے۔

اول انڈکرٹمنیوں شاعر اسلامی موضوعات کو اپنی شاعری میں لادین قوم پرستی کے مقاصد پر راکرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور آخر الذکر مادہ پرستانہ فلسفے کا مبلغ تھا۔ ان کے مقابلے میں علامہ اقبال نے اپنی تمام خدا داد ادبی صلاحیتیں بجان و دل اسلام کے لیے وقف کر دیں۔ اگرچہ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے تاہم انہوں نے وجودی خیالات، عشق و محبت اور حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت سے گریز کیا جو فارسی زبان کے تمام کلاسیکی شعراء کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری سے باریب ڈسک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام میں فن کے صحیح کردار کا گہرا ادراک رکھتے تھے نہی الحقیقت یہ دعویٰ مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ اقبال عصر حاضر کے ان معدودے چند فن کاروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی لازوال اور اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل شاعری میں ایک مسلمان کے نقطہ نظر کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔



علامہ اقبال اور پنچے طبقے کے ایک کشمیری برہمن خاندان کی نسل سے تھے۔ یہ خاندان کوئی تین سو برس پہلے مشرق بر اسلام ہوا تھا۔ اقبال پنجاب میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور مسلم اور مغربی دونوں تہذیبوں کے ساتھ میں مکمل طور پر تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج سے ڈگری لی اور چھ برس تک لیکچرار رہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انہوں نے کیمبرج اور میونخ میں فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔ لاہور لوٹے تو وکالت شروع کی۔ وکالت میں بس اتنا وقت صرف کرتے جس سے معمولی گذران ہو سکے۔ فاضل وقت شعر و سخن میں گزارتے۔

۱ شعر کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود علامہ اقبال غلطی سے محفوظ نہ تھے۔ بد قسمتی سے ان کی تحریریں بحیثیت مجموعی تناقضات سے یکسر پاک نہیں ہیں۔ اقبال اپنی زندگی میں ذہنی ارتقاء کی مختلف منزلوں سے مسلسل گزرتے رہے اور زندگی کے بالکل آخری چند سالوں میں اسلام کے ایک بے آمیزش تصور کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کر سکے۔ ابتدائی سالوں میں ان کے اسلامی خیالات کے ساتھ بہت سے خارجی نظریات و اثرات بھی بے روک ٹوک خط مدطر رہے جیسے...

ان سے چند ایک انتہائی قابل اعتراض فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ یہ وہ انتقابات ہیں جو ان کی انگلیزی کی دوزخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر کی گئی ہے، جن سے عالم اسلام کی تجدید پسند تحریکوں کو مدد ملتی ہے اور جن میں کمال انا ترک کی ترکی کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔

۱۹۲۸ء میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس کی درخواست پر علامہ اقبال نے مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں خطبات دیئے۔ بعد ازاں ان خطبات کو ان کے صاحب زادے جاوید اقبال نے یکجا اور مرتب کر کے (The Reconstruction

۱ مصنف کے نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مکتوب مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ء سے ایک اقتباس۔

of Religious Thought in Islam) کے نام سے

کتابی صورت میں شائع کیا ہے دوسری قابل اعتراض تحریر ان کے ایک پمفلٹ (Islam

and Ahmadesm with a reply to Questions raised by

Pandit Nehru) (اسلام اور احمدیت) میں ملتی ہے۔ یہ پمفلٹ جیسا کہ نام

سے ظاہر ہے انہوں نے پنڈت نہرو کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس پمفلٹ میں ترکی میں کمالی اصلاحات پر بڑی طویل طویل بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اصلاحات غیر اسلامی نہیں ہیں، عیسائی مشنری، مغربی مستشرقین اور ہمارے ویسی متجددین، سب اسلامی اقدار کے خلاف اپنے تخریبی دلائل کی تائید میں ان تحریروں کو پیش کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ چونکہ یہ اقبال ایسی عظیم شخصیت کی تحریریں ہیں اس لیے جب یہ لوگ انہیں اپنے مرقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں، تو ان کے شر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ بدترین پہلو یہ ہے کہ انگریزی بولنے والی دنیا اقبال کی فارسی اور اردو شاعری سے بے خبر ہے۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں علامہ اقبال کے نظریات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتی ہیں۔ اس طرح مصنف خود جس نصب العین پر گرجوشتی سے یقین رکھتا ہے اور جس کے لیے اُس نے زبردست جدوجہد کی ہے، اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

• پچھلے پانچ سو برس سے الہیات اسلامیہ پر عملاً جمود کی کیفیت طاری ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے افکار و خیالات اسلام سے متاثر ہو کر تھے تھے۔ تاریخِ حاضرہ کا سب سے زیادہ ترجمہ طلب منظر یہ ہے کہ فکری اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی قیادت نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب

۱۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی تشکیلی جدید الہیات اسلامیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

در اصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

ہمارے متجددین عالم اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کے حق میں بالعموم یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ معتزلہ جہنمیں تمام جہور علماء بدعتی قرار دے کر مسترد کرتے ہیں، انہی نے یونانی فلسفے کو یورپ میں منتقل کیا تھا۔ یہ محض ایک تاریخی اتفاق تھا۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یونانی فلسفہ یونانی فلسفہ ہی رہے گا، خواہ اس کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگوں کا نام مسلمانوں جیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اقبال اسی کتاب میں مندرجہ بالا دلیل کی خود تردید کرتے ہیں اور جدید مغربی فلسفے کی روشنی میں اسلامی اصولوں کی تعبیر جدید کی کوشش کو بالکل بے کار اور بے نتیجہ قرار دیتے ہیں:

”عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالم گیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ نے ان خطوط پر متعدد عینی نظام قائم کیے، لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہو سکتی جو وحی و تمزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا۔ اس کے برعکس مذہب نے افراد کو سر بلند کرنے کے ساتھ ساتھ پورے کے پورے معاشرہ تک کو بدل ڈالا۔ یورپ کی عینیت پرستی اس کی زندگی کی زندہ و موثر قوت کبھی نہیں سکی۔۔۔۔۔ یقین کیجئے آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں یورپ سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔“

۱۔ الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید (اردو ترجمہ) ص ۱۱

۲۔ حوالہ سابق ص ۲۷۶



علامہ اقبال نے اپنی کتاب "الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" میں ایک اور غلطی بھی کی ہے۔ متجددین علامہ کی شہرت و عظمت کے سہارے اپنا اُتو سیدھا کرنے کے لیے اس غلطی کو اچک کر اپناتے ہیں، حالانکہ اقبال جتنے عظیم شاعر ہیں ان کی یہ غلطی بھی اتنی ہی عظیم ہے۔

"پچھلے متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بیہوشی کی نیند طاری تھی، یورپ نے ان عظیم مسائل میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو دلی شغف رہا ہے۔ قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک، جب مسلمانوں کے الہیاتی مکاتب کی تکمیل ہوئی، انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں بے پایاں ترقی ہوئی ہے..... لہذا اگر ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی نئی پود کا مطالبہ ہے کہ ہم اپنے دین کی تعلیمات کا رخ پھر سے متعین کریں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، لیکن مسلمانوں کی اس تازہ بیداری کے ساتھ اس امر کی تحقیق نہایت ضروری ہے کہ مغربی فلسفہ و فکر کیا ہے۔ علیٰ حذایہ کہ الہیات اسلامیہ کی نظر ثانی بلکہ ممکن ہو تو تشکیل جدید میں ان نتائج سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے جو اس سے مرتب ہوئے ہیں (خواہ اس باب میں ہمیں اپنے پیشرووں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے)۔"

علامہ اقبال نے اپنی مشہور فارسی مثنوی "امر از خودی" میں بالکل مختلف خیالات کا

اظہار کیا ہے:

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے      کیفِ حق از جامِ این کافہ مجوے



مدتے محبتگ و دو بودہ ام      رازدان دانش نو بودہ ام  
 باغبانان امتیازم کردہ اند      محرم این گلستانم کردہ اند  
 گلستان لاله زارِ عبرتے      چوں گل کاغذ سرب نکبتے  
 دانش حاضر حجاب اکبر است      بت پرست و بت فروش و بتگر است  
 پابزدانِ مظاہر بستہ      از حدودِ حسن بروں ناجستہ  
 در صراطِ زندگی از پافستاد      بر گلوئے خوشتن خنجر نہاد

علامہ اقبال کی ایک قابلِ اعتراض تحریر اور بھی ہے جسے ہمارے متجددین حقیقی اسلامی  
 اقدار کو ترک کرنے اور عالم اسلام کو مغربی رنگ میں رنگنے اور جدید طرز پر استوار کرنے کے حق میں اجتہاد  
 کا دروازہ کھول دینے کے نام پر پیش کرتے ہیں۔

• مسلمانوں نے گرد و پیش کی قوموں سے تہذیب و ثقافت کے جو  
 عناصر اخذ کیے ان کو ہمیشہ اپنے مذہبی مطلع نظر کے ڈھال لیا۔۔۔۔۔ اسلام کی روح  
 قانون کی دنیا میں اور سبئی نمایاں ہے۔۔۔۔۔ قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔  
 اس کا حقیقی منشا، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، یہ ہے کہ نہ ہن انسانی میں  
 اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالق کائنات سے ہے، اعلیٰ و برتر شعور پیدا  
 کرے۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطلع نظر ہے جو اس  
 نئے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اُس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت  
 پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطلع نظر ایسا ہو گا اس کی روش ارتقاء و کجالات  
 کیسے ہو سکتی ہے؟۔۔۔۔۔ دنیا سے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے  
 متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کے ہر سمت میں غیر معمولی نشو و نما  
 کے باعث پھیل رہی ہیں۔ مجھے اجتہاد کے دروازے کو اب مزید کچھ مدت تک  
 بند رکھنے کا کوئی حقیقی سبب نظر نہیں آتا۔ اندریں صورت اگر آزاد خیال مسلمانوں

کی نئی پروید دعویٰ کرتی ہے کہ اُسے اپنے تجربات اور زندگی کے بدلنے ہوئے احوال و  
ظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو  
میرے نزدیک وہ اس بات میں پوری طرح حق بجانب ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کہ  
زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خدا اس امر کی مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی  
ہر نسل اپنے اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے  
اور اس راہ میں اُسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

یہ مجددین جو اسلام کے خلاف اپنے غلط استدلال کی تائید میں علامہ اقبال کی عظمت کا حوالہ  
دیتے ہیں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ خود اقبال نے ”موزبے خودی“ میں بڑے  
فصیح انداز میں بالکل متضاد رائے ظاہر کی ہے:

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند	خویش را زنجیر قی آئیں کند
باز اے آزاد و ستور تدیم	زینت پاکن ہماں زنجیر مسم
شکوہ سنج سختی آئیں مشو	از حدود مصطفیٰ بیرون مشو
تو ہی دانی کہ آئیں تو چیست؟	زیر گردوں ستر تمکین تو چیست؟
اں کتاب زندہ شد آن حکیم	حکمت ادلائزال است و قدیم
حرف اور ارب نے تبدیل نے	ایہ اش شد مندۃ تادیل نے

در شریعت معنی دیگر	غیر فہم و باطن گوہر
ایں گہرا خود خدا گوہر گراست	ظاہر ش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت هیچ نیست	اصل سنت جز محبت هیچ نیست

باترگویم ستر اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام شرع

اسی نظم میں علامہ اقبال بڑے نصیحانہ انداز کے ساتھ اپنی انگریزی کتابوں کی تحریروں کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانے میں ماضی کے ساتھ متن و متن مطابقت آزادانہ قیاس آرائی اور اجتہاد سے کہیں بہتر ہے :

اے پریشاں محفلِ دیرینہ است	مرد شمعِ زندگی در سینه است
نقشِ بر دل معنی تو حید کن	چارہ کارِ خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط	قوم را بر ہم ہی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر	اقتدارِ رنگانِ محفوظ تر
عقلِ آبیت ہوسِ فرسودہ نیست	کارِ پا کاں از غرضِ آوردہ نیست
فکرِ شاں رسید ہے باریک تر	ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

از یک آئینی مسلمان زندہ است	پیکرِ ملت ز قرائن زندہ است
ماہمہ حناک و دلِ آگاہ ادست	اعتصامش کن کہ جبل اللہ ادست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو	ورنہ مانند غبارِ آشفتمہ شو

راہِ آبار و کہ ایں جمعیت است معنی تقلید ضبط ملت است

بامرید سے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر  
 قلبِ رازی چون حق گرداں توی با عرب در ساز تا مسلم شوی  
 اسلامی اقدار کی قدر و قیمت سے بے خبر لوگ جب اجتہاد کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں تو فی الواقع کیا نتائج رونما ہوتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے کیا جاسکتا ہے :

• اگر مذہب کا مقصد فی الواقع یہ ہے کہ انسان کا دل روحانیت سے بھر دے تو ضرور ہے کہ وہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتے، لیکن ترکی شاعر غیاث گوکلیپ کہتا ہے جب تک مذہب کے روحانیت خیز افکار مادی زبان میں ادا نہیں کیے جاتے ایسا ہر ناممکن ہے۔ بایں ہمہ عربی کو ترکی سے بدلنے کا یہ خیال مسلمانان ہند کی غالب اکثریت کو ناگوار گزرے گا اور وہ اس کی مذمت کریں گے۔ یوں بھی اعتبار ان رجوع کے جن کا ذکر آئے گا، شاعر کا یہ اجتہاد بڑا قابلِ اعتراض ہے؛ تاہم اسلامی تاریخ میں اس قسم کی اصلاح کی ایک مثال بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی اندس کے مہدی محمد ابن تورث نے جس کی قومیت بربر تھی، جب اقتدار حاصل کیا اور موحیدین کی زبردست حکومت قائم کی تو حکم دیا کہ بربر چونکہ ایک ناخواندہ قوم ہیں، لہذا ان کی خاطر سے قرآن مجید کا ترجمہ اور تلاوت بھی بربری زبان ہی میں کی جائے۔ اذان بھی بربری ہی میں ہو، حتیٰ کہ علماء و فقہاء بھی اس کی تحصیل کریں.....

در اصل مسلمان قوموں میں صرف ترک ایک ایسی قوم ہیں جو قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ صرف ترکوں ہی نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور وہ ایک خیالی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں آچکے ہیں، لیکن یہ وہ تغیر ہے جس کے لیے انسان کو ایک زبردست دماغی اور اخلاقی کشاکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ ایک ہر لحظہ حرکت اور وسعت پذیر زندگی کی روز افزوں پیچیدگیوں کی بدلت انہیں نئے نئے حالات اور نئے نئے نقطہ ہائے نظر سے سابقہ پڑتا اور وہ ان اصولوں کی از سر نو تعبیر پر مجبور ہو جاتے جو روحانی وسعتوں کی مسترت سے محروم قوم کے لیے خشک بجٹوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے..... اکثر مسلمان



ممالک میں پرانی قدروں ہی کا تکرار بالکل مشینی انداز میں جاری ہے، البتہ ترک  
نئی قدریں وجود میں لانے کی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ بڑے بڑے اہم تجربات سے دوچار  
ہو چکے ہیں اور ان تجربات نے اُن پر اُن کے اندرون ذات کو منکشف کیا ہے۔  
ان کی زندگی میں حرکت، تغیر اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں نئی نئی  
اُردو میں، نئی نئی مشکلات رونما ہو رہی ہیں اور ذہنوں کو نئی نئی تعبیریں سمجھا رہی  
ہیں۔۔۔۔۔“

تاہم اپنی زندگی کے آخری زمانے میں علامہ اقبال کے نظریات اس باب میں بالکل بدل گئے۔  
ترکی میں کمالِ آنا ترک نے جو تجربہ کیا اُسے انہوں نے مغربی مادہ پرستی کی انتہائی مشینی اور غیر تخلیقی  
روحیت کی اندھی نقالی قرار دیا؛ چنانچہ مغربِ کلیم میں کہتے ہیں:

ترا وجود سراپا تجلی افروزنگ  
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر  
مگر یہ پیکرِ خاکِ خودی سے ہے خالی  
فقط پیام ہے تو زنگار و بے شمشیر

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود  
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجودِ ترا  
وجود کیا ہے؟ نقطہ جو ہر خودی کی نمود  
کہ اپنی فکر کہ جو ہر ہے بے نمود ترا  
اسی طرح ایک اور بیان ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری زمانے  
میں خود تسلیم کیا کہ ان سے زبردست غلطی ہوتی تھی، لیکن جسے ہمارے متجددین جو عالمِ اسلام کو  
مغرب کے رنگ میں رنگنا اور جدید بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں، پوری بے باکی کے  
ساتھ اپنے مرقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں:

”علماء ہمیشہ اسلام کی زبردست طاقت کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن گزشتہ

کئی صدیوں کے دوران میں، خصوصاً بغداد کی تباہی کے بعد سے وہ از حد رجعت پسند بن چکے ہیں اور اجتہاد کا حق دینے پر راضی نہیں ہوتے؛ چنانچہ انیسویں صدی کے مصلحین کا مقصد اولیں یہ تھا کہ مذہب کو پھر سے نیا رنگ دیا جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں شریعت کی نئی تعبیر کرنے کی آزادی دی جائے.....

ان مصلحین نے عالم اسلام کے افکار و خیالات میں جو تغیر برپا کیا، یہاں اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں؛ تاہم ایک بات واضح ہے۔ انہوں نے مصر کے زخلول پاشا، ترکی کے کمال اتاترک اور ایران کے رضا شاہ پہلوی ایسے لوگوں کی جماعت کے لیے زمین بڑی مدت تک تیار کر دی۔ سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ نے ترجمانی کا کام کیا، دلائل فراہم کیے اور مسائل کی توضیح و تشریح کی، لیکن ان کے بعد آئیو اسے لوگوں نے، جو اگر علمی پایہ میں ان حضرات سے کمتر ہیں، لیکن اپنے محنت مند وجدان پر اعتماد کرتے ہوئے سوسج کی روشنی سے منور خلاء میں آگے بڑھنے اور ہر وہ کام کر گزرنے کی جرأت رکھتے ہیں، زندگی کے نئے احوال و ظروف جس کا تقاضا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں طاقت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

..... ترکی میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو بظاہر اسلام کی ضد نظر آتا ہے کیا یہ عام مادی نظریہ کی ارتقائی صورت ہے؟ اسلام نے ترک دنیا سے بہت زیادہ بھرپا پایا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان حقائق پر غور کریں۔ مادہ پرستی بلاشبہ مذہب کے خلاف ایک گھٹیا ہتھیار ہے، لیکن تلائیت اور مصونیت جو لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کو کام میں لانے کے لیے انہیں بیوقوف بناتی ہیں، ان کیخلاف اس ہتھیار کے موثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اسلام کی روح مادہ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے ذرا بھی خائف نہیں۔ ایک غیر مسلم جب عالم اسلام کی گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ پر غور کرتا ہے تو یہ



مولانا مودودی کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جنہوں نے علامہ اقبال کو ان کی زندگی کے آخری سالوں میں دیکھا۔ علامہ اقبال نے مندرجہ بالا نظریات کی وکالت و حمایت کس لیے کی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا میر سے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

”اقبال کے نظریات ایک زمانے تک خالصتہ اسلامی نہ تھے بلکہ ان میں مسلم قوم پرستی کی آمیزش تھی۔ اس آمیزش کو غالباً وہ زندگی بھر اپنے نظریات کے دامن سے نہیں بھاڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمان رہنماؤں اور حکمرانوں کی خدمت سے بالعموم احتراز کرتے تھے اور بعض اوقات شاعرانہ تنگی میں ان کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی تائید تک کر گزرتے تھے۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہندو پاکستان کے مسلمانوں میں ترکی کے ساتھ جو گہری ہمدردی پائی جاتی تھی اس کے بہت سے تاریخی اور سیاسی عوامل تھے۔ مسلمان برطانوی قوم کے غلام ہونے کے بعد اپنی عظمت رفتہ کی اس نشانی سے ایک جذباتی نگاہ رکھتے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی مدافعت کرتے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی گرتی ہوئی مسلمان ریاست کو بچانے کے لیے جو کچھ کیا تھا اس کے صلے میں یہاں کے مسلمان اصحاب علم اور مفکرین کمال آتاترک کے غیر اسلامی اور صریحاً کافرانہ اعمال سے اغماض کرنے پر تیار رہتے تھے۔ اس ذہنی اور جذباتی پس منظر میں اقبال بھی ۱۹۳۰ء تک کمال آتاترک کی اصلاحات کی صفائی اور ان کی تادیلات پیش کرتے اور ان کے لیے اسلام میں جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے، لیکن آخر کار ہمارے شاعر کا پیانہ صبر بھی لبریز ہو گیا اور وہ کمالی بدعات کی علانیہ مذمت کرنے لگے.....“

چنانچہ بال جبریل میں کہتے ہیں:



شعور ہوش و خود کا معاملہ ہے عجیب  
 مقام شوق میں ہیں سب دل و نظر کے قریب  
 میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا  
 مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب  
 اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف  
 مری نوا میں نہیں طائرِ چین کا نصیب  
 سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی  
 سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب  
 سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا  
 ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب  
 نیز ضربِ کلیم میں کہتے ہیں؟

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا  
 نسیم صبح چین کی تلاش میں ہے ابھی  
 نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی  
 کہ رُوح شرقِ بدن کی تلاش میں ہے ابھی  
 مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن  
 زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

ان فکری لغزشوں سے قطع نظر، جہان کی انگریزی تالیفات میں راہِ پاکتی ہیں، اقبال اسلام  
 کے نصب العین پر پختہ یقین رکھتے تھے اور اس راہ میں ان کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں پائے۔  
 ان کی پختہ یقینی اور پُر خلوص مقاصد کا اندازہ ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے جن میں انہوں نے  
 صفتِ نسواں کے اسلامی تصور کی عکاسی کی ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است      زانکہ اورا بانہوت نسبت است  
گفت آن مقصود خوف کن فکاں      زیر پائے آہات آمد جہاں  
ملت از تکیم ارحام است و بس      ورنہ کار زندگی خام است و بس

آن درخ رستاق زادے جاہے      پست بالائے سطرے بد گئے  
ناتراشے پرورش نادادہ      کم نگاہے کم زبانے سادہ  
دل ز آلام امومت کردہ خوں      گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگون  
ملت از گروزِ آغوشش بدست      یک مسلمان غیور و حق پرست  
ہستی ماحکم از آلام ادست      میج ما عالم فروز از شام ادست  
واں تہی آغوش نازک پیکرے      خانہ پرورد نگاہش محشرے  
فکیراد از تاب مغرب روشن است      ظاہر شش زن باطن ادنا زن است  
بند ہائے ملت بیضا گینت      تازہ چشمش عشوہ حاصل کردہ ریخت  
شوخ چشمہ و فتنہ ز آزادیش      از حیا نا آشنا آزادیش  
علم او بارِ امومت بر تافت      بر سر شامس یکے اختر تافت

ایں گل از بہستانِ ما ناستہ بہ

داغش از دامنِ ملت شستہ بہ

مزرع تسلیم را حاصل بتزلزل      مادران را اسوہ کامل بتزلزل  
نوری دہم آتشی فرما بزشت      گم رہناش در رخصتے شوہر ش  
آن ادب پروردہ صبر و رضا      آسیا گردان دلب قرآن مرا

اے این نعمتِ آیین حق      در نفسہائے تو سوزِ دین حق

دورِ حاضر تر فروش و پر فن است      کاروانش تقدیریں رار ہزن است  
 کور ویز داں ناشناس ادراکِ اد      ناکساں زنجیری پچپاکِ او  
 چشمِ او بے باک و نا پرواستے      پنجہ مژگانِ او گیراستے  
 صیدِ او آزاد خواند خویش را      کشتہ او زندہ داند خویش را  
 آبِ بندِ نخلِ جمعیت توئی      حافظِ سرمایہٴ ملت توئی  
 کوکِ ماچوں لب از شیر توشت      لالہ آنوختی او را نخست  
 از سرِ سود و زیاں سودا مزن      گام جز بر عبادہٴ ابا مزن  
 ہوشیار از دستبردِ روزگار      گیرند زندانِ خود را در کنار  
 این چمن زاداں کہ پر نکشاده اند      ز آشیانِ خویش دور افتاده اند  
 فطرتِ تو جذبہٴ ما دارد بلند      چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مہند

تا حینے شاخِ تو بار آورد

موسمِ پیشیں بگزار آورد

عالمِ اسلام میں ایسے متاد لوگ چند ایک ہی ملتے ہیں جنہیں اقبال کی طرح یورپ کے علوم اور فلسفے میں گہرا درک حاصل ہے۔ اگرچہ اسلام پر ان کا یقین و اعتقاد کبھی ڈانواں ڈول نہیں ہوا، لیکن وہ اپنے عوام کی ذلت و پستی کا مقابلہ انگلستان اور جرمنی ایسے ممالک کی طاقت، خوش حالی اور اثر آفرینی سے کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ اس کا سبب وہ تناقض ہے جو ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے اور جن کا ذکر ہم قبل ازیں کر چکے ہیں: تاہم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی خوش خیالیاں بیکار ثابت ہوئیں اور بصیرت بھی اور گہری ہو گئی انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

(عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے      حرمِ کار از توحیدِ اہم ہے)  
 (تہی وحدت سے ہے اندیشہٴ غرب      کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے)  
 (ربالِ جبریل)

نظر آتے نہیں بے پردہ صفتائق اُن کو  
 انگہ جن کی ہوتی محکومی و قتلید سے کور  
 زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر  
 یہ قرنگی مدنیّت کہ جو ہے خود لبِ گور  
 (مغربِ کلیم)

---





## مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جو دور جدید میں عالم اسلام کے سب سے بڑے اور با اثر رہنما ہیں، ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد دکن کے شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِ اعلیٰ سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ تھے جن کی تعلیمات ان کے خلیفہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ذریعے برصغیر ہندوپاک میں پہنچیں۔ ولادت سے تین سال پہلے ایک خدارسیدہ بزرگ مولانا مودودی کے والدِ گرامی کے پاس آئے اور انہیں بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد انہیں ایک بیٹا عطا کرے گا۔ اُس کا نام وہ ابوالاعلیٰ رکھیں۔ یہ سچہ بڑا ہو کر دین اسلام کا نامور خادم بنے گا۔ مولانا مودودی کے والد وکیل تھے۔ وہ اگرچہ اُسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو سید احمد خاں کا تھا اور انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی؛ تاہم اُس کے چل کر وہ مغربی تہذیب، برطانوی حکومت اور اس کے حامیوں سے بیزار ہو گئے۔ مغربی تہذیب سے اس کراہت کی بنا پر وہ اپنے صاحبزادوں کو انگریزی سکولوں میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے؛ چنانچہ ان کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی تعلیم کا گھر ہی انتظام کیا۔ مولانا مودودی سولہ برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ اس طرح انہیں حصولِ معاش کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنی صمانتی زندگی کا آغاز کیا اور متعدد اخبارات میں کام کرتے رہے۔ ابتدائی زندگی کے اس دور میں مودودی صاحب

مولانا محمد علی جوہر کی تحریکِ خلافت کے سرگرم حامی تھے، جو انہوں نے حکومتِ ترکی کی تائید و حمایت اور اس آخری اہم اسلامی مملکت کو مغربی استعمار کے تباہ کن عزائم سے بچانے کے لیے جاری کی۔

۱۹۲۶ء میں مولانا مودودی کی کتاب ”الجہاد فی الاسلام“ شائع ہوئی اور عام پڑھے لکھے لوگوں کی ترجمان کی جانب مرکوز ہو گئی۔ اس کتاب میں مولانا نے اسلام کے تصورِ جہاد کا موازنہ جنگ کے جدید بین الاقوامی قانون سے کیا اور قدیم و جدید طریق کے درمیان جو فرق ہے اس کی وضاحت کی۔ مولانا نے اسی موضوع پر ایک پمفلٹ ”جہاد فی سبیل اللہ بھی لکھا۔ اس پمفلٹ کا جب عربی ترجمہ شائع ہوا تو شیخ حسن البنا و اس کے فکر سے بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اسے اور مولانا کی دوسری تصانیف کو اپنے جماعتی لٹریچر میں شامل کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا مودودی نے اپنی مشہور اور مقبول عام کتاب ”رسالہ دینیات“ شائع کی، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو خالص اسلام کا تصور دینا اور اُس کے حق میں ذہنوں کو مستعد کرنا تھا۔ رسالہ دینیات کا ترجمہ ایک درجن سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور دنیا بھر میں ایک لاکھ سے زیادہ نسخے نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب بعض مسلمان ممالک کے سرکاری سکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہے اور اس سلسلے میں معیاری کتاب شمار کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی نے ماہنامہ ترجمان القرآن نکالنا شروع کیا۔ اس مجلہ میں مولانا اور اُن کے ہم خیال ساتھیوں کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں تین عشروں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ ترجمان القرآن اردو دہلے والے خواندہ عوام کو خالص اسلام کی دعوت کا سب سے بڑا علمبردار مجلہ ہے۔

۱۹۳۷ء میں فلسفی شاعر علامہ محمد اقبال نے مودودی صاحب کو لاہور آنے اور احیائے اسلامی قانون کے لیے اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے کی دعوت دی، لیکن قبل اس کے کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرتا، بدقسمتی سے اقبال انتقال کر گئے۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا مودودی نے اسلامیہ کالج لاہور کے

شعبہ اسلامیات کے صدر کی اعزازی خدمت انجام دی۔

مغرب زدگی، مادیت پرستی، قوم پرستی اور لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا مودودی

نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس کی۔ اس جماعت کا مقصد خالص اسلام کی بنیادوں پر  
عصر حاضر کے مسلمانوں کی زندگی کی مکمل اصلاح اور ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ تھا۔

مسلم ہندوستان میں مولانا مودودی سے بڑھ کر تحریک پاکستان کی پرجوش حمایت کسی اور

نے نہیں کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کتابیں لکھیں، پمفلٹ شائع کیے اور تقریریں کیں اور

ہندوستان کے مسلمانوں کو بدلتی بتایا کہ وہ ایک جداگانہ ملت ہیں اور اگر ہندوؤں کے استیلا اور

جوہر کے خطرے سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کی اپنی مملکت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جنگ

آزادی کے بڑے بڑے رہنما مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی حتیٰ کہ قائد اعظم بھی ایک

زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے رکن ہوا کرتے تھے، لیکن مولانا مودودی ایک دن کے لیے

بھی کانگریس میں شریک نہیں ہوتے۔ جب قائد اعظم کو جماعت اسلامی میں شریک ہونے کی دعوت

دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ جماعت اور مسلم لیگ کے درمیان ذرا بھی آپزیش نہیں ہے۔ ایک

جماعت بلند تر نصب العین کے لیے کام کر رہی ہے اور دوسری ایک علیحدہ مملکت کے حصول

کی جدوجہد کر رہی ہے جو مسلمان ہند کی فوری ضرورت ہے اور اگر یہ مملکت حاصل نہ ہو سکی تو

جماعت اسلامی کی دعوت کو عملی جامہ پہنانا ناممکن ہو جائے گا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہو گیا۔ مولانا مودودی نے اپنی ساری جدوجہد پاکستان کو ایک

خالص اسلامی مملکت بنانے پر مرکوز کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں جنوری اور مارچ کے درمیانی عرصے

میں مولانا مودودی نے ریڈیو پر پانچ تقریریں نشر کیں جن میں اسلام کی روحانی، اخلاقی،

معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کی نمایاں ترین خصوصیات بیان کیں۔ ان کے

لے قمر الدین خان کے بیان کا ایک اقتباس "دی تھنکر" ویکی، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء۔



نزدیک اسلام محض ایک نعرہ نہ تھا۔ اُن کا شمار ملک کے اُن چند رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کا عمل اُن کے قول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی لازوال قوت و توانائی اس مقصد کی راہ میں لگا دی۔ ملک بھر کا دورہ کیا، جگہ جگہ تقریریں کیں اور پاکستان کو ایک مکمل ریاست بنانے کے حق میں مسلمان عوام کی تائید و حمایت کو منظم کیا۔ بعض مفاد پرستوں کے ایسے مقصد سے یہ خلوص اور راست بازی ناقابلِ برداشت تھی۔ جب انہوں نے ملک کے ایسے خالص اسلامی دستور بنانے کا مطالبہ کیا تو ان پر ریاست کے دشمن ہونے کا الزام عائد کر کے انہیں ۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گرفتار کر لیا گیا، چنانچہ ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء تک مجبوس رہے۔ تاہم ان کی جدوجہد کامیاب رہی۔ ۳ مارچ ۱۹۴۹ء کو قومی دستور یہ نے قرارداد مقاصد منظور کی، جس میں وہ تمام مطالبات شامل تھے جو مولانا لے ملک کو اسلامی دستور کی بنیادیں فراہم کرنے کے لیے کیے تھے۔

قرارداد مقاصد کا مکمل متن حسبِ ذیل ہے:

ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور پاکستان کے عوام حدودِ الہی میں رہتے ہوئے جو اختیار حکمرانی استعمال کریں گے، وہ ایک مقدس امانت ہے۔

پاکستان کے عوام کی یہ نمائندہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رُو سے مملکت حکمرانی کے تمام حقوق و اختیارات عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے۔

جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کی تعلیمات اور اُس کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دے سکیں۔

جس کی رُو سے اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے

مذہبی معتقدات کے مطابق عمل کر سکیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کو ترقی دے سکیں۔  
جس کی رُو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں شامل ہیں یا ہو گئے ہیں اور ایسے  
دوسرے علاقے جو آئندہ پاکستان میں شامل یا اُس کے ساتھ ملحق ہوں گے، ایک وفاق قائم  
کریں گے جس کے اجزائے ترکیبی مقرر کردہ حدود اربعہ اور متعینہ اختیارات کے اندر خود مختار  
ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون اور اخلاق  
عامہ کے مطابق حیثیت اور مواقع میں مساوات، قانون کی نظر میں برابری، معاشرتی، معاشی  
اور سیاسی انصاف، رائے اور اظہار کی آزادی، ایمان اور عقیدے کی آزادی، مذہبی رسوم  
کی آزادی اور اجتماع کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ اور پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا  
مناسب انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے عدلیہ کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقیہ کے علاقوں کی سالمیت اور اُس کی آزادی اور اُس کے جملہ  
حقوق کا، جن میں اُس کے بروجرا اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا  
جائے۔

تاکہ اہل پاکستان فلاح اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں، اقوام عالم کی صف میں  
اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود  
میں قابل قدر اضافہ کر سکیں۔

۱۹۵۱ء میں ایک اہم سنگ میل نصب کیا گیا۔ تقریباً چودہ صدیوں کے بعد پاکستان

کے تمام بڑے — دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ — مکاتب فکر کے

۳۱ آئندہ علماء کرامچی میں ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴ جنوری کو جمع ہوئے اور مکمل اتفاق رائے

سے اسلامی مملکت کے ۲۲ بنیادی اصول مرتب کر کے مطالبہ کیا کہ انہیں پاکستان کے دستور میں لازماً شامل کیا جائے۔ اس متفقہ فیصلے میں حسب ذیل امور کی مراحت کی گئی تھی۔

- ۱۔ اصل حاکم تشرعی و تکنیکی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔
- ۲۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا، اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔
- تشرعی نوٹ: اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تشریح ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔
- ۳۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔
- ۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلا اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔
- ۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتہ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔
- ۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال



سقی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷۔ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے اُن کو عطا کیے ہیں یعنی حدود و قانون کے اندر تحفظ جان و مال و اکبر و آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبارت، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور نہ کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقعہ صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹۔ مسئلہ اسلامی فرقوں کو حدود و قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود و قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا انتظام اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق چلانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود و شریعہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدبیر، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔



- ۱۳۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔
- ۱۴۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شوراوی ہوگی۔ یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔
- ۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ دستور کو کٹایا جزاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔
- ۱۶۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اُسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔
- ۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔
- ۱۸۔ ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گے۔
- ۱۹۔ محکمہ عدلیہ محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ و آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بیعت انتظامیہ سے اثر انداز نہ ہو۔
- ۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔
- ۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطار مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ بات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوں گی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا، مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔
- ۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

۱۹۵۲ء-۱۹۵۳ء کے دوران میں پنجاب کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبے کو ناکام کرنے کے لیے مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں مولانا مودودی نے ایک پمفلٹ ”قادیانی مسئلہ“ لکھا۔ اس پمفلٹ میں مولانا نے مسلمانوں کے اس مطالبے کی حمایت اور حکومت کی پالیسی کی مذمت کی۔ انہوں نے لکھا:

”قادیانیوں کی کفر کا معاملہ دوسرے گروہوں کی باہمی تکفیر بازی سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ قادیانی ایک نئی نبوت لے کر اُٹھے ہیں اور ان تمام لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہ لائیں۔ قادیانی مسلمانوں کے اندر مسلمان بن کر گھستتے ہیں، اسلام کے نام سے اپنے مسلک کی اشاعت کرتے ہیں، مناظرہ بازی اور جارحانہ تبلیغ کرتے ہیں اور مسلم معاشرے کے اجزاء کو توڑ توڑ کر اپنے جداگانہ معاشرے میں شامل کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ایک مطالبہ جس ضرورت کی بنا پر کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ یہاں اختلاط کا نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے نہ کہ اقلیت کو۔ اس لیے اکثریت یہ مطالبہ کرنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اُس اقلیت کو آئینی طور پر الگ کر دیا جائے۔ جو ایک طرف عملاً الگ ہو کر علیحدگی کا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے اور دوسری طرف اکثریت کا جز بن کر اختلاط کے فوائد بھی سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں سے مذہبی و معاشرتی تعلقات منقطع کر کے اپنی الگ جگہ بندی کرتی ہے اور منظم طریقے سے اُن کے خلاف ہر میدان میں کشمکش کرتی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں مسلمان بن کر گھستتی ہے۔ اپنی تبلیغ سے اپنی تعداد بڑھاتی ہے۔ مسلم معاشرے میں تفریق کا فتنہ برپا کرتی ہے اور زندگی کے ہر میدان میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے متناسب حصے کی بہ نسبت بدرجہا

زیادہ حقہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس صورت حال کا سرا سر نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے، چنانچہ اقلیت نہیں بلکہ اکثریت اسے جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر رہی ہے۔

قادیانی مسئلہ، لکھنے کے جرم میں ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا مودودی گرفتار کر لیے گئے اور فوجی عدالت نے انہیں سزائے موت سنادی۔ اس موقع پر مولانا مودودی نے کہا:

”اگر میرے خدا کی یہی مرضی ہے تو میں راضی خوشی اُس سے جا ملوں گا، لیکن اگر اُس کی مرضی نہیں ہے اور میری موت کا وقت نہیں آیا تو یہ لوگ چاہے خود اُلٹے ٹٹک جائیں، میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔“

مولانا کو سزائے موت سنانے کے فیصلے کے خلاف پورے عالم اسلام میں زبردست احتجاج ہوا۔ اتنا زبردست احتجاج کہ ارباب اقتدار اس فیصلے کو چودہ سال قید با مشقت میں بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

مولانا مودودی ابھی جیل میں اپنی سزا پوری کر رہے تھے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے جسٹس ایم آر کیانی کے تعاون سے اپنی مشہور منیر رپورٹ، تیار کی۔ رپورٹ نے قادیانیوں کے خلاف عوامی تحریک کے اسباب اور سرفخر اللہ خاں اور دوسرے قادیانیوں کو پاکستان کے کلیدی مناصب سے الگ کرنے کے مطالبے کی چھان بین کرتے ہوئے اس اضطراب کی ذمہ داری مسلمانوں کے تعصبات اور جنونی کٹر پن پر عاید کی۔ پھر اس منطق سے نتیجہ یہ نکالا کہ اگر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی اجازت دے دی گئی، تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہو گا کہ تمام غیر مسلم تعذیب و عقوبت کا نشانہ بن جائیں گے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سر پھٹول اور براہ راست جہاد کا لائحہ عمل چھڑ جائے گا۔ مہذب دنیا سے متصادم قوانین نافذ کر دیئے جائیں گے اور پاکستان



اپنی پس ماندہ تہذیب اور رجعت پسند نظام حکومت کی بنا پر ایک اچھوت کی طرح بین الاقوامی برادری سے خارج کر دیا جائے گا۔ اسلام پر مغربی مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے بھی کبھی اتنا سخت حملہ نہیں کیا تھا۔ منیر رپورٹ نے اس باب میں انہیں بھی مات کر دیا۔ یہ ایک المیہ تھا کہ اس رپورٹ کا مصنف ایک مسلمان تھا۔ اس سے اس کے مضر اثرات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ انہی مضر اثرات کو محسوس کرتے ہوئے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے اس رپورٹ پر کڑی تنقید کی۔ اس طرح پاکستان میں اسلامی ریاست کے تصور اور خود مولانا کی اپنی ذات کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور زہر افشانیوں کا موثر تجزیہ کیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان باتوں میں مطلقاً کوئی صداقت نہیں ہے۔ رپورٹ کے آخر میں چیف جسٹس محمد منیر نے لکھا کہ اسلام کو افکارِ عصرِ جدید کا ہم آہنگ بنانے کے لیے اس کی نئی اساسی تعبیر پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پاکستان کو دنیا میں عزت و وقار کا مقام بلند حاصل ہو۔ مولانا مودودی نے جواب میں کہا:

۱۔ اسلام کی تجدید یا مرمت جیسی کچھ بھی کوئی کرنا چاہے، بڑی خوشی کے ساتھ کرے۔ وہ اگر معقول دلائل کے ساتھ بتائے گا کہ اسلام کے بے جان اجزاء کون کون سے ہیں، کیوں بے جان ہیں اور کیسے وہ الگ کیے جاسکتے ہیں، نیز اس کے جاندار اجزاء اس کی راسے میں کون سے ہیں اور کس شکل میں وہ ان کو باقی رکھنا چاہتا ہے، تو خواہ کتنی ہی جرات و بے باکی کے ساتھ وہ اس خدمت کو انجام دے۔

اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن دو باتیں اس کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ ہم مقدمات کے فیصلے تو عدالتوں سے لے سکتے ہیں، مگر نظریات اور فلسفے عدالتی زور کے بل پر قبول نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہن یا تو قرآن اور حدیث کی دلیل سے مان سکتا ہے، یا پھر مستقل عقلی دلائل سے۔ مگر جو اسلام امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان اور بین الاقوامی برادری کے دوسرے پیشواؤں



کے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیا جاتے کہ حضرات اس میں سے جو کچھ آپ کو پسند نہ آئے گاٹ دیجئے، جو کچھ پسند آئے باقی رکھیے اور جو کچھ آپ ضروری سمجھیں اضافہ کر دیجئے، اور پھر اس اصلاح و ترمیم اور حذت و اضافے سے جو چیز تیار ہو اُسے لا کر اسلام کے نام پیش کر دیا جائے، وہ خواہ ہمارے اعلیٰ افسروں اور اُدُنچے دولت مند طبقے کو کتنا ہی اپیل کرے، عام مسلمان کے پاس اس کے لیے ایک حقارت آمیز ٹھوکر کے سوا کوئی دوسری صورت استقبال نہیں ہے۔

بالآخر مارچ ۱۹۵۶ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے دستور کا اعلان کر دیا گیا۔ اس دستور میں جماعت اسلامی کے دستور کے زیادہ تر مطالبات شامل کر لیے گئے تھے، تاہم یہ المناک واقعہ ہے کہ عین اس وقت جب اس دستور کو عملی جامہ پہنانے اور اسلامی ریاست کی بنیاد بنانے کے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ صدر سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان نے ملی بھگت کر کے، اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لا نافذ کر دیا، دستور منسوخ کر دیا اور جماعت اسلامی سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا۔ اسی پہینے ایوب خان نے سکندر مرزا سے اختیارات چھین کر زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مولانا مودودی حالات سے ذرا بھی شکستہ دل نہ ہوتے اور پوری جرأت کیساتھ ہر طرح کے خطرات مول لے کر اسلام کی راہ میں جدوجہد کرتے رہے۔ مارشل لا کے باوجود انہوں نے اپنی ان تمام تقریروں اور تحریروں پر نظر ثانی کی جو ۱۹۳۹ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیانی عرصے میں کی یا لکھی تھیں اور انہیں اسلامی ریاست (اور انگریزی میں Islamic Law and Constitution) کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں بڑے موثر انداز میں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شرعی قوانین نہ صرف آج کے دور کی ناگزیر ضرورت ہیں بلکہ وہ ایک جدید حکومت کے لیے

موزوں بھی ہیں اور اُس کے تقاضوں کو پورا بھی کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کے دلائل اس قدر قوی

اور مؤثر تھے کہ بعض بلند مرتبت مسیحی بھی ان سے متاثر ہوتے، چنانچہ پاکستان کے (سابق) چیف جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس نے اسلامی قوانین کو اپنانے کی کھلے عام تائید کی اور انہیں ملک کے لیے واحد مزدوں نظام قرار دیا۔

۵، اور ۶ مئی ۱۹۶۰ء کو مولانا مودودی اور تمام مکاتب فکر کے ۱۹ نمائندہ علماء لاہور میں جمع ہوئے اور پاکستان میں پارلیمانی نظام کی ناکامی کے اسباب کا کھوج لگانے کے لیے حکومت نے جو دستوری کمیشن مقرر کیا تھا اس کے سوانامے کا متفقہ جواب دیا اور جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی کے سلسلے میں ضروری اصلاحی اقدامات تجویز کیے۔

پاکستان مسلمان عوام کی جدوجہد کے نتیجے میں بنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد مسلمان عوام کا عزم صمیم ہی اُس کے وجود کی سلامتی اور قوت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس ملک کے قیام میں کسی غیر مسلم نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ مسلمانوں کی قربانیوں کے بغیر یہ نہ تو وجود میں آسکتا تھا اور نہ قائم ہی رہ سکتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ ملک مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز نہیں رہتا اور وہ اس کی خاطر زندہ رہنے اور مرنے کے عزم سے دستبردار ہو جاتے ہیں تو اُس کے وجود کی بقا ممکن ہی نہیں ہے۔ چند اعلیٰ امرکاری ملازموں اور خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حقیر سی تعداد کو چھوڑ کر عام مسلمان آبادی اس ملک کو ایک ایسی اسلامی ریاست بنانا اور اسی صورت میں زندہ و پائندہ دیکھنا چاہتی ہے، جس کے قوانین اسلامی ہوں، جس کا تعلیمی نظام اسلامی ہو اور جس کی تہذیب و ثقافت اسلامی ہو۔ اسی مقصد کے لیے مسلمانوں نے پاکستان بنایا اور اپنے مال و جان اور عزت و آبرو کی قربانی دی۔ اس ملک کے ساتھ اس سے بڑی دشمنی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عوام کے اس تعلق کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ عام مسلمانوں میں مایوسی پیدا کرنے کے بعد یہ منشی بھرگ جو اپنے مذہب — اسلام کے نام ہی سے بیزار ہیں اس مملکت

کو کس طرح منبھالے رکھ سکتے ہیں؟

۲ مارچ ۱۹۶۱ء کو کل پاکستان انجمن خواتین (اپوا) کی ترغیب پر حکومت نے مسلم عائلی قوانین میں ڈی نٹس نافذ کر دیا جو شریعت مطہرہ کے صریح متناقض تھا، جس کے تحت تعدد ازواج پر کڑی پابندی عائد کر دی گئی، شادی بیاہ کی رجسٹریشن ضروری قرار دے دی گئی، شادی کی کم سے کم قانونی عمر مقرر کر دی گئی اور نجی طور پر خاوند کا بیوی کو طلاق دینا ممنوع قرار پایا۔ مولانا مودودی نے ملک بھر کے ۲۰۹ علماء کے ساتھ مل کر اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اس کو منسوخ کرنے یا کم از کم اس کی قابل اعتراض دفعات میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ علماء کے اس بیان پر حکومت نے سخت اور متشددانہ اقدامات کیے۔ جن لوگوں نے اس بیان کو سچا پایا اور عوام میں پھیلا یا انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔

اس زمانے میں مولانا مودودی انفرادی طور پر تصنیف و تحریر اور دعوت و تبلیغ میں بہت کم مصروف رہے۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیانی عرصے میں انہوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے سلسلے میں عرب مشرق وسطیٰ کا وسیع دورہ کیا اور عرب، فلسطین اور مصر میں ان تمام تاریخی مقامات کو دیکھا جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ تفہیم القرآن کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ہوا تھا۔ اب تک اس کی چار جلدیں مکمل ہو چکی ہیں اور پورے عالم اسلام میں ان کی زبردست مانگ ہے۔ اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے تفہیم القرآن کا ترجمہ انگریزی، عربی، بنگالی اور پشتو میں کیا جا رہا ہے۔ تفہیم القرآن مولانا مودودی کے علمی کمال کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں وہ بڑے عالمانہ انداز میں اسلامی نظام حیات کی صداقت اور دوسرے تمام نظام ہائے زندگی پر اس کا تفوق ثابت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی بتاتے جلتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں

لے دستوری کمیشن کے سوالنامے کا جواب اور ایک اسلامی مملکت کے اساسی اصول (انگریزی) شائع کردہ



میں کہاں کہاں تخریف کی ہے۔ ”سورۃ نور“ اور سورۃ اخزاب کی تفسیر الگ بھی شائع ہوئی ہے۔ ان میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ مختلف جرائم پر اسلام جو مہزائیں دیتا ہے وہ نہ صرف انسانی ہیں بلکہ انسان کی خود ساختہ لادینی تعزیرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہیں اور اسلامیات اور قانون کے طلباء ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے حدیث پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ اپنی کتاب ”سنت کی ایتنی حیثیت“ میں انہوں نے منکرین حدیث خصوصاً غلام احمد پرویز کے افکار کی زبردست تردید کی ہے۔

۱۹۶۱ء میں سعودی عرب کے شاہ سعود کی درخواست پر مولانا مودودی نے مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ مولانا کا خیال ہے کہ اس منصوبے سے وہ فکری و تعلیمی خلاء بھر جائے گا جو لازہ یونیورسٹی کے لادینیت اور قوم پرستی کا شکار ہونے سے پیدا ہوا ہے۔

”مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی کے لیے جو خاکہ میں نے پیش کیا اور جسے شاہ کی مقرر کردہ کمیٹی نے منظور کر لیا، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور علم کلام کیساتھ ساتھ جدید فلسفہ، جدید قانون، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور متقابل مذاہب کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی یا جرمنی میں سے کسی ایک زبان کی تحصیل بھی لازمی ہوگی۔ اس خاکے میں تعلیم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ محدود اصطلاحی معنوں میں نہ تو ”لادینی“ (سیکور) ہے نہ ”مذہبی“۔ یہ یونیورسٹی تمام قدیم اور جدید تعلیمی اداروں سے مختلف اور یکتا مقام کی حامل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی سے ایسے مسلمان علماء تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے بھی پوری طرح ماہر ہوں اور اسلامی اصولوں کو آج کی زندگی کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔“

اے مصنفہ کے نام مولانا مودودی کے مکتوب مورخہ یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے ایک اقتباس۔



۱۹۶۳ء میں جب مصر اور سعودی عرب میں سیاسی نزاع پیدا ہوا تو شاہ سعود نے

مصر کا بنایا ہوا خلافت کعبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا مودودی نے خلافت کعبہ پاکستان میں تیار کرنے کی پیش کش کی۔ شاہ نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی، چنانچہ مولانا مودودی کی نگرانی میں لاہور کے بہترین باکمال کاری گروں نے خلافت کعبہ تیار کیا، جس پر زردوزی کی گئی نفی۔ خلافت کعبہ تیار ہو گیا تو اس کے دو بڑے ٹکڑوں کی نمائش کی گئی۔ دو ریل گاڑیاں ان ٹکڑوں

کو جماعت اسلامی کے کارکنوں کی نگرانی میں لے کر لاہور سے کوئٹہ، کوئٹہ سے کراچی، لاہور

سے پشاور اور پشاور سے کراچی گئیں۔ اس طرح پورے مغربی پاکستان میں لوگوں نے خلافت

کعبہ کی زیارت کی۔ قبل ازیں ایسا دینی جوش و خروش کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ مردوزن،

بوڑھے اور بچے ریلوے اسٹیشنوں کی طرف جوق در جوق اٹھ پڑے۔ دیہات اور قصبے

خالی ہو گئے۔ بعض مقامات پر تو ہزاروں اور لاکھوں کا مجمع مسلسل کئی دن تک ریل گاڑی

کی آمد آمد کا منظر بلٹھا رہا۔ گاڑی پہنچتی تو جماعت اسلامی کے کارکن خلافت کعبہ ہاتھوں میں

بلند کر کے لوگوں کو دکھاتے۔ جذبات کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ فرط مسرت سے رونے لگتے۔

قرآن کی تلاوت، دعاؤں اور تکبیر و تہلیل سے فضا گونج اٹھتی، قریب کے لوگ خلافت کو چومتے

اور خوشبو میں بسا دیتے۔ لاہور میں خلافت کعبہ کا جلوس پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار

رہے گا۔ دس لاکھ سے زائد لوگ خلافت کعبہ کے جلو میں ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جلوس کے

سارے راستے میں تلاوت قرآن ہوتی رہی۔ ہوائی اڈے پر مولانا مودودی نے خلافت کعبہ

سعودی عرب کے سفیر کو پیش کر دیا۔ سفیر نے مولانا کا شکریہ ادا کیا۔ جن لوگوں نے ان مناظر کو

دیکھا، انہیں حشی کہ کتنے منکر غیر ملکی صحافیوں، نامہ نگاروں اور کیمرو مینوں کو بھی اس بات میں

ذرا شک و شبہ نہ رہا کہ پاکستان کے لوگ اسلام سے محبت کرتے ہیں اور اسے قومی اور

بین الاقوامی زندگی کے ہر میدان میں نافذ و رائج کرنے کے آرزو مند ہیں۔

مولانا مودودی کی روز افزوں مقبولیت اور اثر سے خار کھا کر ان کے دشمنوں نے

جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع، منعقدہ ۲۵ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ناکام کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ سفر کے لیے ریزرو کروائی ہوئی نشستیں منسوخ کر دیں، لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود اجتماع منعقد ہوا اور دس ہزار سے زائد افراد شریک ہوئے۔ پولیس کی موجودگی میں غنڈوں نے پنڈال کو آگ لگانے اور مولانا مودودی کو قتل تک کرنے کی کوشش کی، لیکن مولانا کی جرأت اور کارکنان جماعت کے ضبط و تحمل کی بدولت دشمن اپنے ناپاک عزائم میں ناکام و خائبہ رہے، اجتماع نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور دوسرے نتائج چھوڑ گیا۔

اس عظیم کامیابی پر مولانا کے مخالفین انگاروں پر لوٹ گئے۔ انہوں نے مولانا اور جماعت اسلامی کے خلاف سرکاری پریس میں پروپیگنڈے کی مہم زور شور سے جاری رکھی۔ یہ مہم ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو پورے عروج پر پہنچ گئی، جب کہ جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا، اس کے تمام ممتاز رہنما گرفتار کر کے مقدمہ چلائے بغیر قید کر دیئے گئے۔ پولیس نے جماعت کے تمام دفاتر، دارالمطالعے اور مقامات اجتماع سر بہر کر دیئے۔ تاہم جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں سماعت کے لیے پیش ہوا، عدالت نے جماعت کو خلاف قانون قرار دینے اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کے اقدامات کو باطل قرار دے دیا۔ رہائی کے پندرہ دن بعد ۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو، جب کہ صدارتی انتخاب کی مہم پورے جوش و خروش سے جاری تھی، مولانا مودودی نے لاہور میں ایک عظیم الشان اجتماع میں دو گھنٹے تقریر کی۔ اس تقریر میں مولانا نے پُر جوش الفاظ اور موثر دلائل کے ساتھ برسرِ اقتدار حکومت کی تمام پالیسیوں پر تنقید کی اور کہا کہ موجودہ حکومت غیر قانونی طریقے سے وجود میں آئی ہے اور برسرِ اقتدار رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔

”ہمارا سب سے بڑا جرم“ یہ ہے کہ ہم اسلام پر یقین و ایمان رکھنے

کے معاملے میں ریاکار اور منافق نہیں ہیں۔ ہم اپنے معاشرے کے معاملات کو

ایک خاص نمونے پر ڈھالنے اور اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کی سرٹوڑ  
جدوجہد کر رہے ہیں۔ جب ہم اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے تو اس  
کافطری تقاضا یہ ہے کہ اسلام اور صرت اسلام ہی ہماری زندگی کے تمام شعبوں  
میں نور ہدایت کا کام دے۔ خواہ ان کا تعلق اخلاق و کردار سے ہو یا اعتقاد  
اور نظریے سے، اخلاقیات سے ہو یا تعلیم سے، معاشرت سے ہو یا ثقافت  
سے، اقتصادی نظام سے ہو یا سیاسی ڈھانچے سے، قانون سے ہو یا عدالت  
سے، داخلی امور سے ہو یا بین الاقوامی روابط سے اپنی انفرادی اور قومی زندگی  
میں فساد انگیز اجنبی اثرات کا شائبہ تک باقی نہ رہنے دیا جائے۔ ہم اس  
مسئلے پر کسی قسم کی مصالحت برداشت نہیں کرتے، ہمارا جس بات پر اعتقاد  
ہے ہم اُس کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ بات ان لوگوں کو سخت  
ناگوار گزرتی ہے جو اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ ان  
کی سوچی سمجھی پالیسی یہ ہے کہ عملاً تو زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کے خلاف چلیں  
لیکن زبان سے اُس کی شان میں قصیدہ سراہتی کرتے رہیں تاکہ قوم دھوکا کھا کر ان  
کے ساتھ وابستہ رہے۔ ہمارا دوسرا ”جرم“ یہ ہے کہ ہم مضبوط اور قابل اعتماد  
کردار کے لوگ اُس کے لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اپنے حلقے میں لوگوں  
کو مناسب چھان بین کے بعد شامل کرتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص جماعت اسلامی  
میں شامل ہوتا ہے خوب سوچ بچار کر کے شامل ہوتا ہے اور جب وہ ایک  
مرتبہ اپنی راہ عمل منتخب کر لیتا ہے تو اس کی پوری زندگی اس کے تقاضوں  
کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ وہ اپنے عقیدے کے محض زبانی اظہار پر مطمئن  
نہیں ہو جاتا بلکہ اس عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا  
ہے۔ اپنے کردار و عمل میں ضروری تبدیلیاں لاتا ہے۔ جبر و تشدد اور دباؤ



سے ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ وہ معروف کے معروف اور منکر کے منکر ہونے کا اعلان کھلے عام پیش کرتے ہیں۔ وہ قید و بند سے نہیں ڈرتے بلکہ جیل خانوں کو اپنی اخلاقی و روحانی تربیت گاہ سمجھتے ہیں.....

جب مولانا مودودی نے صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تو انتہائی تجدد پسند حضرات نے بھی ان پر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا الزام عائد کیا، حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مارشل لا کے دوران میں مسلمانوں پر عائلی قوانین کا آرڈینیمنس مسلط کیا تھا جو صریحاً خلافت اسلام تھا۔ مولانا مودودی نے اُن کے جواب میں فرمایا:

”اب میں مختصراً اس مسئلے پر بحث کروں گا کہ کیا اسلام میں کوئی عورت

ملک کی سربراہ بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں ان ارباب غرض سے چند سوالات کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کیا اسلام عورتوں کو وزیر یا سفیر بنانے کی اجازت دیتا ہے؟ کیا مخلوط تعلیم، معاشرے میں مرد و زن کا اختلاط اور دفاتر میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی ملازمت، اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ ہے؟ کیا اسلام مسلمان عورتوں کو کھلے عام اور حکومت کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی ثقافتی تقریبات میں گانے اور ناچنے کی اجازت دیتا ہے؟ کیا اسلام فی الواقع مسلمان لڑکیوں کو فضائی میزبان بننے اور مسافروں کو شراب پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ اگر پاکستان میں ان سب باتوں کی اجازت ہے تو پھر صدارتی انتخاب کا مسئلہ سامنے آتے ہی ان حضرات کی اسلامی حس کیوں جاگ اُٹھی ہے؟ پھر ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام میں مملکت کے سربراہ کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ وہ مرد ہو اور یہ دیکھنا

لے پاکستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ (انگریزی) از ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ

جماعت اسلامی کراچی ص ۱۴-۱۵



ضروری نہیں ہے کہ اس میں اور اوصاف بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ اگر کبھی قوم کو ایسی صورت حال درپیش ہو کہ اسے دو شخصیتوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے، جن میں سے ایک کے خلاف سوائے اس کے اور کچھ کہا نہ جاسکتا ہو کہ وہ عورت ہے اور دوسرا ہے تو مرد لیکن اس میں ان اوصاف میں سے ایک وصف بھی نہ پایا جاتا ہو جو ایک عادل اور صالح قیادت کے لیے ضروری ہیں، تو ایسی صورت میں کیا اسلام کی شد بد رکھنے والا کوئی شخص بھی اول الذکر کو چھوڑ کر موخر الذکر کے حق میں رائے دے سکتا ہے؟

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے نہایت مکاری سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ۶ ستمبر سے ۲۳ ستمبر تک جاری رہی اس دوران میں مولانا مودودی نے ریڈیو پاکستان لاہور سے تین تقریریں نشر کیں اور اعلان کیا کہ پاکستان کے دفاع کی یہ جدوجہد جہاد فی سبیل اللہ کا حکم رکھتی ہے۔ محاذ جنگ پر لڑنے والے سپاہی ہی نہیں ملک کا ہر شہری اور صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت وغیرہ تمام پیشوں سے تعلق رکھنے والے عوام بھی جہاد کر رہے ہیں۔ ان جوش انگیز تقریروں نے عوام اور فوجوں کے دل گرمانے میں زبردست حصہ لیا۔ پاکستانی عوام کا مورال بلند ہو گیا۔ انہوں نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں اور ملک کی مدافعت کے لیے اپنی سی ہر کوشش کر گزرے۔ ہزاروں مرد، عورتیں حتیٰ کہ بچے تک قومی دفاعی فنڈ میں روپیہ، زیور، خوراک، کپڑے اور خون دینے کے لیے اٹھ پڑے۔ مولانا مودودی نے کشمیر میں حصول انصاف کی خاطر ہر ممکن کوشش کی۔ مظفر آباد ریڈیو سے آپ نے جو تقریر کی اس میں کشمیری مسلمانوں پر بھارت کے مظالم کی پُر زور الفاظ میں مذمت کی۔ مولانا مودودی نے اقوام متحدہ کے حکم جنگ بندی اور اعلان تاشقند (۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء)

دونوں کی مخالفت کی اس لیے کہ ان سے بھارت کی سیاسی حکمت عملی فتح مند رہی تھی اور مسئلہ کشمیر کا حل ناممکن ہو گیا تھا۔

اسرائیل نے ۱۹۵۵ء جون ۱۹۶۷ء کو مصر، شام اور اردن پر ظالمانہ جارحیت کا ارتکاب کیا۔ مولانا مودودی نے فلسطین خصوصاً بیت المقدس کو صہیونی تسلط سے نجات دلانے میں اپنی ساری عملی قوتیں اپنے عرب بھائیوں کی تائید و حمایت میں لگا دیں۔

مارچ ۱۹۶۶ء میں رابطہ عالم اسلامی کا سالانہ اجلاس مکہ معظمہ میں منعقد ہوا۔ مولانا مودودی نے تنظیم کے ایک بانی رکن ہونے کی حیثیت سے مسلمان ملکوں پر زور دیا کہ وہ فوجی اعتبار سے خود کفنی ہوں اور امریکہ، سوویت یونین یا کسی اور اجنبی طاقت پر انحصار نہ کریں۔ مزید برآں آپ نے عالم اسلام کو قوم پرستی کو ترک کرنے اور متحد ہو کر ایک ہلاک بنانے کی دعوت دی تاکہ وہ ہر جگہ اپنا اور اسلام کا دفاع کر سکے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو مختلف نسلوں اور قوموں کو متحد کر کے ایک گھرانے میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک عالمی ریاست کی بنیاد کا کام دے سکتا ہے اور دنیا بھر کو عدل و انصاف اور امن و امان سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

اسلام اس بات کو محض ایک نظریے اور فلسفے کے طور پر پیش کر کے نہیں رہ گیا بلکہ عملاً اس نے ایک معاشرہ انہی بنیادوں پر وجود میں لا کر دکھایا۔ اس معاشرے میں اس نے مختلف نسلوں اور قوموں کو بالکل مساوی حیثیت سے جمع کر دیا۔ نسل، رنگ، زبان اور قومیت کے سارے امتیازات مٹا دیئے۔ پھر اسی نظریے کی بنیاد پر اسلام نے عملاً ایک عالمی ریاست بھی قائم کر کے دکھا دی۔۔۔۔۔ تمام بلاد اسلام میں ایک ہی قانون رائج تھا۔ تمام مسلمان بالکل ایک برادری تھے۔ مشرق سے مغرب تک دنیا کے کسی ملک میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا۔ وہ ٹھیک انہی حقوق کے ساتھ اسلامی معاشرے میں شامل

ہو جاتا تھا جو عربوں کے حقوق تھے..... ایک حبشی، ایک رومی، ایک ایرانی، ایک قبلی، ایک بربری کلمہ اسلام کا قائل ہونے کے بعد ٹھیک اسی صف میں اکھڑا ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خاندان اور آپ کی اپنی قوم کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی حیثیت اور اس کا مرتبہ وہی تھا جو ان کا تھا اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے وہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کر سکتا تھا..... کلمہ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو بہر حال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں وہ جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں بھی چاہتا ہے روک ٹوک جاسکتا تھا، جہاں چاہتا پھر سکتا تھا۔ جتنے دن چاہتا پھیر سکتا تھا، جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا، بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک سے نکل کر دنیا بھر کے مسلمان ملک میں سا لہا سال تک پھر تارہا ہے، کہیں اُس نے علم حاصل کیا، کہیں اُس نے تجارت کی، کہیں اُس کو وزارت یا فوج کی سپہ سالاری مل گئی، کہیں وہ رہ پڑا اور اُس نے شادی کر لی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے جس نے ۲۷ سال مختلف مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اُس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کہیں اُس سے نہ پوچھا گیا کہ تیری قومیت کیا ہے۔ کہیں اُسے اپنی معاش کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ کہیں اُسے اقامت کے لیے پرمٹ نہ لینا پڑا۔ کہیں اُس کے قیام کے لیے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی، بلکہ کسی جگہ اگر اُس نے سرکاری ملازمت کرنی چاہی تو وہ بھی



بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں  
مراکش کے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص جسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر سلطان  
اُس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیتا ہے، یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اُس کو داخل  
ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اُس وقت دنیا  
بھر کی مسلمان ریاستوں کے درمیان محض دولت مشترکہ (Commonwealth)  
ہی کا نہیں بلکہ شہریت مشترکہ (common citizenship) کا تصور  
بھی پوری طرح کارفرما تھا۔ ہر مسلمان حکومت کے لیے پوری دُنیا کے اسلام کی افرادی  
تقوت (man power) قابل حصول تھی۔ عالم اسلام کی حفاظت و  
مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز  
تک دُنیا کے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری و ساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ  
کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دُنیا کے اہل فکر آج جن عالمی ریاست  
کی تقاضا کر رہے ہیں، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لیے تمام فکری و فنی  
بنیادیں فراہم کر دی ہیں بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے....  
(صفحہ ۱۹-۲۴)

انڈونیشیا سے مراکش تک چلے جاتے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ  
اسلام کے تمام ماننے والوں کی ایک مشترک تہذیب ہے۔ اس تہذیب کے  
بنیادی اصول تمام مسلمان ملکوں میں یکساں جاری و ساری ہیں۔ ایک مسلمان  
خواہ کسی ملک میں جاتے اذان کی آواز اس کے کان میں آئے ہی فوراً اُسے  
معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس کے اپنے بھائی موجود ہیں۔ ایک مسجد بھی یہاں  
ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا وہ بھی ویسا ہی ایک ممبر ہے جیسا اس ملک  
کے باشندوں میں سے کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ وہ جا کر اس میں شریک ہوتا



ہے تو وہاں کوئی اسے اجنبی نہیں سمجھتا، بلکہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایک دوسرے مسلمان ملک سے آیا ہے مسجد کے مقامی حاضرین و رُوحہ کرآتے ہیں اور محبت سے اُسے گلے لگاتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان سے واقف نہیں ہے، مگر اسلام حکیم اس کے اور ان کے درمیان مشترک ہے..... نماز کی شکل اور ہیئت اندیشیا سے لے کر مراکش تک ایک ہی ہے۔ جماعت کے لوگ اُس اکیسے اجنبی کو امام بھی بنا سکتے ہیں اور وہ اکیلا اجنبی ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ مسجد سے نکل کر وہ اس ملک کی مسلم سوسائٹی میں جہاں بھی جاتا ہے محسوس کرتا ہے کہ اُس کے اور ان کے درمیان تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا اتحاد موجود ہے۔ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے کہ جن چیزوں کو وہ حرام سمجھتا ہے یہ بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں اور پاکی و طہارت کے جن قواعد کا وہ قائل ہے یہ بھی اُن کے قائل ہیں۔ پھر جس ملک میں بھی وہ جاتا ہے اس کے خواص ہی نہیں عوام تک بازاروں اور بسوں اور ہوٹلوں میں جب اُس سے ملتے ہیں تو اُس کے ملک کے مسلمانوں کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں جیسے ایک کنبے کے لوگ اپنے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اچھے حالات سنتے ہیں تو الحمد للہ کہتے ہیں اور خوشی ان کے چہروں پر چمک رہی ہوتی ہے۔ بُرے حالات سنتے ہیں تو اس پر ویسے ہی غمگین ہوتے ہیں جیسے اس کے اپنے ملک کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام ملکوں کے درمیان نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین اس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں کہ ان کے درمیان باہمی ازدواج تک میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کیفیت مسلمان کے سوا کسی دوسرے ملک میں کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام مسلمان ملکوں کے درمیان جذبات کا، ہمدردی و خیر خواہی کا، تہذیب اور ثقافت کا



جس طرح وہ ماضی میں اپنے پٹھوؤں کو کبھی یہاں کبھی وہاں برسرِ اقتدار لا کر کھیلتی رہی ہیں۔ (صفحہ ۴۳)..... مسلمان ملک جس افراتفری اور انتشار

سے دوچار ہیں، اس میں اس آواز نے کہ مسلمان ملکوں کے سربراہوں کی کنفرنس منعقد کی جائے، نئی اُمید پیدا کر دی ہے..... لہذا یہاں مسلمانوں کو

اپنی طرف بڑھنے والے دوستی اور تعاون کے ہاتھ کو خوش آمدید کہنی چاہیے خواہ وہ کسی بھی ملک کا ہاتھ ہو، وہاں عالمی طاقتوں سے ہر وقت جو کنا بھی رہنا

چاہیے جو ہماری موجودہ پس ماندگی اور نا اتفاقی سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں

ہر وقت لگی ہوتی ہیں۔ فی الحقیقت ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اور بھی

ضروری ہو گیا ہے کہ جمع ہوں تاکہ ہر مسلمان ملک کی طاقت سب کی طاقت

بن جائے۔ یہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر ہر مسلمان اپنی آزادی کو برقرار

رکھ سکتے ہیں، دنیا کے معاملات میں صحت مندانہ اور تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں

اور اس نشاطِ ثانیہ سے ہمکنار ہو سکتے ہیں جس کی خواہش ہر دل میں پائی

جاتی ہے۔

مولانا مودودی نے برسرِ اقتدار طبقے کی غلط کاریوں پر ہمیشہ نہایت بے غوفی سے تنقید

کی ہے اور اس باب میں اپنے ذاتی تحفظ اور عافیت کی کبھی پروا نہیں کی۔ مولانا کا اپنا وجود

اور ان کی تحریک پوری اسلامی دنیا میں لادینیّت، مادہ پرستی اور الحاد کے شدید حملوں کے مقابلے

میں ایک زبردست ڈھال فراہم کرتی ہے۔ تجد و پسند شریعت (خصوصاً شخصی اور عائلی قوانین)

کو بدلنے اور اسے جدید مغرب کے نظام ہائے قانون سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوششیں کر رہے

ہیں، مولانا مودودی ان ساری کوششوں کے سخت دشمن ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی پر مائع حمل

لے اتحادِ عالمِ اسلامی از مولانا مودودی۔



ادویات، استقاط حمل اور بانجھ پن کے ذریعے قابو پانے کے لیے قومی اور بین الاقوامی طور پر جو تحریک جاری ہے، مولانا مودودی اس کے بھی شدید ترین مخالف ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے صریح منافی قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر ایک مقالہ شائع کیا جس میں انفرادی، معاشرتی، قومی، بین الاقوامی، اقتصادی اور اخلاقی نقطہ نظر سے آبادی کو کم کرنے کے غیر فطری طریقوں کے ہولناک نتائج ناقابل تردید شہادتوں کے ساتھ بیان کیے۔ ۹ اگست ۱۹۶۶ء کو ایک سرکاری فرمان کی رو سے اس پمفلٹ اور کتاب کو خلاف قانون قرار دے دیا جس کے ۱۹۴۳ء سے اب تک نو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے کیونکہ حکام کو اندیشہ تھا کہ اس میں پیش کردہ پُر زور دلائل خاندانی منصوبہ بندی کے قومی پروگرام کو تلیٹ کر کے رکھ دیں گے۔ کتاب پر یہ پابندی ۱۰ مارچ ۱۹۶۷ء تک برقرار رہی۔

مولانا مودودی گزشتہ تین عشروں سے منکرینِ حدیث، جن کے سرخیل غلام احمد پرویز ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے ”ہدی“ اور ”نبی“ ہونے کے دعووں پر قائم ہونے والی ربوہ کی قادیانی امت اور لاہور کی احمدیہ تحریک کی بدعات اور کافرانہ عقائد کے خلاف زبردست جنگ لڑ رہے ہیں۔ قادیانیوں کے کافرانہ عقیدے پر انہوں نے اپنے کتابچے ”ختم نبوت“ میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں دجال، حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی اور امام مہدی کے موضوعات پر بھی بحث کی گئی ہے نیز اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم اور عالم اسلام کے خلاف صہیونی سازش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا مودودی عربوں کو کئی بار متنبہ کر چکے ہیں کہ بیت المقدس صرف جہاد فی سبیل اللہ سے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کی قیادت اسلامی نظام کی علمبردار ایک ایسی حکومت کے ہاتھ میں ہو جسے عوام کا مکمل اعتماد اور ان کی حمایت حاصل ہو۔ اگر عرب رہنما ”رجعت پسند“ اور ”ترقی پسند“ دھڑوں میں بٹ کر باہم دست و گریباں رہے، اتحاد کو پس پشت ڈالے رکھا اور قوم پرستی اور سوشلزم ایسے بے معنی نعروں میں کھوتے رہے تو عوام کا مورال تباہ ہو جائے گا اور وہ اسرائیل کے ساتھ دودو ہاتھ کرنے کے جذبے سے عاری ہو جائیں گے۔ اگر



عرب حکمرانوں نے اپنے موجودہ طرز عمل کو نہ بدلاتو امرائے اپنی سرحدوں سے باہر پھیلنے اور قدم بہ قدم اگے بڑھنے کی جدوجہد میں کامیاب ہو جاتے گا۔

انگلستان اور جرمنی میں مقیم مسلمان طلبہ کی انجمنیں اور جماعتیں مولانا مودودی کو متعدد مرتبہ دعوت نامے بھیج چکی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ مولانا تشریف لائیں، اسلام کے موضوع پر لیکچر دیں اور مغربی ملکوں میں بودوباش رکھنے والے مسلمان عوام اور طلبہ کو پیش آمدہ مسائل کے حل سے آگاہ کریں، لیکن حکومت مولانا کی روز افزوں مقبولیت سے سخت خائف تھی۔ اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ مولانا بین الاقوامی شخصیت بن جاتیں گے، چنانچہ اُس نے انہیں باہر جانے کی اجازت نہ دی اور اس ضمن میں ان کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا۔ مولانا کے گردوں میں پچھلے پچیس برس سے پتھری موجود تھی اور سخت تکلیف اور پریشانی کا باعث تھی۔ اگست ۱۹۶۸ء میں ایک خصوصی طبی بورڈ نے معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ صورت حال سنگین ہے اور مولانا کو علاج کے لیے لندن جانا ضروری ہے۔ لندن میں مولانا کے دو آپریشن ہوئے۔ مولانا اگرچہ سخت کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہے تھے، تاہم بے شمار لوگ جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی، ان سے ملنے اور گفتگو کرنے آتے۔ پاکستان روانہ ہونے سے پہلے ۱۵ دسمبر کی شام کو لندن کے ہسپتال میں مولانا کے اعزاز میں ایک خصوصی استقبالیہ دیا گیا جس میں انگلستان میں مقیم پاکستانی باشندوں کے ممتاز ترین نمائندوں کے علاوہ مختلف مسلمان ملکوں کے سفارتی نمائندے، انگریزی اور اردو جرائد کے رپورٹر، مغربی افاضل اور مستشرقین بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے خطبہ استقبالیہ کے جواب میں جو تقریر کی اس میں انگلستان میں مقیم پاکستانیوں کے مسئلے پر خاص طور پر توجہ دی۔ مولانا نے حاضرین کو یقین دلایا کہ اگر برطانیہ میں بودوباش اختیار کرنے والے مسلمان اسلامی نظریات و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں تو اسلام یورپ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگے گا، لیکن اگر وہ احساس کہتری کا شکار اور مغربی طور اطوار کی اندھا دھند نقالی کرتے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا وجود کھودیں گے اور اچھنی تہذیب میں بالکل جذب ہو کر رہ جاتیں

گے۔ مولانا نے برطانیہ میں مقیم پاکستانی مسلمانوں کے رہنماؤں کو متنبہ کیا کہ اگر مسلمان بچوں کو گھراور اسکول میں صحیح اسلامی تعلیم نہ دی گئی تو نئی نسل مسلمان معاشرے کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ مولانا نے ”ہم رنگ ہو جانے“ کے اس نعرے کا ذکر بھی کیا جس کے تحت برطانیہ مسلمانوں کو مغربی معاشرے میں جذب کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آپ نے کہا برطانیہ کا یہ طرز عمل بالکل غلط ہے۔ ایک کثیر النسل (multi-racial) اور کثیر التہذیب (multi-cultural) معاشرہ، برطانیہ عظمیٰ کے لیے انتشار کی قوت بننے کے بجائے مفید ثابت ہو گا۔ نا انصافی اور داخلی کشمکش کو ختم اور ملک کی اجتماعی زندگی کو مالا مال (enrich) کر دے گا۔

مولانا مودودی نے اٹلی اور جرمنی کی ٹیلی ویژن کمپنیوں کو بھی انٹرویو دیے۔ انہوں نے کہا: دورِ جدید کے انسان کی سب سے بڑی اور سنگین غلطی یہ ہے کہ سائنسی ترقی کے ذریعے عناصر قدرت کو مسخر کرنے کے بعد وہ اس اندھے اعتقاد میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اب اس کو اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی کے لیے پیغمبروں پر نازل شدہ وحی الہی کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی قوموں کی زندگی امن و طمانیت سے یکسر محروم ہو چکی ہے۔ زندگی نے اپنے معنی اور غرض و غایت کھودی ہے۔ خاندانی زندگی ٹپٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ جرائم کا دور دورہ ہے۔ جگہ جگہ تشدد کا بازار اس طرح بے روک ٹوک گرم ہے کہ دنیا کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ تنگ نظری اہل مغرب کی دوسری ٹھٹھکی غلطی ہے۔ اگر مغربی تہذیب کے پاس نسلی امتیاز ایسے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے تو لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام اس مسئلے کو حل کر چکا ہے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو حقیقی معنوں میں انسانی اخوت میں غسلک کرنے کا لازماً کامیابی سے انجام دے چکا ہے۔ اہل مغرب کا فرض ہے کہ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر نکل کر دیکھیں اور معلوم کریں کہ جہاد جنگ کی وحشت خیز تباہ کاریوں کو کس طرح ختم کرتا ہے اور خاندان اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر کس طرح مضبوط و مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح فرو کی شخصیت تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرتی انتشار عام ہے اور ذہنی امراض و باکی طرح پھیل چکے



ہیں۔ اسلام کی میراث صرف پیدا کشتی مسلمانوں کے لیے نہیں پوری نوری انسانی کے لیے ہے۔

دسمبر ۱۹۶۸ء کے اواخر میں مولانا مودودی پاکستان تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت پانچ سیاسی جماعتوں پر مشتمل تحریک جمہوریت پاکستان کے دوسرے ارکان کے ساتھ مل کر ملک کو آمریت سے نجات دلانے اور جمہوریت بحال کرنے کی جدوجہد میں گزرا۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ فروری ۱۹۶۹ء کے اواخر میں صدر ایوب خان گول میز کانفرنس منعقد کرنے اور ملک کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ہنگامی حالات جو ستمبر ۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کے بعد نافذ کئے تھے، ختم کر دیئے۔ ڈیفینس رولز جن کے تحت مخالف سیاسی رہنماؤں کو مقدمہ چلائے بغیر غیر معین عرصے تک نظر بند رکھا جاسکتا تھا، منسوخ کر دیئے، بالغ راتے دہی کی بنیاد پر آزادانہ جمہوری انتخابات کرانے اور پارلیمانی نظام بحال کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اعلان کیا کہ وہ آزادانہ جمہوری انتخابات کرانے کے بعد اپنے منصب سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ان اقدامات سے ملک بھر میں انبساط و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل پانچ جماعتیں ۱۹۵۶ء کا دستور بحال کرنے کا مطالبہ بھی کر رہی تھیں جو ایوب خان کے ساختہ پروا ختمہ دستور ۱۹۶۲ء کی بہ نسبت کہیں زیادہ اسلامی بنیادیں فراہم کرتا تھا، لیکن المیہ یہ ہوا کہ بایں باز کے عناصر نے بالعموم اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیلیٹ پارٹی اور مولانا بھاشانی کی چین پرست نیشنل عوامی پارٹی نے بالخصوص تشدد و کاراستہ اختیار کر لیا اور گول میز کانفرنس میں طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے ملک کا دورہ کیا اور اشتعال انگیز تقریریں کر کے لوگوں کو کمیونسٹ طرز کا انقلاب برپا کرنے پر اکسایا۔ طلبہ میں بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے اسکول اور کالج گزشتہ چھ ماہ سے بند پڑے تھے، ہڑتالوں نے صنعت و حرفت کو مفلوج کر دیا تھا، ملک بھر میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں بلووں، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ امن و قانون کی حالت

یہاں تک ابتر ہو گئی کہ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے اور بری افوار کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو مارشل لا نافذ کر دیا۔ البتہ یہ مارشل لا ایوب خان کے نافذ کردہ مارشل لا سے مختلف تھا۔ اس مرتبہ سیاسی جماعتیں نہیں توڑی گئیں اور انہیں قانون کے دائرے میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ملک میں جمہوری نظام حکومت کی بحالی کے لیے انتخابات کی تیاری کے سلسلے میں مولانا مودودی نے آٹھ نکات پر مشتمل حسب ذیل سیاسی ضابطہ اخلاق کا اعلان کیا:

۱۔ نظریہ پاکستان یعنی اسلامی نظام حیات اور ملکی سالمیت کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔

۲۔ کوئی پارٹی یا اس کا کوئی ذمہ دار شخص، معقول اعتراض و تنقید کے حدود سے تجاوز کر کے کسی دوسری پارٹی یا اس کے لیڈروں کے خلاف، اور انتخابات کے زمانے میں اس کے اُمیدواروں کے خلاف دشنام طرازی اور ناشائستہ پروپیگنڈا نہ کرے اور نہ ایسے الزامات لگائے جن کا ثبوت وہ نہ دے سکتا ہو۔

۳۔ ہر پارٹی کو جلسے اور جلوس اور پرائمن مظاہرے کرنے کا حق ہے، لیکن کسی کو دوسروں کے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کو درہم برہم کرنے یا ان میں خلل اندازی کا حق نہیں ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے زمانے میں اگر کوئی پارٹی یہ طرز عمل اختیار کرے تو قانون انتخاب میں یہ تصریح ہونی چاہیے کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے کی مجاز نہ ہوگی۔

۴۔ کسی پارٹی کو ملک کے اندر تشدد کے ذریعے سے انقلاب لانے کی کوشش کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے یا ایسی کوئی تشدد آمیز تحریک جاری کرنے کا حق نہیں ہے جس کا مقصد جمہوری طریقوں کے بجائے جبراً ملک کے نظام میں تبدیلی لانا ہو۔ جو پارٹی اس قسم کا رویہ اختیار کرے اسے بحیثیت ایک پارٹی کے ملک میں کام کرنے کا حق نہ



ہونا چاہیے۔

۵۔ اگر کوئی شخص یا کوئی پارٹی یا کسی کا کوئی لیڈر انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن اگر وہ اس طرح کے اعلانات کرے کہ وہ انتخابات نہیں ہونے دے گا اور انتخابات میں حصہ لینے والوں کو زبردستی اس سے روکے گا یا پولنگ اسٹیشنوں پر انتخابات کی کارروائی نہ ہونے دے گا تو اس کو نہ صرف یہ کہ ملکی سیاست میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ باتیں از روئے قانون جرم متاہل دست اندازی پولیس ہونی چاہیے اور اس کی سزا مقرر ہونی چاہیے۔

۶۔ انتخابات کا اعلان ہونے کے بعد اور دوران انتخابات میں حسبِ ہل کاموں سے قطعی پرہیز کریں گی۔

الف :- روپے کے ذریعے یا کسی اور طرح کا لالچ دے کر ووٹ حاصل کرنا۔

ج :- ووٹروں پر سرکاری افسروں کے ذریعے سے دباؤ ڈال کر یا اپنے کارکنوں یا اپنے حامیوں کے ذریعے ڈرا دھمکا کر زبردستی ووٹ حاصل کرنا۔

ج :- برادریوں اور علاقائی، نسلی یا لسانی تعصبات کے نام پر اپیل کرنا۔

۷۔ ہر پارٹی کو اس بات کا عہد کرنا ہوگا کہ انتخابات کے ذریعے سے اگر وہ برسرِ اقتدار آئے تو وہ حسبِ ذیل چیزوں سے احتراز کرے گی :-

الف :- سرکاری ملازمین اور سرکاری ذرائع اور وسائل کو پارٹی کے مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

ج :- ملک کے ذرائع نشر و اشاعت، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور خبر رساں ایجنسیوں کو اپنی پارٹی کے حق میں یا مخالف پارٹیوں کے خلاف پروپگنڈا کے لیے استعمال کرنا۔

ج :- پریس اور پبلیشنگ فارم کی آزادیوں پر اپنی پارٹی کے مفاد میں قدغن لگانا۔

۷۔ لائنس، پرمٹ یا کسی دوسرے مالی مفاد کے ذریعے دوسری پارٹیوں کے ذمہ  
کو توڑنا یا اپنی پارٹی کی تعداد میں ان ذرائع سے اضافہ کرنا یا اپنے اثر و نفوذ کو بڑھانے  
کے لیے یہ ذرائع استعمال کرنا۔

۸۔ کسی ایسی پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق نہ ہو گا جو پاکستان کی اسلامی  
بنیاد کو نہ مانتی ہو یا پاکستان میں جمہوری نظام کے خلاف کوئی اور نظام لانا چاہتی  
ہو یا پاکستان کی وحدت و سالمیت کی مخالفت ہو۔

پاکستان میں اس وقت اسلام اور کمیونزم کے درمیان زندگی اور موت کی کشمکش جاری ہے۔  
خدا نخواستہ یہاں کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جیسا کہ اب وہ عالم  
عرب پر مسلط ہو چکے ہیں، تو ملک اپنا آزادانہ وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا بلکہ روس، چین اور بھارت  
میں لازماً تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کمیونسٹ پاکستان کے کٹر دشمن ہیں۔ اس  
کا نمایاں ثبوت اُس کھلے خط سے ملتا ہے جو میر سکندر حیات کے نواسے طارق علی نے پیپلز پارٹی  
کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے نام تحریر کیا اور جو لندن یونیورسٹی کی پاکستان سوسائٹی کے نصیب و  
ترجمان ہیں۔ پاکستان لیفٹ ریویو (Pakistan Left Review) میں ۱۹۶۸ء کے  
شمارہ خزاں میں شائع ہوا۔ اس خط میں طارق علی نے لکھا:-

”یہ ایک بے لاگ خط ہے۔ اسے اپنی ذات پر حملہ نہ سمجھئے گا۔ آپ نے ایک  
نئی سیاسی جماعت بنائی ہے اور اسے سوشلزم کے لیے وقف کرنے کا اعلان کیا  
ہے۔ بنابریں ہم آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب چاہتے ہیں۔ آپ نے  
نئی جماعت کی تشکیل کیوں ضروری سمجھی جب کہ نیشنل عوامی پارٹی پہلے ہی سے  
موجود ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی لوگوں کو احمق بنانے اور دھوکا

دینے کے لیے اسلام کا نعرہ نہیں لگاتی؛ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہم ملحد ہیں۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہم نہ تو کسی مافوق الفطرت "ہستی" پر یقین و اعتقاد رکھ سکتے ہیں اور نہ اُسے کسی صورت حقیقی کمیونسٹ انقلاب کا بدل قرار دے سکتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ پاکستان کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر مبنی نظر بیٹے پر استوار کی گئی ہیں ہمارے نزدیک محض ایک بابر فریب ہے۔ مذہب ہمارے عوام کو مدت دراز سے گمراہ کر رہا ہے۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس جھوٹے عمل کا تیا پانچہ کر دیں۔"

مولانا مودودی اس چیلنج کا سامنا کرنے کا معتمد ارادہ کر چکے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے اس حقیقت کو واشگاف انداز میں واضح کر دیا ہے کہ اسلام اور سوشلزم متضاد نظریے ہیں۔ اس موضوع پر مولانا مودودی کی اہم ترین تحریر وہ ہے جس میں انہوں نے ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے مدیر شورش کاشمیری کے ۳۱ سوالات کا جواب دیا ہے اور جو چٹان کے ۱۴ اپریل ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ تحریر اتنی زبردست تھی کہ چٹان کا پرچہ چھپنے کے بعد تین گھنٹے کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ انہوں نے لکھا:-

"اسلام اور سوشلزم دو قطعی متضاد نظریے ہیں۔ اسلام کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں۔ اس خدا نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اپنی کتاب کے ذریعے سے ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں جو ہدایات دی ہیں اُن کے برحق ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام انہی ہدایات کی پیروی کرنا ہے۔ ہمارے لیے یہ دنیا کی زندگی، اصل زندگی نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کا حقیقی مقصد آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے اور یہ رضا ہمیں اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہم اس دنیا میں اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایات کی پیروی کریں۔ اس عقیدے



پر اسلام ایک پورا نظام اخلاق ہمیں دیتا ہے اور ایک پورا نظام عبادات دیتا ہے تاکہ ہماری زندگی عملاً اس عقیدے کے ساتھ عمر بھر وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ اسلام ہم کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک ہمہ گیر قانون اور ضابطہ دیتا ہے جس کا دائرہ گھر اور خاندان کی زندگی سے لے کر درس گاہ اور عدالت، پارلیمنٹ اور مارکیٹ اور بین الاقوامی تعلقات، ہر چیز پر وسیع ہے۔

اس کے برعکس سوشلزم کا آغاز ہی اس تصور سے ہوتا ہے کہ ہمیں کسی خدا اور کسی رسول کی رہنمائی کی حاجت نہیں ہے، بلکہ ہم خود اپنی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق ایک فلسفہ حیات تصنیف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس بنیادی تصور کی بنا پر سوشلزم اپنا ایک فلسفہ تاریخ تصنیف کرتا ہے۔ ایک فلسفہ معیشت اختیار کرتا ہے اور اس فلسفہ معیشت کو نافذ کرنے کے لیے جس تدبیر سے بھی کام لیا جاسکے لینا چاہیے، خواہ وہ جھوٹ ہو یا بد عہدی ہو یا قتل و غارت اور خونریزی۔ پھر اسلام جو اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے، سوشلزم کا تجویز کردہ اجتماعی نظام اس کی بالکل ضد ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام ایک طرف فرد کی آزادی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، لیکن اُسے ایسے حدود کا پابند بناتا ہے جس سے وہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید بن سکے۔ دوسری طرف وہ اتنی ہی بنیادی اہمیت ایک صالح معاشرہ کے وجود کو دیتا ہے، جس کے اندر انفرادی انسانی فضائل کے نشوونما کا پورا موقع ہو، افراد اور طبقوں اور گروہوں کے درمیان کشمکش اور منافرت کے بجائے باہمی تعاون، ہمدردی اور احسان کی روح کا رفا ہو اور پورا معاشرتی نظام برائیوں کو دبانے اور نیکیوں کو فروغ دینے والا ہو۔ سوشلزم کے نزدیک وسائل معیشت کے معاملے میں انسانی ملکیت اور انسان کے تصرف کی آزادی



ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے وہ ایک ایسا اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے جس میں تمام وسائل معیشت اجتماعی ملکیت میں لے لیے جائیں اور افراد کو اجتماعی مشین میں کس کر رکھ دیا جائے، لیکن یہ ایک عجیب تضاد خیالی ہے کہ جو نظریہ معاشرے کے افراد کو ناقابل اعتماد قرار دے کر تصنیف کیا گیا ہے، وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ جب اجتماعی مشین کو مرکز میں چند افراد چلاتے ہیں گے تو وہ تمام عیوب سے منزہ اور سبوح و قدوس انسان ہوں گے۔ ان کے انتظام اور قبضہ و تصرف میں پورے ملک کے وسائل معیشت صحیح طور پر استعمال ہوں گے اور دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہوگی۔

کیونکہ فلسفے کا آغاز اپنی جانب داری کے تصور سے ہوتا ہے یعنی پروتاریہ کی حمایت اور اس کے ماسوا تمام دوسرے افراد اور گروہوں سے شدید نفرت اور ان کے خلاف جنگ کا جذبہ۔ اس صورت میں آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایک پورے معاشرے کے درمیان منصفانہ تقسیم کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کے بعد آپ نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محدود سے محدود تر انسانی گروہ جس کے ہاتھ میں آخر کار نظام تقسیم پر عملدرآمد کے اختیارات مرکوز ہوتے ہیں وہ عملاً اس مقام پر آجاتا ہے جو بادشاہی نظام میں کسی بادشاہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں کسی سرمایہ دار اور جاگیردارانہ نظام میں کسی جاگیردار کی جباریت سے بدرجہا زیادہ سخت جبار کا مقام ہے، کیونکہ یہاں پوری مملکت کے تمام ذرائع پیداوار ان کے قبضے میں ہوتے ہیں اور انہی کے ہاتھ میں پوری سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ لوگوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں تو ان میں اور اس جیلر کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا جو قیدیوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور علاج فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے نہ صرف یہ کہ ہمارے اقتصادی  
امراض کا علاج نہ ہوگا بلکہ اس سے ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ہماری پوری  
معیشت پر بیوروکریسی کا قبضہ ہو جاتے گا اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی  
وہ موجودہ نظام سے پیدا ہونے والی خرابیوں سے ہزار گنا بڑی ہوں گی۔ برطانوی  
عہد حکومت اور پھر آزادی کے بعد گزشتہ دو عشروں میں بیوروکریسی کے جو  
کرتوت ہم نے دیکھے ہیں ان کے نتیجے میں پوری قوم احتجاج پر مجبور ہو گئی، حالانکہ  
یہ حقیقت ہے کہ یہاں بیوروکریسی کی طاقت نسبتاً محدود تھی۔ پھر اگر سیاسی اقتدار  
کے ساتھ ساتھ صنعت، تجارت اور زراعت کے تمام ذرائع کا کنٹرول بھی بیوروکریسی  
ہی کے ہاتھ میں آجائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے ظلم و استبداد اور عوام  
کی کس میرسی اور بیچارگی کا کیا عالم ہوگا۔

سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیازات سے مراد اگر مستقل قسم کی ذات  
پات کا نظام ہے جیسا کہ ہندوستان میں پایا جاتا ہے، جس کو ہندو مذہب جائز  
قرار دیتا ہے اور جسے قانون اور حکومت کی مشینری کے تعاون سے محفوظ رکھا گیا  
ہے، تو اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مسلمانوں میں جو کبھی اسلامی اصولوں  
سے ہٹ کر کوئی طبقاتی نظام پیدا ہوا تو ضرور اُس نے بُرے نتائج دکھائے، لیکن  
اگر اُن بُرے نتائج سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ بدروستی ایک بے طبقہ سوسائٹی اُس  
نمونے پر پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے جسے سوشلزم نے اپنا آئیڈیل قرار  
دیا ہے اور جسے دونی الواقع پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے تو یہ ہماری  
دوسری غلطی اور پہلی غلطی سے بھی بدتر غلطی ہوگی۔ چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے  
خوبصورتی، ذہانت اور صلاحیتوں سے یکساں طور پر نہیں نوازا ہے اس لیے ان  
کی جدوجہد کے ماحصل میں اختلاف اور تفاوت کا ہونا ناگزیر ہے۔ سوشلزم کا دعویٰ

پہلے یہ نہیں تھا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو بلکہ وہ یہ دعویٰ لے کر اٹھا تھا کہ دولت کی مساویانہ تقسیم ہو، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اُس کو اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس کے بعد اُس نے دولت کی تقسیم کی جو دوسری صورت اختیار کی وہ منصفانہ تقسیم کی تعریف میں سرے سے آتی ہی نہیں بلکہ اُس کے اوپر اگر کوئی صحیح لفظ منطبق ہوتا ہے تو وہ جابرانہ تقسیم کا لفظ ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ حلال طریقوں سے جو دولت بھی انسان کو حاصل ہو وہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ جس پر رحمتنا چاہے فضل کرے اور حرام طریقوں سے جو مال حاصل کیا جائے اُس کا حصول جرم ہے اور اس جرم کی سزا نوعیت جرم کے لحاظ سے اسلام میں تجویز کر دی گئی ہے۔ ناجائز ملکیت خواہ چھوٹی سے چھوٹی ہو بہر حال ناجائز ہے اور جائز ملکیت خواہ بڑی سے بڑی ہو بہر حال جائز ہے قطع نظر اس سے کہ ملکیت چھوٹی ہو یا بڑی تصرف کے تمام غلط طریقوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے اور اس کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی ہیں۔ رہے صحیح طریقے تو ان میں سے بعض کو لازم کر دیا ہے جیسے زکوٰۃ اور بعض کے لیے ترغیب دی ہے تاکہ فرد خود اپنی رضا کارانہ نیکی کے ذریعے سے اپنے اخلاقی و روحانی ارتقاء کا بھی سامان کرے اور معاشرے میں بھی کشمکش اور نفرت کے بجائے جو سوشلزم کی جبلت میں ہے، آپس کی محبت اور خیر خواہی پیدا ہو۔ ٹیکس اس طرح عائد کیا جانا چاہیے کہ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے اتنا ہی زیادہ حصہ ادا کرے مگر اس میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ آدمی کے لیے جائز طریقوں سے حلال دولت کمانے کا محرک (incentive) بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ بجائے اس کے کہ صنعت، تجارت اور دوسرے وسائل ثروت کو ضبط کر کے قومی ملکیت



بنالیا جاتے اور اس طرح چھوٹی بیماری کا علاج ایک بہت بڑی بیماری سے کیا جاتے، ہم آئندہ کے لیے ان تمام حرام طریقوں کو قانوناً ممنوع کر دیں گے جن سے دولت کا ارتکاز پیدا ہوتا ہے اور پہلے جواز تکاز واقع ہو چکا ہے اس کو مختلف قوانین کے ذریعے باقاعدہ توڑ دیں گے اور عوام کے تمام طبقات کو زندگی کی کم سے کم ضروریات خوراک، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی ضمانت دیں گے۔

پاکستان میں اس وقت جو نظریاتی انتشار پایا جاتا ہے اُس کے ذمہ دار سوشلسٹ ہیں جنہوں نے ایک ایسے مادی فلسفے کو بطیب خاطر قبول کر لیا ہے جو اسلام کی تعلیمات اور اُس کے تقاضوں کا صریح مخالف ہے۔ یہ لوگ عوام کو دھوکا دینے اور اپنے پروگرام کو ان کی نظر میں خوش گن بنانے کے لیے ان سادہ لوحوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ غیر اسلامی باتیں اسلامی ہیں۔ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح ظاہر کرتی ہے کہ یہ سوشلزم کے مختلف مسابک (school of thought) ہی میں سے کوئی ایک مسلک ہے یا بالفاظ دیگر اسلام کا کوئی نیا ایڈیشن ہے جو کچھ چیزیں اسلام کی اور کچھ چیزیں سوشلزم سے لے کر اسلام کے نقص اور خایموں کو دور کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اسلام اور اُس کے معتقیات کی نفی اور تذلیل پر مبنی ہے اور بجائے خود ایک متناقض اصطلاح ہے۔

دمشق (شام) کے عربی ماہنامہ "الاخوان المسلمون" کے نامہ نگار نے مولانا مودودی کا انٹرویو لیا تھا۔ نامہ نگار نے مولانا سے سوال کیا: آپ کمیونزم کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا:-

"ہم کمیونزم کی مخالفت محض اس لیے نہیں کرتے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور فلسفہ اخلاق کا صریح منکر اور الحاد و ماتہ پرستی کا پُر جو ش مبلغ اور اسے بزور



شمشیر پھیلائے کا قاتل ہے بلکہ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کمیونسٹ نظام کا قیام اور ظلم و ستم، جو روتشتہ، تعذیب و عقوبت اور خوف و دہشت کا دور دورہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس نظام کو دوام بخشنے کے لیے استبداد کو جائز قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہم کمیونزم کی مخالفت اس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہ آزادی تنقید اور امن کیش حزب اختلاف کو برداشت نہیں کرتا، نہ وہ خرابیوں کی اصلاح یا دستوری طریقوں سے حکومت بدلنے کا موقع دیتا ہے۔ چونکہ ہمارے نزدیک مذہبی نقطہ نظر سے — بشرطیکہ آپ مذہب کو اس کے وسیع مفہوم میں لیں — یہ امور نہایت ضروری ہیں اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کمیونزم کی مخالفت خالص مذہبی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

ہم مغربی بلاک اور اُس کی سامراجی پالیسیوں کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ کمیونزم کے مخالف ہیں۔ ہمارے بارے میں یہ خیالی سراسر غلط ہوگا کہ چونکہ ہم کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مغربی سامراجیوں کے حامی ہیں۔ ہم دونوں کے مخالف ہیں اور اگر کوئی شخص بیک وقت ایسے دو گروہوں کا مخالف ہے جو خود ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو اس بنیاد پر یہ کہنا غلط ہوگا کہ چونکہ وہ ایک گروہ سے لڑ رہا ہے اس لیے لازماً دوسرے گروہ کا حامی ہے۔ ان خطوط پر سوچنا درست نہیں ہے۔

لندن کے زمانہ قیام میں برطانیہ کے مسلمان طلبہ کی سوسائٹی کے عربی ماہنامہ "الغریب" کے

مدیر نے مولانا سے انٹرویو لیا۔ انہوں نے سوال کیا: ”دنیا کے مختلف حصوں میں اس وقت جو اسلامی تحریکیں سرگرم عمل ہیں، ان کے لیے آپ کون سا طریق کار تجویز کرتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا:-

”میرے خیال میں یہ اسلامی تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک کے استبداد کی مہمیت اور نوعیت کا ٹھیک ٹھیک اور دانش مندی سے تعین کریں۔ پھر اس مہمیت اور نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس استبداد کے خلاف جدوجہد کے مناسب راستے اور ذرائع اور اسلامی نصب العین کی طرف پیش قدمی کے مواقع تلاش کریں۔ مختلف مسلمان ملکوں میں استبداد کا مزاج اور پھیلاؤ اس قدر مختلف ہے کہ سب کے لیے کوئی ایک طریق کار تجویز کرنا ناممکن ہے، لیکن ان تمام حالات میں ایک بات میرے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی تحریک کے رہنما اور کارکن خفیہ زیر زمین تحریکوں یا خونی انقلابات کے طور طریقے، چاہے وہ کتنے ہی مرغوب اور خوش کن کیوں نہ ہوں، اختیار کرنے سے محتجب رہیں اور اس سلسلے میں ہر ترغیب اور تشویش کی مزاحمت کریں۔ اللہ کی راہ میں علانیہ اور پرامن طریقے سے کام کرنے کی تیاری کریں، اگرچہ اس طرح انہیں شدید خطرات اور ناگفتہ مصائب حتیٰ کہ قید و بند اور پھانسیوں ہی سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے۔“

برطانیہ اور آئرلینڈ کے مسلمان طلبہ کی انجمنوں کے دفاع کے ترجمان ”دی مسلم“ کے مدیر نے مولانا سے دریافت کیا: ”اسلامی تحریکوں کے کارکن جو جدوجہد کر رہے ہیں، چونکہ اس میں انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی اور بدی کی طاقتیں بدستور غالب ہیں اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ

دل شکستہ اور مایوس ہو جائیں؟“ مولانا نے فرمایا:-

اگر اسلام کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں پر مایوسی اور افسردگی طاری ہوتی ہے تو اس کا صرف ایک سبب ہو سکتا ہے۔ جدوجہد شروع کرتے وقت ہی وہ یہ توقع باندھ لیں کہ ان کی کوششیں ان کی زندگی ہی میں مطلوبہ پھل لے آئیں گی۔ ہمیں یہ تو امید رکھنی چاہیے کہ جن حالات میں ہم اس وقت محصور ہیں وہ ہمارے حق میں تبدیل ہوں گے، لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ سچے مسلمان کی جدوجہد کا محرک صرف ایک خیال ہوتا ہے اور وہ ہے رضائے الہی کا حصول۔ ہماری نگاہیں صرف آخرت کے انعام پر مرکوز رہنی چاہئیں۔ اس دنیا میں چاہے جیسے نتائج بھی رونما ہوں ان کی نوعیت محض ضمنی نتائج کی ہے۔ ہمارا حقیقی مقصد اپنے خالق کی مرضی کو پورا کرنا ہے۔ جو لوگ اپنی کوششوں کے نتائج فوری طور پر دیکھنے کے آرزو مند ہیں انہیں بدرِ واحد کی لڑائیوں میں شہید ہونیوالوں کی مثالیں اپنے سامنے رکھنی چاہئیں۔ ان حضرات نے دعوتِ اسلامی کی تکمیل کی خاطر اپنا خون بہایا، لیکن کیا انہیں اپنی قربانیوں کا کوئی دنیاوی پھل ملا؟ انہوں نے صرف ان نتائج کو اپنے سامنے رکھا جو اس دنیا میں نہیں آخرت میں رونما ہونے والے تھے۔ اگر وہ اسلامی تحریک کی آبیاری اپنے خون سے نہ کرتے اور اگر وہ قربانیاں نہ دیتے تو آنے والی نسلیں ان تبدیلیوں کو نہ دیکھ پاتیں جنہوں نے تاریخ کا دھارا ہی بدل ڈالا، لیکن انہوں نے ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے کبھی جدوجہد نہ کی۔ وہ اپنی کوششوں کا پھل دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے۔ ان کا حقیقی مدعا اس فرض کی ادائیگی تھا جو اللہ نے ان پر عائد کیا تھا۔ اسلام کا کام کرنے والوں کو یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔



اسی طرح اخوان کے عربی مجلہ "الاخوان المسلمون" کے مدیر نے دریافت کیا: مختلف مسلمان ملکوں میں بڑی طاقتوں کے اشارے پر اسلامی تحریکات کو کچلنے کی جو کوششیں حال ہی میں کی گئی ہیں، کیا ان سے اسلامی تحریکوں کے ارکان اپنے کام کے سلسلے میں پست ہمت نہ ہو جائیں گے؟ مولانا نے جواب دیا:-

"جو لوگ فی الحقیقت اسلام سے محبت کرتے ہیں، جن کا ذہن مطمئن ہے کہ حق ہے تو یہی اور جو اس پر ایمان کامل رکھتے ہیں وہ موجودہ صورت حال میں نہ تو پست ہمت ہو سکتے ہیں نہ مایوسی کے آگے سپردال سکتے ہیں۔ ایسے لوگ آخر دم تک اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں خواہ یہ جدوجہد اس دنیا میں کامیاب ہوتی ہے یا ناکام۔ اگر وہ لوگ اس دنیا میں بظاہر ناکام بھی رہتے ہیں تب بھی اسے اپنی ناکامی نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور آخرت کی کامیابی ہی ان کی جدوجہد کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے وہ شخص ناکام نہیں ہوتا جو پورے خلوص اور فرض شناسی کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے حقیقی ناکامی اور ذلت و پستی سے ہمکنار تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، لیکن اسلامی نظام قائم کرنے والوں کی جدوجہد کے راستے روڑے اٹکاتے اور انہیں شکست سے دوچار کرنے کے لیے اپنی سی ہر کوشش کر گزرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی مزا کے مستحق ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی۔ اس مزا میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن جب ان پر اللہ کا غضب ٹوٹے گا تو ساری دنیا کے لیے دس عبرت ہوگا، تاہم مجھے یقین ہے کہ جس طرح کل سورج طلوع ہونے والا ہے اسی طرح اسلام کی طاقتیں بھی آخر کار فتح یاب ہوں گی۔ انشاء اللہ۔"

آج دنیا میں مسلمان جس پس ماندگی سے دوچار ہیں اس کا سبب کیا ہے؟ جمعیتہ طلبہ کے



اجلاس کراچی میں ۱۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کو تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

”مسلمان ممالک میں ترقی کی رفتار جس افسوس ناک حد تک سُست ہے

اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حکمران اجنبی اقدار و نظریات کو مسلمان عوام پر

مسط کرنے کی جو کوشش کر رہے ہیں اور اُس کے نتیجے میں جو مسلسل آویزش جاری

ہے اس کی کتنی بھاری قیمت مسلمانوں کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ سادی دنیا میں ایک

مسلمان ملک بھی ایسا نہیں جس نے کسی ایک شعبے ہی میں کوئی نمایاں ترقی کی ہو۔

مثلاً ترکی کو لیجئے۔ وہ ۱۹۲۴ء سے ایک آزاد مملکت چلا آتا ہے، لیکن کیا وہ صنعت

تجارت میں کسی بڑی ترقی کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اسی مدت میں جاپان اور چین

نے عملاً تمام میدانوں میں نمایاں ترقی کی اور اب وہ دنیا کی سب سے ترقی یافتہ

قوموں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ترکی نے کیوں ترقی نہیں کی؟ اس کا

سبب وہ آویزش ہے جو ترکی کے حکمرانوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ

ملک پر مغربی تہذیب کو مستط کرنے کی سرگود کوشش کرتا رہا ہے جب کہ

عوام اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ یہی داستان کم و بیش ہر مسلمان ملک میں دہرائی

جارہی ہے۔ کوئی قوم ترقی کی راہ پر اُسی وقت گامزن ہو سکتی ہے جب کہ عوام

کی اُمنگوں اور ان کی حکومت کی پالیسیوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ تمام مسلمان

ممالک جس آویزش سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ حکمران مسلمان عوام کو جس طرف بھیجنے

کے خواہش مند ہیں مسلمان عوام اُس طرف جانے کے لیے تیار نہیں۔ اور ہر مسلمان عوام

جس طرف جانا چاہتے ہیں ان کے حکمران انہیں اس طرف لے جانے کے لیے آمادہ

نہیں۔ اس صورتِ حال نے عالمِ اسلام کو ایک مسلسل داخلی آویزش میں مبتلا کر دیا ہے۔

اور یہ ہے آج کا اسلام۔“

مولانا مودودی نے دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ کیفیت اور کیت دونوں اعتبار سے گراں بہا ہیں۔ اس باب میں وہ اپنے بہت سے پیشروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ انہیں نہ صرف علومِ اسلامی پر مکمل عبور حاصل ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید دنیوی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا علم بڑی حد تک، خود آموزی کا رہن منت ہے، تاہم اُن کا تجربے پایاں ہے۔ وہ مذہب، فلسفہ، فنون و علوم، سیاسیات اور اقتصادیات پر یکساں ہمہ گیری سے لکھ اور بول سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کو دوسرے نظام ہائے زندگی پر جو تفوق اور برتری حاصل ہے مخالفین اسلام نے اسے ختم کرنے اور اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ مولانا نے اپنے بے پایاں علم سے بڑے مؤثر انداز میں ان شکوک و شبہات کو رفع کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ خصوصاً جدید مادہ پرستانہ نظریات کی بے مائیگی کو ایک سو سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابوں میں بالتفصیل پیش کیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے اسلوب اور استدلال کی بنا پر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں۔ مولانا کے کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنی ان کتابوں میں انہوں نے دوسروں کو جو کچھ یقین کی ہے پہلے خود اس پر عمل کر دکھایا۔ قولِ عمل کی اس ہم آہنگی پر ان کا بے داغ عوامی اور نجی کردار شاہد ہے۔ ماضی اور حال کے تمام دوسرے حقیقی خادمانِ اسلام کی طرح مولانا مودودی نے بھی اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ بے عیب اخلاقی کردار کے مالک ہیں، نہایت نڈر، بے غرض، فرد تن، بے ادعا، شفیق اور بامروت ہیں۔ خوشامد سے نفرت کرتے ہیں، شان و شوکت، دولت مندی اور عیش و عشرت سے مجتنب رہتے ہیں۔ گھر میں خود بھی سادگی سے رہتے ہیں اور اپنے اہل بیت کو بھی سادہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نہ صرف خود پابندِ شریعت مسلمان ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی اہلیہ، چھ صاحبزادوں اور تین صاحبزادیوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ان کی اہلیہ ایک طویل عرصے تک مغربی پاکستان کے علاقہ خواتین کی رہنما رہ چکی ہیں۔ وہ بڑی ہی اچھی گریسٹن

اور ماں ہیں۔ فراغت کا اکثر حصہ قرآن و حدیث کے مطالعہ میں صرف کئی اور جماعت کی دعوت سے متاثر خواتین کو درس دیتی ہیں جو ہفتے میں ایک بار ان کے ہاں جمع ہوتی ہیں۔ مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے عمر فاروق ترجمان القرآن کے انتظام اور نشر و اشاعت میں مدد دیتے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کاموں میں اپنے والد بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تمام دوسرے صاحبزادے بھی اپنے والدین کے اطاعت گزار، ان کی مساعی میں معاون، اپنے مذہب کے پابند، ذہین اور اسلامی و جدید علوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ مولانا مودودی روزانہ عصر کے بعد اپنے گھر کے لان میں بیٹھتے ہیں جہاں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مختلف عمر کے نوجوان اور بوڑھے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ اس نشست میں ہر شخص اسلام، قومی و بین الاقوامی معاملات کے بارے میں جو پوچھنا چاہے پوچھ سکتا ہے۔ جب میں ان کے ہاں مقیم تھی ان کے ایک بچے نے ان اصحاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا: "میرے آبا جان کا گھرانا ہے؟" مولانا مودودی اپنا خاص وقت ان خطوط کا جواب دینے میں صرف کرتے ہیں جو دنیا کے ہر حصے سے مسلمان اور غیر مسلم اسلام کے بارے میں علم حاصل کرنے کے لیے ان کے نام بھیجتے ہیں۔

تحریر و تصنیف، تبلیغ و تلقین اور عمل کے میدان میں جس قدر مؤثر کام مولانا مودودی نے کیا ہے ماضی یا حال میں احیائے اسلام کی جدوجہد کرنے والے بہت کم اصحاب کو پاتے ہیں۔

مجدد نبی نہیں ہوتا، مگر اپنے مزاج میں مزاج نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک، بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانے کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرات، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیر نو کی غیر معمولی اہلیت اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطہ نظر اور فہم و شعور



میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک تر جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت میں تمیز کرنا اور مدت ہائے دراز کی الجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی مجدد نہیں ہو سکتا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ شرعی سے مامور ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے۔ اس کے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے اور اس کی دعوت کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر لوگوں کے کافر یا مومن ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس ان کے مجدد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔ وہ اگر مامور ہوتا ہے تو امرِ کوہینی سے ہوا کرتا ہے نہ کہ امرِ شرعی سے۔ بسا اوقات اُسے خود اپنے مجدد ہونے کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اُس کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اس کے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ مجدد کے کارِ تجدید کے مختلف شعبے حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) اپنے ماحول کی متوجہ شخصیں، یعنی حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے۔ کن کن راستوں سے آتی ہے۔ اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں اور اسلام اس وقت تک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یہ تعین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔



(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستے سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و

افکار اور اخلاقی نقطہ نظر کو اسلامی سلیچے میں ڈھالنا، نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیا کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سر نو تازہ کرنا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباعِ شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈ بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصولِ کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی

حالات اور ارتقاءاتِ تمدن کی سمت کا اسلامی نقطہ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے ماتحت تمدن کے پرانے متواتر نقشے میں کس طرح رد و بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پر رے ہوں اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جدوجہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت

کا مقابلہ کرنا اور اُس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) اجائے نظام اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین

لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے خلافت علی منہاج النبوة کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش یعنی صرف ایک ملک یا ان ملک میں جہاں مسلمان

پہلے سے موجود ہوں اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا بلکہ ایک ایسی طاقتور اور

عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں

پھیل جاتے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظام تمدن میں  
اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت و  
ریاست اسلام کے ہاتھ میں آجائے۔

جس شخص نے ایک، دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کام انجام دیا ہو وہ  
بھی مجدد قرار دیا جاسکتا ہے البتہ اس قسم کا مجدد جزوری مجدد ہو گا کامل مجدد نہ ہو  
گا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دیکر  
در ائمت نبوت کا حق ادا کر دے۔

یہ محض ایک رائے نہیں حقیقت واقعہ ہے کہ مولانا مودودی اس پردہ گرام کے سات  
نکات میں کامیاب ہو چکے ہیں ادب باقی ماندہ دو نکات کو عمل میں لانے کی جدوجہد میں  
مصرف ہیں، لیکن اس نمایاں کارنامے کے باوجود وہ اپنے لیے اقتدار کے خواہاں نہیں۔ مولانا  
کئی بار اعلان کر چکے ہیں کہ وہ ایک صحیح اسلامی ریاست میں چپڑا سی کی خدمت انجام دینے میں  
بھی مسرت محسوس کریں گے، لیکن ایک قومی لادینی حکومت میں کوئی بڑے سے بڑا منصب  
بھی کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ مولانا مودودی نے ماضی کی تمام اسلامی تحریکات کا  
انتہائی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کمزوریوں اور توانائیوں پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ ان کی غلطیوں  
اور کامیابیوں سے فائدہ اٹھا کر دعوت اسلامی کی راہ میں آنے والے ہر ممکن خطرے سے بچ سکتے  
ہیں۔ اس طرح اس بات کا روشن امکان ہے کہ جہاں ان کے پیشرو ناکام رہے ہیں، وہاں وہ  
اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

۲۴۸

# جماعت اسلامی پاکستان

جماعت اسلامی کی تحریک کا آغاز ۱۹۳۲ء سے ہوتا ہے جب مولانا مودودی نے اپنے اُردو ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ میں اسلامی نظام حیات کے موضوع پر باقاعدہ مکتبہ شروع کیا۔ جدید مغربی تہذیب مسلمانوں پر جس طرح اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، ”ترجمان القرآن“ نے ان پر بطور خاص توجہ کی۔ مولانا نے اپنے پُر زور استدلال اور واضح ادبی اسلوب سے اُس مادہ پرستانہ فلسفے کی موثر تردید کی جو مسلمان نوجوان کے ذہن کو ماؤٹ کر رہا تھا۔ اس طرح بڑی کامیابی کے ساتھ اسلامی نظام حیات کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ایک تعلیمی اور سماجی پروگرام شروع کیا جو مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے لیے سخت تباہ کن تھا۔ ہندو استیلا کے خطرے سے مسلمانان ہند کو خبردار کرنے کے لیے مولانا مودودی نے ”ترجمان القرآن“ میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ یہ مضامین بعد ازاں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے ذریعے مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے جدا گانہ شخص رکھتے ہیں۔ تحریک کا یہ دور تقریباً آٹھ برس پر محیط تھا۔ اب اسلامی نظام حیات کے قیام کی اجتماعی جدوجہد کرنے کا وقت آگیا تھا۔ مولانا نے اُن تمام لوگوں کو جو اُن کے



نظریات سے متفق تھے، دعوت دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور باقاعدہ تنظیم کی صورت اختیار کریں۔  
۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا مودودی اور ۵ دوسرے اصحاب لاہور میں جمع ہوئے اور جماعت اسلامی  
کی بنیاد رکھ دی گئی۔

جماعت اسلامی کا نصب العین پوری انسانی زندگی کو، اس کے متنوع پہلوؤں —  
عقائد، نظریہ، مذہب، اخلاقیات، کردار، طرز عمل، تعلیم، تربیت، معاشرتی نظام، ثقافت،  
اقتصادی نظام، سیاسی قالب، قانون اور عدلیہ، جنگ اور امن، داخلی امور اور بین الاقوامی تعلقات  
سمیت اس قانون الہی کی اطاعت میں دنیا ہے جس کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی  
اور جو قرآن و سنت میں محفوظ ہے۔ جماعت اسلامی کا ابتدائی پروگرام دو مرحلوں پر مشتمل تھا۔ اسلامی  
نظریے کی پرجوش تبلیغ و اشاعت اور برصغیر کے مسلمانوں کی عملی تربیت تاکہ وہ اس نظریے کو عملی جامہ  
پہنا سکیں۔ ہندوویت کے مشترک اثرات سے ہندوستان کا مسلمان معاشرہ بے حد بگڑ چکا تھا،  
اس کے اندر اسلامی تعلیمات کے منافی رسوم نے راہ پالی تھی۔ طرہ یہ کہ مسلمانوں کی کمزوری سے برطانوی  
سامراج نے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ میدان  
جنگ میں شکست کھانے کے بعد مسلمان اپنے فلاحی بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ  
اپنی ہر چیز سے نفرت اور اغیار کی ہر شے کی پر جاکر نہ لگے۔

اس مرحلے پر جماعت اسلامی نے تمام غیر اسلامی اثرات، بالخصوص ہندو اور رسوم، جدید  
مارہ پرستی اور اتحاد پر دو طرفہ حملہ کیا۔ اُن کی جعلی بُرائیوں کو بے نقاب کیا اور ان خرابیوں کو دور کرنے  
کے لیے اسلام جو چارہ تجویز کرتا ہے اُسے پیش کیا۔

”ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام درودوں کی دوا  
ہے۔“ اسلامی حکومت ”یاہ آزاد ہندوستان میں اُتاد اسلام“ کے مقصد تک  
پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب  
ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام

کریں، لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو یا سکھ یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سر بلندی کے لیے مفید ہوتا ہے خواہ وہ ہٹلر ہو یا مسولینی..... اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر۔ کیونکہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نام تشریف لیبیل لگا ہو گا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت "ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اُس کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"

"تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی پر جلد ہی عیاں ہو گیا کہ ہر سیر اقتدار طبقہ پاکستان کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ برطانوی حکومت کی میراث سبتہ کر جاری رکھنے کا خواہش مند ہے۔"

"آپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جماعت اسلامی کا اصل مقصد موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری

کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے جو ہمیں برطانیہ سے ورثے میں ملا ہے، اور انہی اصولوں پر چلتا رہے، مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے یا انگریز نہ چلائے ہندوستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے مسلمان چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا..... ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔ وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے اور انہیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

چنانچہ جماعت اسلامی نے پہلا بڑا کام یہ کیا کہ رائے عامہ کو خوب اچھی طرح منظم کیا اور حکومت پر زور دیا کہ نئی مملکت جن اغراض و مقاصد کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور جنہیں پورا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، ان کے مطابق ملک کا دستور وضع کیا جائے۔ جماعت اسلامی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ پاکستان کے اسلامی کردار کو متعین کرنے کے لیے ایک صحیح دستور کی تشکیل و تدوین نہایت ضروری ہے۔ پاکستان کی اساس، استحکام، سالمیت اور اتحاد کا انحصار ہی اس بات پر تھا کہ نئے دستور کی ماہیت کیا ہوگی۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے اپنی ساری مساعی قومی دستور یہ سے یہ مطالبہ منوانے پر مرکوز کر دی کہ نئے دستور میں مشہور و معروف "قرارداد مقاصد" شامل کی جائے جس میں خصوصیت کے ساتھ یہ تصریح ہو کہ اسلامی احکام کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور تمام موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ اس مطالبے سے برسرِ اقتدار طبقہ بُری طرح بوکھلا گیا؛ چنانچہ مولانا مودودی، میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ جماعت اسلامی نے پوری بے خونی اور جرات کے ساتھ قرارداد مقاصد منظور کرنے کا مطالبہ جاری رکھا۔ آخر برسرِ اقتدار طبقہ اس مطالبے کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا اور مارچ ۱۹۴۹ء



میں دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کر لی۔

”جماعت اسلامی نے عملی سیاست میں حقہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے، بعض حلقوں میں اس بارے میں غلط فہمی پاتی جاتی ہے۔ اس لیے اس پالیسی کی تشریح و توضیح ضروری ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جماعت اپنی سرگرمیاں صرف ”تبلیغ“ تک محدود رکھتی تو زیادہ بہتر تھا۔ اس طرح وہ حکومت کی نگاہوں سے بچی رہتی اور برسرِ اقتدار طبقے کے ساتھ کوئی تصادم نہ ہونے پاتا۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا موقف نہایت واضح ہے۔ اس کی رائے میں ——— اور یہ رائے تاریخ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ ——— اسلام کی حقیقی اور سچی تبلیغ، نہ اقلہ اقتدار میں مدہوش، اللہ کی رہنمائی کو بہت کم خاطر میں لایا، نہ اقلہ مطلق السنان حکمرانوں کے لیے کبھی خوانِ نیما نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ جس نرالی قسم کی تبلیغ کو بے ضرر سمجھتے یا جس کو برداشت کرتے اور اپنی سرپرستی سے نواز کر جس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اُس کا اُس تبلیغ سے کوئی تعلق نہیں جس کا بیڑا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا، جس کو حضورؐ نے خود منظم کیا، جس پر حضورؐ خود عمل پیرا ہوئے اور جس کی دوسروں کو تعلیم دی۔ بنا بریں جماعت اسلامی تبلیغ کا چاہے کوئی سا طریقہ اختیار کرتی، اگر یہ تبلیغ اسلام کے مکمل مضابطہ حیات ہونے کے صحیح انقلابی پیغام پر مبنی ہوتی تو لادینیت کے گردیدہ اور عوام پر مغربی ثقافت اور اس کی اقدار کو مستط کرنے پر تلے ہوئے یہ حکمران اُسے قابلِ اعتراض قرار دیتے۔“

برسرِ اقتدار طبقہ مسلسل اسلامی نعرے لگاتا اور زبانی ہمدردی کے دعوے کرتا رہا، مگر



عملاً اُس نے اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنے کی ذرا سی کوشش کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ حکومت  
 کی فضا خالص بے دینی اور ابن الوقتی سے مسموم اور گونا گوں بدعنوانیوں سے آلودہ تھی۔ سکول  
 اور یونیورسٹیاں جہاں مخلوط تعلیم روز بروز فروغ پذیر تھی، لادینی ذہن کے حامل اور اسلامی  
 سیرت سے کورسے نوجوان پیدا کر رہی تھیں۔ ریڈیو، سینما اور اخبارات تہذیب جدید کے  
 انتہائی غیر اخلاقی پہلوؤں کو ہوا دے رہے تھے۔ برسر اقتدار لوگ نہ صرف اس صورت حال  
 کی روک تھام سے قاصر رہے تھے بلکہ بڑی سرگرمی سے اس کی سرپرستی میں مصروف تھے، لہذا  
 جماعت اسلامی برسر اقتدار قیادت کو آئینی طریقوں سے ہٹا کر ایسے لوگوں کو آگے لانے کی عوامی  
 ہم چلانے پر مجبور ہو گئی جو زیادہ دیانت دار زیادہ مخلص، زیادہ اہل اور زیادہ محبت اسلام  
 عوامی خادم ہوں۔ یہ اقدام برسر اقتدار لوگوں کے لیے بے حد اشتعال انگیز اور ناقابل برداشت  
 تھا، چنانچہ وہ جماعت پر دار کرنے کے لیے کسی جھوٹے بہانے کی تلاش میں لگ گئے۔ قادیانیوں  
 کو جڈاگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اٹھا اور پنجاب میں ہنگامے برپا ہوئے تو یہ جھوٹا بہانہ  
 ہاتھ آگیا۔ ان لوگوں نے ان ہنگاموں کی ذمہ داری جماعت اسلامی پر ڈال دی اور مولانا مودودی  
 کو گرفتار کر لیا۔ مولانا ابھی قید و بند ہی میں تھے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے اپنی شہرہ آفاق  
 ”مینیر رپورٹ“ مرتب کی۔ اس رپورٹ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا  
 گیا تو پاکستان انتہائی قدامت پسند اور جنونی ملک بن جائے گا۔ اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے اور  
 غلط انداز میں پیش کرنے کی جو دیدہ و دانستہ کوشش اس رپورٹ میں کی گئی ہے شاید ہی کوئی  
 دوسری کتاب، حتیٰ کہ کسی غیر مسلم کی لکھی ہوئی کتاب، اس کی مثال پیش کر سکے۔ غیر مسلم اہل  
 علم کے ذہنوں پر منیر رپورٹ کے بڑے خطرناک اثرات پڑ سکتے تھے۔ جماعت اسلامی نے فوراً  
 اس رپورٹ کے ایک ایک نکتے کی تردید کی اور اسلامی ریاست کے خلاف جو دلائل منیر  
 صاحب نے دیئے تھے ان سب کو غلط ثابت کیا۔ جماعت کی اس جانفشانی مساعی کا نتیجہ  
 یہ نکلا کہ غیر مسلم اصحاب علم نے اب اس رپورٹ کو قابل اعتماد علمی دستاویز سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔

بالآخر دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں دستور منظور کر لیا۔ پاکستان کے اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اگرچہ جماعت اسلامی کے نقطہ نظر سے اس دستور کے بہت سے پہلو ناقص تھے، تاہم اُس نے اسے صحیح سمت کی جانب ایک انتہائی حوصلہ افزا قدم قرار دیا۔ بد قسمتی سے بعد کی حکومتوں نے اس دستور کو نظر انداز کر کے بالائے طاق رکھ دیا۔ اس دوران میں پورا ملک بے دینی، بد اخلاقی اور ہر طرح کی مکروہ بد عنوانیوں کا شکار ہوتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے آئینی حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لا نافذ کر دیا۔ ملک کے جمہوری اور اسلامی دستور کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور سیاسی جماعتیں جو چند ماہ بعد ہونے والے عام انتخابات کی تیاری کر رہی تھیں، توڑ دیں۔ مارشل لا دہی کے دوران میں ایک نیا دستور نافذ کر دیا جو از اول تا آخر خود ان کا اپنا ساختہ پر داختہ تھا۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں مارشل لا اٹھا دیا گیا۔

جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جو مارشل لا کی پابندیوں سے برسرِ اقتدار طبقے کی مؤثر سیاسی حریف بن کر ابھری۔ اُس نے نئے دستور میں ترامیم کرنے اور اس میں ۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی و جمہوری دفعات شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ برسرِ اقتدار گروہ نے سرکاری اخبارات میں جماعت اسلامی کے خلاف جھوٹے پراگینڈے کی مہم شروع کر دی اور جماعت کو ہر ممکن طریقے سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ یہ مہم ۶ جنوری ۱۹۶۲ء کو نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور مولانا مودودی اور جماعت کے

---

۱۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی کے خلاف سرکاری پراگینڈے کی مثالیں حکومت کے چھاپے ہوئے مندرجہ ذیل اُردو پمفلٹوں میں دیکھی جاسکتی ہیں: (۱) جماعت اسلامی اور قومی اخبارات۔ (۲) پاکستان اور جماعت اسلامی۔

اکثر رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ اس اقدام سے پہلے جماعت کے شدید ترین نقاد بھی یہ اعتراف کر چکے تھے کہ اس نے آج تک ملکی قانون کی خلاف ورزی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء کو مولانا مودودی نے اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جو نوائے وقت اور لاہور کے دوسرے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس بیان میں مولانا نے فرمایا تھا:

”میں اصولی طور پر تمام غیر قانونی، غیر دستوری اور خفیہ طریقہ سارے کار کا مخالف ہوں۔ میری یہ رائے کسی مصلحت یا خوف کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے۔ ساہا سال کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد میں اس نقطے پر پہنچا ہوں کہ قانون کا احترام بچانے خود کسی ہندسہ معاشرے کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے اور اگر کوئی تحریک یا جماعت ایک مرتبہ اس احترام کو پامال کر دیتی ہے تو پھر جب وہ خود برسرِ اقتدار آتی ہے تو اس کے لیے اس احترام کو بحال کرنا فی الواقع ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خفیہ جدوجہد کی فطرت ہی میں ایسے نقص اور کمزوریاں ہیں کہ جو لوگ اس سے کام لیتے ہیں وہ خود ان لوگوں سے زیادہ خطرناک بن جاتے ہیں جن کو وہ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے ہمیشہ کھلے عام اور مردِ جہد دستور کے قانونی حدود میں رہتے ہوئے کیا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے ان قوانین کی خلاف ورزی بھی کبھی نہیں کی جن کی خلاف میں بڑی سخت جنگ لڑتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ان قوانین کو آئینی اور دستوری ذرائع سے بدلنے کی کوشش کی ہے اور قانون کی خلاف ورزی

۱۔ حکومت نے جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے اس پر جو الزامات عائد کیے ان کے مکمل متنازعہ  
 لیے دیکھئے پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۷ جنوری ۱۹۶۴ء۔ نیز دیکھئے مغربی پاکستان ہائی کورٹ کراچی پنچ میں مولانا مودودی  
 کا بیان ایکسپریس آرڈینری جیورسڈکشن پیشین نمبر ۷ - ۱۹۶۴ء۔



کا راستہ کبھی اختیار نہیں کیا۔

آخر کار جب جماعت اسلامی کو خلافتِ قانون قرار دینے کا معاملہ سپریم کورٹ کے سامنے آیا تو ناضل جموں کی اکثریت نے جماعت پر پابندی عائد کرنے اور اُس کے رہنماؤں کو نظر بند کرنے کے سرکاری اقدام کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا۔

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا تو جماعت اسلامی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ہندوستان کی تحریکِ جُداگانہ قیادت کے تحت اُبھری۔ اگرچہ اس کے اغراض و مقاصد اور نظریات وہی رہے جو برصغیر کی جماعتِ اسلامی کے تھے۔ جماعتِ اسلامی کی ایک اور شاخ ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر میں انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود ابھی تک سرگرم عمل ہے۔ سیلون میں بھی جماعتِ اسلامی کی ایک چھوٹی سی آزاد اور فعال تنظیم موجود ہے۔

اس وقت جماعتِ اسلامی پاکستان کے دو ہزار سے زائد ارکان اور تقریباً ایک لاکھ متفق ہیں۔ ایسے مرد و زن لاکھوں کی تعداد میں ہیں جو تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں، لیکن اپنے نجی حالات (مثلاً سرکاری ملازمت وغیرہ) کی وجہ سے تحریک کے کاموں میں سرگرم حصہ لینے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ جماعتِ اسلامی کی رکنیت کے دروازے تمام لوگوں پر کھلے ہیں، تاہم ہر وہ شخص جو جماعت کا مرکز بننا چاہتا ہے اُس کو پہلے ایک بے عرصے تک آزمائشی دور سے گزرنا اور یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اُس نے نہ صرف جماعت کے اغراض و مقاصد، طریقِ کار، پالیسی اور پروگرام کو پوری طرح سمجھ لیا ہے اور اس کے ساتھ کامل اتفاق رکھتا ہے بلکہ وہ روزمرہ کی عملی زندگی میں اسلام کے مقتضیات پر بھی کاربند ہے۔ جماعت میں شامل ہونے کے بعد نئے رکن کو اپنی شخصی زندگی کے شب و روز بڑی حد تک بدل دینا پڑتے ہیں۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامِ کامل سے کم اتنا علم حاصل کرے

ملہ پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء اور اکتوبر ۱۹۶۲ء۔

۲ دستور جماعتِ اسلامی دفعہ ۶۔



جس سے وہ اسلامی اور غیر اسلامی طریق ہائے زندگی کے درمیان امتیاز کر سکے اور شریعت مطہرہ نے حلال و حرام کی جو حدود و مقرر کردی ہیں ان کے فہم سے پوری طرح بہرہ یاب ہو سکے۔ اُس کا فرض ہے کہ شریعت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اُن کو کرے اور جن سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے اُن سے باز رہے۔ اُس سے یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دوستانہ روابط پالی اور بدکار لوگوں سے منقطع کر لے اور نیک لوگوں کے ساتھ استوار کرے۔ کمائی کے حرام طریقے اختیار نہ کرے۔ ناجائز طریقے سے حاصل کردہ جائداد سے دست بردار ہو جائے اور جن لوگوں کے حقوق اُس نے غصب کر لیے تھے انہیں واپس کر دے۔ اُس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات کو دیانت داری، انصاف، بے میل راستی اور خدا ترسی سے انجام دے گا۔ اپنی پسند اور ناپسند، اپنے اذواق، اپنے جذبات اور میلانات کو اس حد تک بدل دے گا کہ وہ اسلامی طرزِ حیات سے مطابقت کرنے لگیں اور اسلام کے منافی اپنے تمام سابق میلانات کو مسترد کر دے گا۔ اُس سے یہ اُمید بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیداری کا تمام وقت اسلامی نظامِ حیات قائم کرنے کی جدوجہد میں صرف کرے گا اور زندگی کی حقیقی ضروریات کے سوا تمام وہ سرگرمیاں ترک کر دے گا جو اس نصب العین کی طرف بڑھنے میں ہمدرد نہیں ہیں۔

جماعت کے متفقین سب وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام غالب ہو وہ اس مقصد کے حصول کے لیے جماعت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں، لیکن نئی اسباب کی بنیاد وہ اپنے آپ کو جماعت کے نظم و ضبط اور اس کی ذمہ داریوں کے حوالے کر دینے سے معذور سمجھتے ہیں۔ جب کسی گاڈ یا قبیلے میں پانچ یا پانچ سے زائد متفق ہو جاتے ہیں تو ایک حلقہ متفقین وجود میں آجاتا ہے جو ایک ناظم کے تحت کام کرتا ہے۔

جماعت میں خواتین ارکان ایک سو سے کم ہیں باقی تمام ہمدرد خواتین کی تعداد بہت زیادہ

ہے۔ جلقہ خواتین میں بھی رکنیت کی وہی شرائط ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ ان کے علاوہ خواتین ارکان کے کچھ خصوصی فرائض بھی ہیں۔ وہ جماعت کی دعوت کو اپنے خاندان اور سہیلیوں تک پہنچائیں، اپنے بچوں کے دل میں ایمان کی شمع روشن کریں۔ اگر ان کے والد، شوہر، بیٹے یا بھائی جماعت میں شریک ہیں تو ابتلا اور آزمائش کے زمانے میں مہر و استقامت سے ان کا ساتھ دیں اس طرح سے ان کا حوصلہ بڑھائیں اور ان کو تقویت پہنچائیں۔ اگر کسی خاتون رکن کا شوہر اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہے، حرام ذرائع سے کماتا ہے یا گناہوں کا ازسکاب کرتا ہے تو اسے بڑے صبر کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کرنے یا کم از کم اُس کے بُرے کاموں سے حتی الامکان الگ رہنا چاہیئے اور قرآن و سنت کی خلاف ورزی کے معاملات میں اُس کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا چاہیئے۔

جماعت میں کسی شخص کا مرتبہ اس کی دنیوی معاشرتی حیثیت یا تعلیمی استعداد کی بنیاد پر متعین نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ احکام الہی کا کس حد تک پابند ہے، اسلام کا کتنا فہم رکھتا ہے، اپنی زندگی کو کس حد تک اُس کے مطابق ڈھالتا ہے، تحریک کو چلانے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کے لیے اپنی دولت، ذہانت، محنت اور وقت کی کس حد تک قربانی دینے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔

جماعت کی ہر مقامی شاخ ہفتے میں ایک یا دو بار اجتماع ارکان منعقد کرتی ہے جس میں وہ پچھلے ہفتے کے کام کا جائزہ لیتے اور آئندہ کے کام کا منصوبہ باہمی صلاح مشورے سے تیار کرتے ہیں۔ جماعت کے ہر کارکن سے اُس کی سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ اجتماع کے انعقاد سے پہلے طلب کی جاتی ہے۔ ہر رکن کے لیے سرگرم اور فعال ہونا ضروری ہے۔ عذر شرعی کے بغیر مسلسل دو یا تین اجتماعات سے غیر حاضر رہنا کسی رکن کو جماعت سے خارج کر دینے کے

یہ معقول سبب سمجھا جاتا ہے۔ اجتماع عام میں، جس میں عوام کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، پہلے درس قرآن ہوتا ہے اور اس کے بعد درس حدیث۔ پھر جماعت کے لٹریچر میں سے کوئی چیز پڑھی جاتی ہے۔ بعد ازاں قومی اور بین الاقوامی مسائل پر تبصرہ ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں عام دلچسپی کے معاملات پر گفتگو ہوتی ہے۔

اجتماعات کے دوران میں جماعت کی پالیسیوں، پروگرام اور اس کے ارکان کے ذاتی اور پبلک طرز عمل پر آزادانہ بحث مباحثے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ کوئی شخص چاہے کتنا ہی بلند مرتبت کیوں نہ ہو جتنی کہ امیر جماعت بھی احتساب اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا جاتا۔ جس شخص پر تنقید کی جاتی ہے اُس کا فرض ہے کہ یا تو حاضرین کو اپنے طرز عمل کے بارے میں مطمئن کرے یا معافی مانگے۔ درحقیقت اجتماع ارکان کا بڑا مقصد ان کو اس بات کا کھلا موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں تہذیب و نشاۃ کی حدود میں رہتے ہوئے بے روک ٹوک کہہ دیں۔ امیر جماعت — مولانا مودودی — خود ہمیشہ اپنے آپ کو احتساب و تنقید کے لیے پیش کرتے رہے ہیں۔ گھلے بحث مباحثے اور بے روک ٹوک تنقید کی اس پالیسی کی بدولت جماعت میں دولت یا دوسرے عناصر کی بنیاد پر کوئی مراعات یافتہ طبقہ ابھرنے نہیں پایا تاہم بحث مباحثے کے بعد جب کوئی فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو تمام ارکان جماعت پر اس فیصلے کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ اس طریقے سے جماعت کی صفوں میں افتراق و انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

جماعت اسلامی اپنے ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر خاص طور پر زور دیتی ہے۔ جماعت کا مرکز تربیتی نصاب تجویز کرتا ہے اور ملک بھر میں حلقہ دار اور مقامی طور پر تربیتی کمیٹی منعقد ہوتے ہیں۔ اس تربیتی نصاب میں قرآن و حدیث کے مطالعہ اور انہیں جدید دور کی ضروریات پر منطبق کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ تنظیم اور انتظامیہ کے اصولوں کی تشریح بھی کی جاتی ہے۔ گاہے گاہے مختلف ارکان کے گھروں میں شب بیداری کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جہاں قرآن و حدیث کا درس ہوتا ہے۔



امیر جماعت اسلامی پاکستان کا انتخاب ہر پانچ سال کے بعد پوری باتفاقگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انتخاب آزادانہ ہوتا ہے اور مجرد اکثریت سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی ایک حنا نس جمہوری تنظیم ہے۔ اس کی شہادت اُن انتخابی قوانین سے ملتی ہے جو دسمبر ۱۹۶۵ء میں اختیار کیے گئے۔ ناظم انتخاب کا تقرر تاریخ انتخاب سے کم از کم تین ماہ پہلے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اگر ضروری سمجھے تو اپنے معاون مقرر کرنے کے اختیارات بھی رکھتا ہے۔ مرکز جماعت، ناظم انتخاب کو ارکان جماعت کی فہرست تاریخ انتخاب سے ساٹھ دن پہلے مہیا کر دیتا ہے۔ وہ تمام ارکان جن کے نام تاریخ انتخاب سے نو سے دن پہلے رجسٹر میں درج ہوتے ہیں پر چہ راستے دہندگی حاصل کرنے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ جو لوگ اس تاریخ کے بعد جماعت کے رکن بنتے ہیں انہیں انتخاب میں ووٹ دینے کا حق نہیں ہوتا۔ ارکان کا سلسلہ وار نمبر ہی ان کا انتخابی نمبر ہوتا ہے۔ راستے دہندگان کا نام، نمبر اور پتہ پر چہ راستے دہندگی پر درج نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تمام تفصیلات اس کی نقل کے نمبر شمار کے ساتھ لکھ دی جاتی ہیں۔ لفافے پر راستے دہندہ کا صرف نمبر شمار ہی درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظم انتخاب پر چہ راستے دہندگی وصول کرنے کے بعد لفافے کا نمبر دیکھ کر فہرست میں وصولی کا نشان لگا دے۔ لفافے راستے شماری کے وقت کھولے جاتے ہیں اور راستے دہندگی کی پرچیاں چھانٹ کر الگ کر دی جاتی ہیں۔ پھر ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان کا انتخاب براہ راست ناظم انتخاب کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ انتخابی عذر داریاں نتیجہ انتخاب کے اعلان کے بعد تیس دن کے اندر اندر دائر کی جاسکتی ہیں۔ مرکزی مجلس شوریٰ کے انتخاب کے لیے انتخابی ٹریبونل کا تقرر امیر جماعت کرتے ہیں، لیکن امیر جماعت کے انتخاب کے لیے انتخابی ٹریبونل کا تقرر مرکزی مجلس شوریٰ، ناظم انتخاب کے تقرر کے ساتھ ہی کر دیتی ہے۔

جماعت اسلامی کے انتخابات میں چاہے وہ کسی سطح سے بھی تعلق رکھتے ہوں، کوئی امیدوار نہیں ہوتا۔ یہاں تو درحقیقت کسی شخص کی طرف سے اقتدار کی خواہش کا ذرا سا اظہار بھی اُس کو مکمل

سے حوالہ سابق دفعہ ۱۔



طور پر نا اہل قرار دے دیتا ہے۔

امیر کے فرائض حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھنا۔

۲۔ اپنے ذاتی راحت و آرام پر جماعت کے مفاد اور اس کی ذمہ داریوں کو ترجیح دینا۔

۳۔ ارکان جماعت کے درمیان عدل و دیانت سے حکم کرنا۔

۴۔ جماعت نے اُسے جو امانتیں سپرد کی ہیں اُن کی پوری پوری حفاظت اور نگہداشت

کرنا۔

۵۔ خود دستور کا پابند رہنا اور نظم جماعت کو اس کے مطابق چلانے کی پوری کوشش

کرنا۔

امیر جماعت مجلس شوریٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر جماعت کی اہلک پر جماعت کے مفاد میں تصرف کرنے، نئے ارکان کو جماعت میں داخل کرنے، جو رکن نظم جماعت کی پابندی نہ کرے اسے خارج کر دینے، جماعت کا اجتماع عام بلانے اور جماعت کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

نظم جماعت کو چلانے کی ساری ذمہ داری اگرچہ امیر جماعت کی ہے، تاہم اپنے اقدامات کے سلسلے میں کسی غلطی یا نقص صریح کی خلاف ورزی پر وہ مجلس شوریٰ کے آگے جوابدہ ہے، بلکہ اس ضمن میں کوئی بھی رکن وضاحت طلب کر سکتا ہے۔ جماعت کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ نظریات مد نظر رہتے ہیں اور امیر جماعت کی شخصیت کی مدح و توصیف کرنے اور اُس کو بڑھانے چکانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

۱۔ حوالہ سابق دفعہ ۱۷۔

۲۔ حوالہ سابق دفعہ ۲۰۔

امیر جماعت کی امداد اور مشورے کے لیے ایک منتخب مجلس شوریٰ ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل اختیارات رکھتی ہے:-

۱۔ جماعت کی پالیسی کی تشکیل۔

۲۔ امیر جماعت کی معزولی بشرطیکہ مجلس شوریٰ کے دو تہائی ارکان اس کا مطالبہ کریں۔

۳۔ مالی اور میزانیہ سے متعلق امور کا جائزہ۔

مرکزی ارکان شوریٰ کے چند فرائض حسب ذیل ہیں:-

۱۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔

۲۔ امیر، جماعت اور خود اپنے آپ پر ہمیشہ نگاہ رکھیں کہ وہ جماعت کے عقیدہ پر

قائم، اس کے نصب العین سے وابستہ اور صحیح اسلامی طریق کار کے پابند ہیں۔

۳۔ مجلس کے اجلاسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوں۔

۴۔ ہر معاملے میں اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق اپنی حقیقی رائے کا صاف

صاف اظہار کریں۔

۵۔ جماعت کے اندر مستقل پارٹیاں اور بلاک بنانے سے محترز رہیں اور اگر مجلس

شوریٰ یا جماعت میں کوئی شخص اس کی کوشش کرتا نظر آئے تو اس کی ہمت افزائی کرنے یا اس سے تغافل برتنے کے بجائے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں۔

جماعت اسلامی کی شاخیں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تقریباً ہر اہم شہر اور قصبے میں

قائم ہیں۔ ہر مقامی شاخ کا اپنا منتخب امیر اور مجلس شوریٰ ہوتی ہے جو براہ راست مرکز جماعت (اچھرہ۔ لاہور) کے اگے جوابدہ ہوتے ہیں۔

جماعت اسلامی اپنے بیت المال کی آمدنی حسب ذیل ذرائع سے حاصل کرتی ہے۔

۱۱۔ جماعت کی مطبوعات سے منافع۔

۱۲۔ ارکانِ جماعت سے عشر و زکوٰۃ۔

۱۳۔ جماعت کے متفقین کے عطیات۔

۱۴۔ قربانی کی کھانوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم جو صرف غریبوں اور حاجت مندوں پر صرف کی جاتی ہیں۔

جماعت اسلامی کا ایک بہت بڑا اثاثہ اُس کا وسیع اور جامع لٹریچر ہے۔ جماعت کی کتابوں اور لمفلٹوں کی مقبولیت عام کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض کتابوں کے اب تک ۱۱ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اکثر کتابیں پانچ سے بھی زائد بار شائع ہو چکی ہیں۔ ملک بھر میں بے شمار دارالمطالعے قائم ہیں جہاں سے ہر شخص باسانی جماعت کا لٹریچر حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ جماعت کے اکثر کارکن رضا کارانہ طور پر گھر گھر عوام کے ہر طبقے میں جماعت کا لٹریچر پھیلاتے ہیں اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ ہر ہفتے اپنے مقامی امیر یا ناظم حلقہ کو دیتے ہیں۔ خواتین کے لیے الگ بھی خاص طور پر لٹریچر تیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک پچاس سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ خواتین کا ماہوار رسالہ ”بتول“ بھی اس میں شامل ہے۔

جماعت تعلیم کے میدان میں بھی بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں خلافتِ قانون قرار دیے جانے سے پہلے جماعت ۳۳ تعلیمی ادارے چلا رہی تھی جن میں اسلامی اور جدید طرز کی تعلیم دی جاتی تھی اور قرآن و حدیث، فقہ، اسلامی، عربی زبان و ادب، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور جغرافیہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا۔ جماعت ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کے میدان میں بھی خاصی سرگرم عمل رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ دو درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے۔

جماعت کا ایک خاص شعبہ، شعبہ محنت کاراں ہے۔ مزدوروں میں اسلامی تعلیمات کا فروغ۔ اُن کی مادی و روحانی بہبود کو بہتر بنانے کے لیے قانون سازی کی تائید و حمایت اور اُن کی صفوں میں کمیونسٹوں اور دوسرے تخریب پسند عناصر کے نفوذ کی روک تھام اس شعبہ کا مقصد ہے۔ کمیونسٹ مزدوروں کو طبقاتی کش مکش پر ابھارنے کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں جماعت اسلامی اُن کی شدید مخالفت ہے کیونکہ اسلام اقتصادی بنیادوں پر معاشرتی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔

جماعت خدمت خلق کے کاموں میں ہمیشہ آگے رہی ہے۔ خصوصاً جب کبھی قوم پر کوئی بُرا وقت آتا ہے وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود میدان میں آجاتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل عام سے بچنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں پاکستان پہنچے اور جگہ جگہ مہاجر کیمرپ قائم ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے ان مہاجر کیمرپوں خصوصاً لاہور کے کیمرپ میں کئی مہینے مہاجرین کی بے لوث خدمت کی۔ ان کیمرپوں میں بھوک، قحط اور ربائی امراض کا فہرہ دورہ تھا۔ جماعت کے کارکن لاوارث لاشوں کو دفن کرتے اور ضرورت مندوں کو خوراک، کپڑا اور دوائیاں تقسیم کرتے رہے۔ مشرقی پاکستان میں حالی ہی میں زلزلوں، سیلابوں اور طوفانوں سے ہولناک تباہی آئی۔ جماعت اسلامی نے اس تباہی سے متاثر ہونے والے لوگوں میں وسیع پیمانے پر امدادی کام کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے جنگ کے دوران میں ہزاروں کشمیری مہاجرین ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہو کر پاکستان پہنچے۔ جماعت کے کارکنوں نے ان لوگوں کے مصائب کو کم کرنے اور انہیں ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لیے دن رات کام کیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے عرب ممالک پر جارحانہ حملہ کیا اور اسرائیلیوں نے عربوں کو غزہ، سینائی اور مغربی اردن سے نکال دیا تو جماعت نے عرب مہاجرین کے لیے نہ صرف خوراک اور کپڑے جمع کیے بلکہ ایک طبی مشن بھیجنے کی پیشکش بھی کی۔



خارجہ پالیسی کے میدان میں جماعت، تمام مسلمان ممالک کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی مطابقت  
 گہرے برادرانہ روابط قائم کرنے کی حامی ہے۔ وہ مسلمان قوموں کے اتحاد و استحکام کی ضرورت پر  
 بہت زیادہ زور دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت، بلا لحاظ نسل و نظریہ تمام ملکوں کیساتھ  
 دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ پاکستان کی آزادی پوری  
 طرح محفوظ رہے اور وہ اقتصادی یا فوجی اعتبار سے کسی بڑی طاقت کا دست نگر بننے سے  
 بہرہ نیت احتراز کرے۔ جہاں تک سوشلسٹ بلاک کے کمیونسٹ اور مغرب کے جمہوری ملکوں  
 کے درمیان زوال پذیر آویزش کا تعلق ہے جماعت کی نظر میں یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ وہ  
 امریکہ اور سوویت یونین دونوں کو عربوں کے خلاف صہیونی جارحیت کی حوصلہ افزائی اور نصرت  
 حمایت کا مجرم گردانتی ہے۔ پچھلے چند سالوں سے جماعت اسلامی نے اپنی کوششیں اہل پاکستان  
 کو صہیونیت اور ہندوستان کی سامراجیت کے روز افزوں خطرے سے ہوشیار کرنے اور اس  
 کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے پر مرکوز کر دی ہیں۔ جماعت اسلامی کے ایک رکن مصباح الاسلام فاروقی  
 صاحب نے مارچ ۱۹۶۹ء میں ماسونیت Free Masonry پر ایک انکشاف انگیز کتاب  
 ”فری میسنری ایک تنقیدی مطالعہ“ Free Masonry: A Critical Study لکھی  
 جس میں انہوں نے اس خفیہ سوسائٹی کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور صلیبیوں کے زمانے سے اب  
 تک مختلف مسلمان ملکوں پر مرتب ہونے والے تخریبی اثرات کو بے نقاب کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ  
 کسی مسلمان کا ماسونی بننا غداری اور کفر و ارتداد کے مترادف ہے۔ اس کتاب نے پاکستان کے  
 ماسونی مراکز Free Mason lodges میں تہلکہ مچا دیا۔ مئی ۱۹۶۹ء کے آغاز میں لائل پور اور ملتان  
 کے ماسونی مراکز سے تعلق رکھنے والے پچاس سے زائد ممتاز پاکستانی مسلمان مستعفی ہو گئے۔ انہوں  
 نے بتایا کہ ماسونی تحریک فطرتاً صہیونی اور عملاً اسلام دشمن ہے اور مطالبہ کیا کہ ان خفیہ سوسائٹیوں  
 کو خلافت قانون قرار دیا جائے کیونکہ یہ ملک کے مفاد کے لیے تباہ کن ہیں۔

جماعت اسلامی نے کمیونزم اور سوشلزم کے خلاف بھی ایک زبردست مہم چلا رکھی

ہے۔ اس نے ۱۹۶۹ء کے ابتدائی مہینوں میں بھاری تعداد میں اردو پمفلٹ شائع کیے جن میں اسلامی نقطہ نظر سے مارکسٹ نظریہ پر تنقید کی۔ مارکسزم کے برعکس اسلامی تعلیمات اس مغالطہ آمیز فریب کو مسترد کرتی ہیں کہ معاشی مسئلہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا لازمی جز ہے۔ قرآن کریم اس اصول پر بار بار زور دیتا ہے کہ دنیاوی مفادات نجات اخروی کے تابع ہونے چاہئیں تاہم چونکہ کمیونزم اور سوشلزم پر ایمان رکھنے والے لوگ اسکولوں، ٹریڈ یونینوں اور نشر و اشاعت کے عوامی اداروں میں خطرناک حد تک نفوذ کر چکے ہیں اس لیے جماعت نے قرآن و سنت کی بنیاد پر نام نہاد ”معاشی مسئلے“ کا مثبت اور تعمیری حل پیش کرنا نہایت ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۶۹ء میں جب پاکستان میں ہنگامے اور بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی جماعت اسلامی نے معاشی مسئلے کے متعلق اپنا منشور شائع کر دیا۔ پورا متن درج ذیل ہے:

”ہمارے ملک میں اس وقت جو معاشی نظام پایا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے ازسرنو پایا ظلم بن گیا ہے کہ اس میں سابق جاگیر داری نظام اور جدید سرمایہ داری نظام کی تمام برائیاں جمع ہو گئی ہیں اودان پر ایک مطلق العنان اور خود غرض بیوروکریسی کی برائیوں کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مجلس عاملہ جماعت اسلامی پاکستان مسلسل کئی روز تک اس صورت کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جب تک اس پورے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں یہاں عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا، مگر وہ تبدیلیاں لازماً ایسی ہونی چاہئیں جن کے ساتھ افراد کے بنیادی حقوق اور معاشرے کی شہری آزادیاں بھی برقرار رہیں ورنہ ایک ظلم کی جگہ دوسرا عظیم تر ظلم قائم ہو جائے گا اور یہاں کوئی جہوریت نہ چل سکے گی۔ لہذا اس مجلس کی رائے میں یہ مطلوبہ تبدیلیاں جن اصولوں پر مبنی ہونی چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں:-

- ۱۔ سود، سٹم، جوآ اور دوسرے ان تمام طریقوں کو جنہیں اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے، قانوناً ممنوع کر دیا جائے اور صرف کسبِ حلال کے دروازے لوگوں کے لیے کھلے رکھے جائیں۔ نیز حرام طریقوں سے دولت صرف کرنے کے دروازے بھی بند کر دیے جائیں۔

صرف اسی طرح نظام سرمایہ داری کی جرٹکٹ سکتی ہے اور وہ آزاد معیشت بھی باقی رہ سکتی ہے جو جمہوریت کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ اب تک ناجائز اور حرام طریقوں اور ایک فاسد نظام کی غلط بخششوں سے دولت کا جو انتہائی ظالمانہ ارتکاز ہو چکا ہے اس کا استیصال کرنے کے لیے اسلامی اصولوں کی مطابقت ان تمام لوگوں کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا جائے جن کے پاس دولت کا غیر معمولی اجتماع پایا جاتا ہے اور وہ سب کچھ ان سے واپس لے لیا جائے جو حرام طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے۔

۳۔ ایک مدت تک زرعی املاک کے معاملے میں غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لیے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اصلاح اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ اس قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے:

الف۔ ان تمام نئی اور پرانی جاگیر داریوں کو قطعی ختم کر دیا جائے جو کسی دور حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال سے وجود میں آئی ہوں کیونکہ ان کی ملکیت بھی شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔

ب۔۔۔ قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد (مثلاً سو یا دو سو ایکڑ) تک محدود کر دیا جائے اور اس سے زائد ملکیت کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے۔ یہ تحدید صرف عارضی طور پر پھیلی ناہمواریاں دور کرنے کے لیے کی جاسکتی ہے۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ مستقل تحدید صرف اسلامی قانون وراثت ہی سے نہیں بلکہ متعدد دوسرے شرعی قوانین سے بھی متصادم ہوتی ہے۔

ج۔۔۔ تمام زمینیں خواہ وہ سرکاری املاک ہیں سے ہوں یا مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے حاصل ہوتی ہوں یا نئے پیراجوں کے ذریعے سے کاشت



کے قابل ہو گئی ہوں۔ ان کے بارے میں یہ قاعدہ طے کر دیا جائے کہ وہ غیر مالک کاشت کاروں، یا اقتصادی حد سے کم زمین کے مالکوں کے ہاتھ آسان اقساط پر فروخت کی جائیں گی اور اس معاملے میں قریبی علاقوں کے لوگوں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔ سرکاری لوگوں یا انیسروں کو سستے داموں دینے یا عطیے کے طور پر دے دینے کا طریقہ بند کر دیا جائے اور جن کو اس طرح زمینیں دے دی گئی ہیں انہیں واپس لے لیا جائے۔ نیز نیلام کے ذریعے سے فروخت کرنے کا طریقہ بھی ترک کر دیا جائے۔

۵:- وزارت کے متعلق اسلامی قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے اور تمام غیر اسلامی طریقوں کو از روئے قانون روک دیا جائے تاکہ کوئی زمین داری ظلم کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

۱۴:- معاوضوں کے درمیان موجود تفاوت کو جو ایک اور سو سے بھی زیادہ ہے گھٹا کر فی الحال ایک اور بیس کی نسبت پر اور بتدریج ایک اور دس کی نسبت پر لے آیا جائے۔ نیز یہ طے کر دیا جائے کہ کوئی معاوضہ اس حد سے کم نہ ہو جو موجودہ زمانے کی قیمتوں کے لحاظ سے ایک کپنے کی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ حد بحالت موجودہ ڈیڑھ سو اور دو سو کے درمیان ہونی چاہیے اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کم سے کم حد معاوضہ پر ڈٹا نرتنا نظر ثانی کی جاتی رہنی چاہیے۔

۵:- کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان، علاج اور بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مناسب سہولتیں دی جائیں۔

۶:- تمام صنعتوں میں مزدوروں کو مذکورہ بالا کم سے کم حد معاوضہ کے علاوہ نقد بزنس بھی دیا جائے اور بزنس ٹیسرز کے ذریعے سے انہیں صنعتوں کی ملکیت میں حصہ دار بنایا جائے تاکہ جس صنعت سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کی ترقی سے ان کی ذاتی دلچسپی وابستہ ہو جائے اور



جن دولت کے پیدا کرنے میں ان کی محنت شامل ہے اس کے منافع میں وہ حصہ دار ہوں۔

۷۔ موجودہ لیبر قوانین کو بدل کر ایسے منصفانہ قوانین بناتے جہاں جو سرمایہ اور محنت کی کش مکش کو حقیقی تعاون میں تبدیل کر دیں۔ محنت پسند گروہ کو اس کے جائز حقوق دلوں اور نزاعات کی صورت میں تصفیے کا ایسا طریقہ مقرر کر دیں جو ٹھیک ٹھیک انصاف قائم کر سکتا ہو۔

۸۔ ملکی قوانین اور انتظامی پالیسیوں میں اس طرح ترمیم و اصلاح کی جائے کہ صنعت و تجارت پر سے چند لوگوں کا تسلط ختم ہو اور معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد ان کی ملکیت اور منافع میں حصہ دار بن سکیں۔ نیز قوانین اور پالیسیوں کی ان تمام غامیوں کو بھی دور کیا جائے جن کی بدولت ناجائز نفع اندوزیاں کی جاتی ہیں۔ مصنوعی گرانی پیدا کر کے خلق خدا کے لیے زندگی بسر کرنا دشوار کر دیا جاتا ہے اور ملک کی معاشی ترقی کا فائدہ عوام تک نہیں پہنچنے دیا جاتا۔

۹۔ جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی ہاتھوں میں چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے ان کو قومی انتظام میں چلایا جائے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا ضروری ہے ایک ایسی نمائندہ اسمبلی کا کام ہے جو عوام کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوتی ہو اور اس کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ اطمینان کر لینا بھی ضروری ہے کہ ان صنعتوں کا انتظام بیوروکریسی کی ان معروف خرابیوں کا شکار نہ ہونے پائے جن کی بدولت صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا فائدے کے بجائے الٹا نقصان کا موجب بن جاتا ہے۔

۱۰۔ بینکنگ اور انشورنس کے اس پورے نظام کو جو دراصل یہودی سرمایہ داروں کے

دماغ کا افریدہ ہے اور جس کی تقلید ہمارے ملک میں بھی کی جا رہی ہے یکسر بدل کر اسلامی اصول شریعت و مناربت اور تعاون باہمی کے مطابق از سر نو تعمیر کیا جائے۔ اس بنیادی اصلاح کے بغیر ان دونوں چیزوں کے مفاسد کسی طرح دور نہیں کیے جاسکتے۔ خواہ انہیں قومی ملکیت ہی میں لے لیا جائے۔

۱۱۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے کفالت عامہ کی اس اسلامی اسکیم کو عمل میں لایا

جائے جس سے بہتر سوشل سیکوریٹی کی کوئی اسکیم آج تک کوئی نظام وضع نہیں کر سکی ہے۔ یہی ایک یقینی ذریعہ ہے جس سے ملک میں کوئی فرد غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہیں رہ سکتا۔

۱۲۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان عدم مساوات disparity دور

کرنے کے لیے تحریک جمہوریت کے اٹھ نکاتی پروگرام میں سے ان چھ نکات پر عمل کیا جائے جو اس مسئلے سے متعلق تحریک جمہوریت نے بالاتفاق طے کیے تھے۔

ان اصولوں پر معاشی اصلاحات کا ایک مفصل پروگرام مرتب کرنے کے لیے جماعت اسلامی کی ایک مخصوص کمیٹی کام کر رہی ہے جو عنقریب اپنی تجاویز پیش کر دے گی، لیکن مجلس عظمیٰ یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ صرف معیشت ہی انسانی زندگی کا اصلی یا واحد مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ جب تک اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق اخلاق، معاشرت، تعلیم، سیاست، قانون اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر اصلاحات نہ ہوں محض معاشی اصلاح کا کوئی پروگرام بھی کامیاب اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ جماعت اسلامی اپنے منشور میں ان ہمہ گیر اصلاحات کا ایک تفصیلی نقشہ پیش کرے گی جو انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔“

جماعت اسلامی مندرجہ ذیل مقاصد کی علمبردار ہے:-

۱۔ قرآن و سنت پر مبنی اسلامی نظام حیات کا نفاذ۔

۲۔ معاشی، اقتصادی اور تعلیمی شعبوں میں تمام لوگوں کو مساوی مواقع کی فراہمی۔

۳۔ تمام شہریوں کے لیے معقول معیار زندگی اور غذا، لباس، مکان اور طبی امداد

کا اہتمام۔

۴۔ تقریر و تحریک، انجمن سازی، اخبارات، ایمر و مومنین اور دیگر تنظیموں کے قیام

کی آزادی۔

۱۵۔ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ اور قانونی عدالت میں مقدمہ چلانے بغیر قید و بند سے محفوظ رہنے کی ضمانت۔

۱۶۔ حکومت کے محکموں اور سپیک اداروں سے بدعنوانیوں کا انسداد اور سول سروس اور پولیس کی تنظیم نو تاکہ وہ عوام کی بہترین انداز میں خدمت کر سکیں۔

۱۷۔ عوام کے مفاد کی خاطر دولت کے حصول اور مصروف پر بعض پابندیوں کے ساتھ نجی ملکیت اور صنعتیں قائم کرنے کے حق کی ضمانت۔

۱۸۔ غیر سودی بنیادوں پر سٹیٹ انشورنس اور منکاری کا قیام، کلیدی صنعتوں اور قومی اہمیت کے منصوبوں کو قومیانا۔

۱۹۔ تعمیر و ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں نجی زرعی اراضی کی ملکیت کی تحدید۔ نہری اراضی زیادہ سے زیادہ دو سو ایکڑ اور بارانی زمین زیادہ سے زیادہ چار سو ایکڑ۔

۲۰۔ سرکاری زمینوں اور جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے حاصل کردہ اراضی کو غیر مالک کاشت کاروں میں ۱۲ ایکڑ تک بلا قیمت اور چھوٹے زمینداروں میں مناسب قیمت پر تقسیم۔

۲۱۔ بے روزگاروں کو روزگار کی فراہمی۔ مجر و ادھی کو کم سے کم ایک سو روپے ماہوار اور عیال دار کو دو سو روپے ماہوار تنخواہ۔

۲۲۔ زرعی اور صنعتی مزدوروں کو منافع میں حصہ دینے اور مزدوروں کی شرائط کار کی اصلاح کا اہتمام۔

۲۳۔ ۵۰۰ روپے ماہانہ سے کم آمدنی والے افراد کو شدید ہنگامی ضروریات پوری کرنے کے لیے بلا سود قرض کی ادائیگی۔

۲۴۔ میٹرک تک مفت تعلیم اور اسلامی اساس پر مبنی ایسی پالیسیوں کا اہتمام جن سے ایماندار، خدا ترس اور ملک و ملت کے لیے مفید نسل تیار ہو سکے۔

۱۱۵۔ بالغ راستے دہی کی بنیادوں پر براہ راست انتخابات، قانون ساز اسمبلی میں عوام کی مکمل نمائندگی اور اسمبلی کو میزانیہ کی منظوری اور قانون سازی کا اختیار کامل دینے کا اہتمام۔  
۱۱۶۔ ملکی قانون کی نظر میں تمام شہریوں کی برابری اور بے لاگ اور بلا تاخیر انصاف کی ضمانت۔

۱۱۷۔ انتظامیہ سے عدلیہ کی آزادی۔

۱۱۸۔ حکومت کی مالی پالیسیوں کے واضح اور صحیح رخ کا تعین، تاکہ مفاد پرست طبقے کی من مانیوں اور بھاڑوں سے نکلنے والی کارخانے داروں کی انجمنوں کی روک تھام اور اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں تخفیف کر کے غریب عوام کی مشکلات کا ازالہ ہو سکے۔  
۱۱۹۔ دیہات اور شہروں میں گھریلو صنعتوں اور صنعت گھروں کا وسیع پیمانے پر قیام۔

۱۲۰۔ دیہات کی تہذیبی اور اقتصادی ترقی کا بندوبست۔  
۱۲۱۔ ملک کے تحفظ کی خاطر تمام صحت مند شہریوں کو فوجی اور شہری دفاع کی تربیت۔  
۱۲۲۔ دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات خواہ وہ کسی نظریے کے علمبردار ہوں نیز مسلم اکثریت والے ممالک کے ساتھ اسلام کی بنیاد پر برادرانہ روابط۔  
۱۲۳۔ اسلامی اقدار پر مبنی پاکستانی معاشرے کی تعمیر نو کے سلسلے میں راستے عامہ کو حکومت کی تائید و حمایت کے لیے تیار کرنا۔

۱۲۴۔ قومی کردار کو مضبوط بنانا، لوگوں کے اخلاقی اور تعلیمی معیار کو بلند کرنا اور اس ضمن میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو کام میں لانا۔

ایک بار میں نے مولانا مودودی سے دریافت کیا: جماعت اسلامی خالص اسلامی نظام کی علمبردار ہے پھر وہ تحریک جمہوریت میں دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کے لیے اس قدر بے تاب کیوں ہے؟ حالانکہ یہ جماعتیں اس کے پروگرام کی متعدد اہم



باتوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: اس وقت اہم ترین اور اشد ضروری کام یہ ہے کہ آمریت کو ختم کر کے حقیقی جمہوریت بحال کی جائے۔ اسلام اور مغربی جمہوریت کے درمیان تضادم کا باعث صرف ایک امر ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے نقطہ نظر سے حاکمیت کی سزاوار اور اللہ تعالیٰ کی ذات بے ہمتا ہے، جب کہ لادینی جمہوریت کے نزدیک کسی ملک کی حاکمیت کے مالک اس کے عوام ہوتے ہیں۔ ایسے جمہوری ملک کی نمائندہ مقننہ اپنے لیے اکثریت کی مرضی کے سوا اور کوئی پابندی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے برعکس جس ریاست میں اسلامی قانون حکمران ہوتا ہے اُس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ شریعت الہی کو نافذ کرے۔ اس شریعت کو نہ تو کوئی اکثریت منسوخ کر سکتی ہے نہ قرآن و سنت کے احکامات میں کسی قسم کی کوئی مریخ تبدیلی کی جاسکتی ہے؛ تاہم مولانا نے فرمایا: کلیت پسندانہ آمریت کے مقابلے میں لادینی جمہوریت قابل ترجیح ہے۔ کلیت پسندانہ آمریت خصوصاً سوشلزم کے سائے میں محبت اسلام عناصر کو نہایت بے رحمی سے کچلا اور تغذیہ و اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسلامی تحریک کے کام کرنے کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جمہوری طرز حکومت میں پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل کرنے کے مواقع میسر رہتے ہیں۔ جماعت سازی، اظہار رائے اور پریس میں تنقید کی آزادی برقرار رہتی ہے۔ ایسی حکومت میں جماعت اسلامی عوام کی تعلیم و تربیت کا کام بے روک ٹوک جاری رکھ سکتی ہے۔

جماعت اسلامی کی نظر صرف پاکستان تک محدود نہیں ہے۔ وہ بالآخر پوری دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم و تہا رکھتی ہے۔

جماعت اسلامی، اسلامی نظریات اور اسلامی طرز حیات کی دعوت و تبلیغ میں پوری سرگرمی سے مصروف اور اُن تمام برائیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف نبرد آزما ہے جن کی وجہ سے لادینیت اور مادہ پرستی کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت، اور اُن میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی بڑی تعداد بھی شامل ہے،

اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کی خواہش مند اور عصرِ جدید کی ان تمام اقدار کو مسترد کرتی ہے جو دینِ برحق کے منافی اور معاند ہیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اسلامی تعلیمات سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ اگرچہ انہیں جدید زندگی کے مکروہ طوراً نوار سے نفرت ہے، لیکن وہ غیر منظم ہیں۔ انہیں رائے دینے کا حق بھی حاصل نہیں۔ ان کی کوئی متحدہ طاقت نہیں۔ اس کے مقابلے میں مغربیت اور لادینیت کی حامی طاقتیں پوری طرح منظم اور مضبوط رشتہ اتحاد میں مربوط ہیں۔ وہ مسلمان ممالک کے دروہست، پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نظامِ تعلیم پر چھاتی ہوئی ہیں اور خوب سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق مغربیت کو مسلمانوں پر مسلط کر رہی ہیں۔ بنا بریں ہر ملک اور ہر جگہ کے محبتِ اسلام عناصر کے لیے لازمی ہے کہ وہ منظم ہوں اور بنیانِ موصوف بن کر مدی کی ان طاقتوں سے لڑیں۔ اسلامی نظام کی جدوجہد کرنے والے ایک مرتبہ بڑے پہلے پر منظم اور متحد ہو گئے تو مادہ پرستانہ نظریات کے حامی عناصر کے لیے ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہو جائے گا اس لیے کہ موخر الذکر عناصر اپنی مصلحتوں، مفادات اور ہوا و اغراض سے تحریک حاصل کرتے ہیں، جبکہ اول الذکر لوگ اس لڑائی میں فتح یا ہار ہونے کے لیے اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کے متمنی ہوتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی پاکستان کے بدترین دشمن بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ موجودہ دور کی سب سے بڑی، سب سے طاقتور، سب سے زیادہ متحرک اور سب سے منظم اسلامی تحریک ہے۔ اس کی انتہائی نہیم دہوش مند، باخبر، مخلص، بے لوث اور دیانت دار قیادت، اس کے ہمد تن سرگرم اور پرجوش ارکان، اس کے ہزاروں ہمدرد جن میں سے بہت سے پاکستان میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں، سارے عالمِ اسلام میں اس کے بھی خواہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، اس کا اعلیٰ پایہ کا وسیع لٹریچر جو بیس سے زائد زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے، یہ سارے امور اس بات کی بہترین ضمانت ہیں کہ یہ تحریک مستقبل میں فتح یا ہار ہو کر رہے گی۔

جماعتِ اسلامی کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے: "مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت کریں۔ منافقت، دوزنگی اور ان تمام باتوں کو ترک کر دیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔  
 اللہ کے باغیوں اور اسلامی نظام حیات کے منکروں کو رہنمائی کے منصب سے الگ کر دیں اور  
 سچے مسلمان بن جائیں۔ جو لوگ ہماری اس دعوت کو حق سمجھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔  
 اور جو ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ کے آگے جوابدہی کے لیے تیار ہو  
 جائیں ۹

حاصل بحث



۲۷۸

# اسلام اور دُنیاۓ مغرب میں تبلیغی جدوجہد

یورپ اور امریکہ نظر باقی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں اخلاقی خلاء پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ بہت سے نیک نیت مسلمانوں کو یقین ہے کہ یہ خلاء بالآخر دُنیاۓ مغرب کو اسلام کی خوش شفقّت میں پہنچا دے گا۔ ان لوگوں کی رائے ہے کہ چونکہ اسلام کا مستقبل امریکہ اور یورپ میں پنہاں ہے اس لیے ہمیں اپنی ساری تبلیغی اور دعوتی مساعی انہی ممالک میں مرکوز کر دینی چاہئیں۔ زیر نظر باب کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ رجائیت اور خوش خیالی کس قدر بے حاصل ہے۔

بے شک مغرب کے بعض خال خال اور غیر معمولی افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں، لیکن ان کا دین دایان محض ایک ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا ہے جس کا مغربی معاشرے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اسلام عیسائیت سے بالکل الگ اور ممتاز دین ہے۔ وہ نہ تو عیسائیت کی طرح محض خدا اور بندے

---

مے یورپی اور امریکی نو مسلموں کے مسلمان ہونے کی داستان معلوم کرنے کے لیے کتاب

Islam Our Choice پڑھتے جو دوکنگ مسلم مشن اور لٹریچر ٹرسٹ دوکنگ لندن نے

شائع کی ہے۔

کے باہمی تعلق کا نام ہے اور نہ محض آخرت میں انفرادی نجات کا تصور۔ اس کے برعکس وہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی پبلک زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ وہ انفرادی معاملہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور اجتماعی معاملہ بھی ہے۔ اسی طرح وہ مطالبہ کرتا ہے کہ معاشرے کے تمام شعبوں کو ایک معین اور مخصوص تہذیبی سانچے میں ڈھالا جائے۔

ہم مسلمانوں کو اس سنگین حقیقت سے پہنچتی نہیں کرنی چاہیے کہ اسلام کے خلاف مغرب کا عناد محض تاریخی اسباب پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان سے کہیں زیادہ اس عناد کی اساس وہ بنیادی تناقض ہے جو دونوں تہذیبوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسی تناقض کا یہ نتیجہ ہے کہ جدید مغربی ذہن کو اکثر حقیقی اسلامی قدیں نہ صرف انتہائی غیر دلکش بلکہ مرثیہ المل بے جڑ نظر آتی ہیں۔ اسلام کا پوری زندگی پر حاوی ہونا اور کسی دوسرے نظام کو اپنا شریک و ہم تسلیم نہ کرنا۔ مذہب، قانون اور حکومت کا اتحاد و امتزاج، جہاد کا تصور، پردہ، تعدد و ازدواج کی کھلی قانونی اجازت، اکثر فنون لطیفہ اور تفریحات کی ممانعت یا حوصلہ شکنی اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔ ذیل کا اقتباس ایک نو مسلم مغربی خاتون کے مکتوب سے لیا گیا ہے جو انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ یہ خاتون اپنے شوہر کے ساتھ صدقِ دل سے مسلمان ہوتی تھیں۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی طرزِ زندگی کو چھوڑ کر اسلامی طرزِ حیات کو اپنانے میں ان میاں بیوی کو کیسی نفسیاتی محرومی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ لکھتی ہیں:

”آپ کی خوش نصیب شخصیت کے برعکس ہم مغربی زندگی سے جی بھر کر نطف اندوز ہوتے تھے۔ میرے شوہر گیارہ برس سے پانچ بجاتے آرہے تھے۔ انہیں یورپ کی کلاسیکی موسیقی اور امریکی حبشیوں کے مقدس نغمہ و سرود سے عشق تھا۔ وہ بڑی عمدہ تصویریں، خصوصاً عوام الناس کی تصویریں کھینچ سکتے تھے ہم دونوں کو رقص کا بھی شوق تھا اور گاہے گاہے اپنے اس شوق کو پورا بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہم ہر قسم کے مغربی کھانے کھایا کرتے اور حلال و حرام کی ذرا

بھی تیز نہ تھی۔ ہم دونوں اپنی ہفتہ وار چھٹی اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتے۔ ان دوستوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ساحل پر غسل کرنے جاتے۔ ریسٹورانوں، تھیٹروں، فنون لطیفہ کے عجائب گھروں اور سینماؤں کی سیر کرتے۔ اچھے سے اچھا لباس پہنتے اور چھوٹی چھوٹی خواہشات پر دل کھول کر روپیہ لٹاتے..... ہم دونوں میں سے کسی نے بھی پورا پورا اندازہ نہیں کیا تھا کہ اسلام ہماری زندگی کے انتہائی ذاتی اور بے تکلف دائرے میں بھی کتنا گہرا دخل رکھتا ہے۔ ہم نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تو میرا خیال تھا کہ مجھے ساڑھی یا قمیص اور شلوار پہننا اور روپیٹہ اوڑھنا ہوگا، لیکن برقعے اور پردے کی ناگزیر ضرورت کا پتہ اُس وقت چلا جب ہم نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کی روزمرہ زندگی کا مشاہدہ شروع کیا۔ ہمیں کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ اپنے گھروالوں اور دوستوں کی تصویر کشی بھی کوئی معیوب چیز ہے، یا یہ کہ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ خوب اور جہاں چاہے نہیں جاسکتی، سینما دیکھنا بڑا ہے، سمندر کے کنارے پیرنے کے لیے جانا ٹھیک نہیں۔ تاہم تفریح کا جو ساز و سامان ہم یورپ میں چھوڑ آتے تھے اس کی ثانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے ہو گئی جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مردوں کو تیر اندازی کرنے، اپنے گھوڑوں کو سدھانے اور اپنی بیویوں کے ساتھ سنسنی دل لگی کرنے کی اجازت ہے۔ دوسرے تمام میلانات کو وقت کا ضیاع سمجھنا چاہیے۔ ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بات درست ہے لیکن جس نشاط و تفریح سے یورپ میں لطف اندوز ہوا کرتے تھے اُن سے الگ رہنا آج بھی ہمیں وحشت خیزی کی حد تک دوہرا معلوم ہوتا ہے۔

دراصل یہ ہمارا اپنا تصور ہے۔ ہم اسلام کو پوری دیانت داری اور جرأت مندی کے ساتھ من و عنق پیش نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نو مسلم اہل مغرب کی اکثریت اسلام کے بگڑے ہوئے تصور



سے بڑی مشکل میں پھنس جاتی ہے اس لیے کہ وہ اپنے کافر ذہنوں کو مسلمان ذہنوں میں تبدیل کرنے سے نفسیاتی طور پر قاصر رہتے ہیں؛ چنانچہ وہ نئے دین میں داخل ہوتے ہیں تو بالکل بے خبری میں اپنی پرانی قدیں اور طریقہ ہائے فکر ساتھ لے کر آتے ہیں۔ پھر انہیں اپنے نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ انجام کار وہ اکثر تیغ مایوسیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، جو انہیں بسا اوقات ارتداد تک پہنچا دیتی ہیں۔ جدید ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے ہم بڑی عیارانہ سوسائٹیت سے کام لیتے ہیں اور اپنے مذہب کو شکر چڑھی گولی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم اہل مغرب کو اسلام کے بارے میں ایک ایسا تصور دیتے ہیں جس سے وہ فی الحقیقت بالکل پاک ہے۔ اگر ہم صدقِ دل سے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام دوسرے تمام نظامِ ہائے حیات سے اعلیٰ و برتر ایک خدائی نظامِ حیات ہے تو ہمیں ان لوگوں کی نہ تو تنقید سے ڈرنا چاہیئے، نہ مذمت سے جن کی اقدار ہماری اقدار سے بالکل مختلف ہیں۔

بالفرض مغرب کی تہذیب جدید نظریاتی اعتبار سے دیوالیہ بھی ہو چکی ہے تب اہل مغرب نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اور جب تک ان کا طرزِ حیات دنیا میں ہر جگہ غلبہ پا رہا ہے اور مختلف تصورات کی حامل تمام دوسری تہذیبیں بسرعت زوال پذیر ہیں۔ اُس وقت تک وہ اس حقیقت کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے طرزِ حیات کی برتری اور تفوق پر یقین محکم رکھتے ہیں۔ جب تک اس طرزِ حیات کا دنیا میں ڈونکا بجتا رہے گا اُن سے یہ توقع غلط ہوگی کہ وہ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک ایسی تہذیب کو اپنالیں گے جو اس سے بالکل مختلف بھی ہے اور جس کا عظیم الشان ماضی بس تاریخ کے اوراق کی زینت بن چکا ہے۔ ہماری ایک بڑھئی اور بھی ہے۔ مسلمان ملکوں سے یورپ اور امریکہ جانے والے طلبہ اور سفارتی نمائندوں کی کھیپ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ سوائے نقصان کے اور کوئی چیز اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ مغربی ملکوں میں جانے والے مسلمان اپنے سینوں میں اسلام

کی دوسرے تمام نظاں ہاتے حیات پر برتری کا یقین و اعتقاد اور دوسروں کو اس دولت سے بہرہ ور کرنے کا جوش و جذبہ لے کر نہیں جاتے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے ”پس ماندہ“ اور ”غیر ترقی یافتہ“ ہونے کا احساس ہر وقت سرنگوں اور نثر مسار کیے رکھتا ہے؛ چنانچہ وہ اہل مغرب کو یقین و ایمان کی روشنی سے بہرہ ور کرنے کے بجائے مغرب کے تعلیمی اداروں میں مغربی نظریات اور تکنیک پر عبور حاصل کرتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو ان نظریات اور طور اطوار کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ان سب سے بدتر وہ سفارتی نمائندے ہیں جو سرکاری تقریبات میں شراب پیٹے اور غیر محرم عورتوں کے ساتھ ناچتے ہیں اور پھر بڑے فخر کے ساتھ اخبارات میں تصویریں چھپواتے ہیں اس طرح وہ بڑی بے حیائی سے اسلام کے ایک ایک حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اپنے ضمیر میں ذرا بھی خلش محسوس نہیں کرتے۔

امریکہ اور یورپ والے جب یہ دیکھ رہے ہوں کہ وہ ملک جہاں مسلمان صدیوں سے بھاری اکثریت میں چلے آتے ہیں، مغربی تہذیب و ثقافت کو اپنانے اور اپنی اسلامی میراث کو تھوڑے دینے کے لیے نہایت بے چین ہیں، تو ایسی صورت میں ان سے یہ توقع کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے، کیا امر غیر منطقی بات نہیں ہے؟ جس حق کے لیے مسلمان خود عملاً کوئی جذبہ احترام ظاہر نہیں کرتے غیر مسلم اُسے مقدس گروان کر کیوں کر اپنا سکتے ہیں؟ کیا یہ بات مضحکہ خیز اور صریح منافقت نہیں ہے کہ ہم یورپ اور امریکہ کے غیر مسلموں کو تو اسلام کا سیاسی نظام اپنانے کی دعوت دیں اُس کی حسانت کے گن گائیں اور یہ وعظ کریں کہ اسلام ایک مکمل اقتصادی نظام ہے اور اپنے دامن میں تمام معاشرتی مسائل کا حل رکھتا ہے، لیکن عالم اسلام کے کسی گوشے میں ایسے معاشرے کا عملاً وجود تک نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر مضرت رساں بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم سر پھرے قوم پرست اُمروں کے سامنے میں برائے نام سیاسی آزادی، فنی اور صنعتی ترقی، لادینی تعلیمی اداروں کے فروغ و عروج، عورتوں کو راستے دہی کے حق، سعودی عرب میں غلامی کی تہذیب اور مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں میں نلک بوس عمارتوں کی تعمیر کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ غلط ملط

کر دیں۔ یہ باتیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا "بیداری" کا منظر نہیں ہیں بلکہ ان سے تو مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب و نظریات کے بڑھتے ہوئے غلبے کا پتہ چلتا ہے۔ جب تک ہم خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے دین کو نافذ کرنے کی حقیقی، زندہ اور عملی مثال پیش نہیں کرتے غیر مسلم دنیا پر کسی قسم کا فیصلہ کن دینی اور اخلاقی اثر ڈالنے کی توقع یکسر عبث ہے۔

# اہل علم کا فرض

مسلمان اہل علم خالص سیاسی اور اقتصادی مسائل میں ضرورت سے زیادہ الجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تجدّد کی لعنت وہ سنگین مرض ہے جس نے تمام مسلمان ملکوں کو زبردست مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس مرض کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوں اور اس کا مداوا ڈھونڈیں۔ انہیں اس دینی تجدّد پرستانہ تحریک کو خوب اچھی طرح پہچان لینا چاہیے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے کا نعرہ لگا کر قرآن و سنت پر مسلمانوں کے ایمان کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتی ہے۔ یہ تحریک نان تح کے اعتبار سے فلسطین پر صہیونی تسلط، کشمیر پر بھارتی استیلاء، حبشہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم اور قبرص میں ترک افلیت کی نسل کشی کی کوششوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ یہ سب مسائل صرف ایک بُرائی کا مظہر ہیں۔ وہ بُرائی جس کے ارتکاب کے مجرم بدقسمتی سے مسلمان بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ غیر مسلم۔ اور وہ ہے جنگ جو ریائے قوم پرستی۔ غیر مسلم جن گمراہ کن من گھڑت نظریات میں مبتلا ہیں اگر ہم مسلمان بھی ان میں برابر کے شریک ہوں تو پھر ہم ان سے افضل کیونکر ہو سکتے ہیں؟

مسلمان علماء کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام فلسفوں کو رد کر دیں جو آج دنیا میں حکمران ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے مقالات جو وحی و تنزیل پر مبنی خالص بدیہی صداقت کے منکر ہیں اور عقلی تحقیق اور منکر کی آزادی کے نام پر ریب و تشکک اور بدعت و کفر کو نیکی کی حیثیت سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، سیاسی مصلحت پرستی جس کی تلقین میکاؤل نے اپنی کتاب "پرفس" میں کی ہے، والٹیر کی نام نہاد روشن خیالی جو مذہب سے تعلق رکھنے



والی ہر چیز کو تو ہم، تعصب اور جنون گروانتی ہے۔ فرائیڈ کے اصول جو بنے روک ٹوک جنسی تعلقات کو افراد اور معاشرے کے لیے انتہائی صحت مند ہونے کا پراگینڈا کرتے ہیں، مارکس کا عقیدہ و نظریہ جو اقتصادی بہبود کو کسی ریاست کی سرکاری پالیسی کا سب سے بڑا ہدف قرار دیتا ہے۔ ایسا ہدف جس پر تمام دوسری اقدار قربان کر دینی چاہئیں یا انہیں اس کا تابع اہل بنا دینا چاہیے۔ جو کہتا ہے کہ کسی مخصوص معاشرے میں تہذیبی نظریات مادی احوال کے تابع ہوتے ہیں اور اخلاقی اور روحانی ارتقاء کا انحصار مادی ترقی پر ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ نظریہ ارتقاء جو پہلے ٹارون نے پیش کیا اور پھر جے ہربٹ سپنسر نے عمرانیات پر منطبق کر دیا۔ ضرورت ہے کہ ان تمام بے سرو پا من گھڑت نظریات کے ایک ایک نقطے کی مفصل تردید کی جائے۔ و لائل انتہائی منطقی اور مؤثر ہوں اور اسلوب بیان نہایت عالمانہ، باوقار اور اس قدر دلچسپ ہو کہ پڑھ لکھے لوگوں کے وسیع حلقے کو اپنی جانب کھینچ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان اہل علم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ، اس کے نازل کردہ اور ثابت بل غیر قانون کی بے چون و چرا اطاعت کی ضرورت، حلال و حرام، حدود و شرعی، پردہ اور جہاد کے تصورات کی پُر زور تائید کریں تاکہ لوگ مروجہ بانقہ نقطہ متکر کا شکار ہونے کے بجائے ان نظریات کی فطری خوبیوں کے قائل ہوں۔

جب اس قسم کی عالمانہ تصانیف لوگوں کی بھاری تعداد کو اپنی جانب کھینچ لیں گی تو اسلامی تصورات، مخصوص معاشرتی اداروں یعنی اسلامی سکول، اسلامی خیراتی ادارے، اسلامی شفا خانے اور سائنسی تحقیقات کے مراکز وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ ایک باریہ اسلامی متبادل ادارے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئے، تو عالم اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کا عمل خود بخود ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ غیر ملکی استعمار کے منحوس نتائج پر منہ بسورنے کے بجائے ہم مرض کی ظاہری علامات پر شکوہ منجھونا چھوڑ دیں گے اور مرض کی چارہ جوتی میں لگ جائیں گے۔

## اسلامی نشاۃ ثانیہ کے امکانات

صحیح اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کے مخالف بغلیں بجا بجا کر کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے معدوم ہو چکی ہے۔ اس کا تخلیقی مدبر ماضی کی تاریخ بن چکا ہے۔ اُس کے دامن میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمان ممالک نے مغربی تہذیب کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے جس طرح شکست کھائی اُس کے ایک ایک مرحلے کی داستان یہ لوگ بغلیں بجا بجا کر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی زندگی کا انتشار اور مسلمانوں کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینے میں مکمل کامیابی ناگزیر ہے۔ مزید برآں وہ بڑے ذوق سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عمل کو کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ مفرد ضد یہ ہے کہ جدید تہذیب ناقابلِ تسخیر ہے۔ ان پامال اور فرسودہ جھلوں نے مسلمانوں کی نوخیز لہر کو پست ہمت کرنے میں جو کامیاب کردار ادا کیا ہے ہمارے دشمنوں کا بڑے سے بڑا ماہر اہل پراگنڈا بھی نہیں کر سکا۔ اگرچہ مغربی تہذیب کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا پراگنڈا بڑے سے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ نسلی نفرت، طبقاتی کش مکش، لائقانیت کی دبا، تخریبی مقاصد کے لیے سائنسی کارناموں کا بے جا استعمال، خاندان کا بے جا انحلال، ناجائز جنسی تعلقات کا عالمی شوق اور انتہائی دہیات تعیشتات پر ترقی اور انسانی سرمایے کا بے اندازہ ضیاع

اس تہذیب کی چند انتہائی جرات پذیر کمزوریاں ہیں۔ ماضی میں تمام دوسری تہذیبیں جن باتوں سے ہلاکت کے گھاٹ اتریں وہی موجودہ تہذیب کو بھی یقیناً تباہ کر کے رہیں گی۔ مخالفین کے مقابلے میں ہمارے پاس گراں بہا اثاثہ یہ ہے کہ حقیقی اسلامی زندگی اس قسم کی تمام بد عنوانیوں سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔ مغربی تہذیب لوگوں کو اس لیے ناقابل تسخیر نظر آتی ہے کہ کوئی دوسری تہذیب تدریجاً مقابل نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کوئی مؤثر حریف میدان میں آگیا تو جدید تہذیب کی بوسیدگی اور مٹاؤ کھل کر سامنے آجائے گی۔

ہمارے مقصد کے لیے انتہائی تباہ کن ہمارے وہ مصنفین اور اہل قلم ہیں جو عظمت رفتہ کے گن گار دورِ جدید کے مسائل کا قابلِ عمل اور حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنے سے گریز کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے تھے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے تلابے ملنے سے یہ ضمانت نہیں ملتی کہ ہمارا اسلامی معاشرہ مستقبل میں بھی نمودیر ہوگا۔ یہ نیک نیت مصنفین حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کے اصحابؓ کی مدح و توصیف میں کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں، اسلام کی شاندار روحانی برتری کے گیت گاتے ہیں اور مادہ پرست مغرب کی شدید مذمت کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ گویا ان کی پُر زور لفاظی کے نتیجے میں اسلام کا حسین و جمیل مثالی نظام خود بخود وجود میں آجائے گا اور انہیں کسی مزید جدوجہد کی زحمت نہ اٹھانا پڑے گی۔

ایک مسلمان اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

• دنیا بھر کے مسلمان تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب جو جدیدیت پسندی کہلاتی ہے، سائنسی ترقی کی زبردست قوت کے بل پر دوسری تہذیبوں پر غالب اچکی ہے۔ عیسائیت نے اس کا جان توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن وہ زیادہ مدت تک ثابت قدم نہ رہ سکی کیونکہ اس کی زرہ بکتر میں بہت سے خطرناک شگاف تھے۔ دوسرے مذاہب بھی عیسائیت کے



سے حشر سے دوچار ہوئے۔ ممکن ہے کہ بعض ممالک میں ابھی تک کچھ رسوم و رنج ہوں، لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سب جدیدیت پسندی سے سخت متاثر اور اس کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو یکسر بدل اور اپنی اصلیت کھو چکے ہیں۔ اگرچہ تمام ملکوں کے مسلمان جدیدیت پسندی کی زبردست ضرب سے بچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں؛ تاہم وہ ہر جگہ اس کے مقابلے میں پسپا ہو رہے ہیں۔ نوبت باپن جا رسید کہ اکثر مسلمان بھی اس کا غیر مقدم کر رہے ہیں اور اس عالمی تہذیب میں بتدریج جذب ہونے جا رہے ہیں۔.....“

جو لوگ اسلامی زندگی کو اعلیٰ پیمانے پر نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں بظاہر ان کی کامیابی کے مواقع و حوصلے سے نظر آتے ہیں۔ مغربی استعمار سے سیاسی حاکمیت کی بازیافت کے باوجود مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات کمزور نہیں پڑے۔ اس کے برعکس اقتصادی ترقی کے نعرے کی آڑ میں ایشیا اور افریقہ کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کا کام تیز تر ہو گیا ہے۔

■ انیسویں صدی کے آغاز نے ہمارے اسلامی معاشرے کو موجودہ دور کے عالم گیر معاشرے میں جذب ہوتے دیکھا..... میری رائے میں ان پیچیدگیوں سے آگاہی ہمارے آج کے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ ہے۔ مغرب کے اثرات اتنے عظیم اور گہرے تھے کہ جب مسلمان توہین سیاسی آزادی سے ہمکنار ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ روایاتی اسلامی طریق زندگی



کی طرف پٹنا ممکن نہیں رہا۔

مذکورہ بالا اقتباس ہمارے جدید تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقے کی ذہنیت کا مثالی نمونہ ہے، لیکن کیا ہمیں کھل کر تنظیث کے آگے سپر انداز ہو جانا چاہیئے اور اپنی شکست مان لینی چاہیئے؟ کیا ہمارے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہی؟

اسلامی نشاۃ ثانیہ کا امکان اس وقت چاہے کتنا ہی تاریک نظر آتا ہے، میرے نزدیک اُمید کی کرن اب بھی موجود ہے، بشرطیکہ ہم بروقت اور موزوں قدم اٹھائیں۔ امید کی یہ کرن مندرجہ ذیل مفروضات پر مبنی ہے:

- ۱۔ اسلام کے بنیادی مآخذ — قرآن و سنت — مفاسد اور بگاڑ سے بالکل پاک اور جوں کے توں ہیں۔ کوئی دوسرا مذہب ایسی ذہنیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔
- ۲۔ اسلامی تعلیمات جامع اور ہمہ گیر ہیں اور کسی دوسرے نظریے کی دست نگر نہیں۔ اسلام کسی ایسی تہذیب کے ساتھ امتزاج اور مصالحت کو برداشت نہیں کرتا جس کے اصول اُس کے اصولوں سے متضاد ہوں۔ اسلام واحد مذہب ہے جو پوری انسانی زندگی کی شایان شان رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام صرف یہی نہیں کہتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے، بلکہ بالضراحت یہ بھی بتاتا ہے کہ ہمیں کس طرح کرنا چاہیئے؟ دوسرے تمام مذاہب کی تعلیمات قلیل، محدود اور جزوی ہیں۔
- ۳۔ اسلام کو اس کی حقیقی پاکیزہ صورت میں محفوظ رکھنے اور تبلیغ و اشاعت کرنے کے لیے اسلامی تاریخ کے ہر دور اور ایک وقت ہر مسلمان ملک میں مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ مغربی عالموں اور

Shafiq Ghorbal, Director of the Institute of Higher Arabic Studies of the Arab League, Cairo, quoted from *Islam the Straight Path*, Edited by Kenneth Morgan, The Ronald Press, New York, 1958, p. 78.

سیاستدانوں کی تائید و حمایت اور جوصلہ افزائی سے ہمارے تہجد پسند اپنی اسلام کی مسخ شدہ تعبیر کو پورے معاشرے پر مستط کرنے میں کوشاں ہیں؛ تاہم وہ لوگ اس کی محنت و مزاحمت کر رہے ہیں جو اس منافقانہ دام فریب میں نہیں آتے اور اسلام کو بے آمیزش اور درست حالت میں محفوظ رکھنے کا عزم مصمم کیے ہوئے ہیں۔

۴۔ مراکش سے انڈونیشیا تک مسلمانوں کی بھاری اکثریت اسلام چاہتی ہے۔ انہیں ایک مرتبہ متحرک اور زندگی بخش قیادت میسر آگئی تو وہ انتہائی جوش و خروش سے اسلام کی پیروی کرنے لگیں گے۔

اگر یہ سچ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسلامی قیادت کسی ایک مسلمان ملک میں بھی کیوں بھرنے نہیں پائی؟ ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی قیادت کے فقدان کا سبب نہ تو مغربی تہذیب کی کسی فطری خرابی میں پنہاں ہے اور نہ اسلام کی کوئی فطری خامی اس کی ذمہ دار ہے۔

اس سوال کا جواب مغربی تنصیر کی فطرت کے صحیح ادراک سے مل سکتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں لارڈ کرڈمر نے اپنی کتاب مصر جدید (Modern Egypt) کے آخری باب میں بڑے انکشاف انگیز انداز میں لکھا ہے کہ جو بھی انگریزی تعلیم کے ذریعے انگریزی تہذیب کے رنگ میں رنگی ہوئی دانشوروں اور سیاستدانوں کی ایک ایسی نسل تیار ہو جائے گی جو اقتدار کی باگ ڈور سنبھال سکے اُس وقت انگلستان اپنی تمام نوآبادیات کو سیاسی آزادی دیدے گا، لیکن برطانوی حکومت کسی آزاد اسلامی ریاست کو کسی حالت میں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرے گی۔ جو بات مصر کے متعلق درست تھی وہ پاکستان کے بارے میں بھی اتنی ہی درست اور صحیح ہے اور جو پالیسی برطانیہ کی تھی اُسی پالیسی پر فرانس، اٹلی اور ہالینڈ بھی گامزن تھے اور وہی پالیسی آج امریکہ اور روس کی ہے۔ لہذا ہماری سیاسی حاکمیت محض برائے نام ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور مغربی طاقتیں اقتصادی امداد کی آڑ میں اسے برائے نام رکھنے پر تہمتی ہوئی ہیں۔

اس ضمن میں مسلمان ممالک کے معاشرتی ڈھانچے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہماری معاشرتی اور اقتصادی میسرعی کے سب سے بالائی ڈنڈے پر ہمارا جدید تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نسلاً عرب، ہندوستانی ملائی یا افریقی ہیں مگر ذہنی اعتبار سے اپنے سابق

آقاؤں کا ہجو چہرہ ہیں اور اپنے ملکوں کو مغربی معاشرے کے رنگ میں پوری طرح رنگنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ طبقہ پوری آبادی میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہے؛ تاہم سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی سرگرمیوں کی بر وقت روک تھام نہ کی گئی تو وہ بگڑی ہوئی اخلاقی اور تہذیبی اقدار جو اب تک طبقہ اثرات تک محدود ہیں، پھیل جائیں گی اور عوام کے سارے طبقات کو بگاڑ دیں گی۔

سیڑھی کے نچلے سرے پر ایک اور گروہ ہے جو تمام مسلمان ملکوں کی آبادی میں تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ہیں سیدھے سادے عام لوگ۔ اس گروہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خوش قسمتی سے تہذیب جدید کے اثرات سے محفوظ رہے ہیں اور جدید تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہوئے۔ یہ مسلمان زیادہ تر غریب، ناخواند اور ادنیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ علماء اور مساجد کے امام بھی، جنہوں نے دینی مدارس (مثلاً الازہر اور یونیورسٹی وغیرہ) میں تعلیم پائی ہے اسی زمرے میں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر بہ باطن اچھے مسلمان ہیں۔ بعض اسلامی احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن اپنی لاعلمی کی بنا پر آسانی سے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ یہ لوگ اکثریت میں ہیں، لیکن کمزور اور غیر منظم ہونے کی وجہ سے بے بس اور قومی زندگی میں غیر مؤثر ہیں۔ طرہ یہ کہ اس گروہ کے اکثر نہیں تو بہت سے لوگ اسلامی احکام ذاتی اذعان و یقین سے زیادہ محض عادت یا رسم کے طور پر بجا لاتے ہیں۔ جس روایاتی تہذیب و ثقافت کی یہ نمائندگی کرتے ہیں اس میں نہ ترقی محکمہ رہی ہے نہ زندگی؛ چنانچہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ہر پرانی، قدیم، سپاندہ، غریب اور قریب الگ چیز کو اسلام کے ساتھ منہمی کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہر مغربی چیز انہیں درخشاں اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے نزدیک یہ روایاتی تہذیب مشرق کے زوال پذیر آثار یا قبیحہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چونکہ کوئی نوجوان اپنے آپ کو سپاندہ یا رجعت پسند جنونی کہلانا گوارا نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اسے دشمن خیال جدید زمانے کا انسان اور ترقی پسند سمجھا جائے اس لیے جو بھی یہ نوجوان اعلیٰ سرکاری یا مشنری تعلیمی اداروں سے کاروباری، ماہرین فن، ڈاکٹر، استاد یا سماجی کارکن بن کر نکلتے ہیں شہرت و ناموری اور عزت و احترام حاصل کرنے کے لیے "روایت پسندی" کو ختم کرنے اور جدت پسندی کی "برکات" کو ملک کے بعید ترین گوشوں تک پھیلانے کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں۔ حکومت کی مکمل تائید، مغربی طاقتوں کی



فنی امداد کے پروگرام اور کاروبار میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سہارے انہیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔  
مید سے سادے عوام زیادہ سے زیادہ بے جان مزاحمت ہی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ خود مغلوب نہیں ہوتے  
تو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے بچے تو ضرور ہر جاتے ہیں۔

معاظہ اگر ان دونوں گروہوں کے ہاتھ میں ہوتا تو صورت حال یقیناً مایوس کن تھی، لیکن خدا کا  
شکر ہے کہ ایک تیسرا گروہ بھی بتدریج ابھر رہا ہے۔ یہ گروہ تعداد میں سبک کم ہے، لیکن مسلمان مائثرے  
کا مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کا قطعی رُخ یہی لوگ متعین کریں گے۔ یہ وہ مرد اور خواتین ہیں  
جو مغربی تہذیب کی رد میں رہے ہیں، جدید تعلیم یافتہ بھی ہیں، بعض یورپ اور امریکہ میں تعلیم بھی پاتے  
رہے ہیں اور کام بھی کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے انہوں نے اپنے دین و ایمان اور اسلام کی محبت  
کو برقرار رکھا ہے، اپنی روزمرہ زندگی میں اس پر عمل کرتے ہیں اور اپنے دین کو نافذ کرنے کے لیے  
ہر قسم کی قربانی دینے کا جوش و جذبہ رکھتے اور ہمہ تن آمادہ رہتے ہیں۔ اسلامی زندگی میں مغربی تہذیب  
کے بڑھتے ہوئے نفوذ کی موثر مزاحمت کے لیے جس فکری اسلحہ کی ضرورت ہے اُس سے پوری طرح  
لیس ہیں؛ چنانچہ صرف یہی لوگ عالم اسلام کی رہنمائی کے اہل ہیں۔

معاشرے میں مسلمان مصنفین اور اہل علم کی یہ عام راستے ہے کہ یورپ کا مسیحی کلیسا اپنے غیر عقلی عقائد  
مثلاً تثلیث، مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا، انسان کا پیدا تشریحی گناہ گار ہونا۔ اور پاپائیت کے رجعت پسند  
ادارے کی بنا پر اثر و اتداز سے محروم ہونا۔ دوسری طرف اسلام ایک آسان، سادہ اور ہر قسم کی پیچیدگیوں  
سے پاک نظریہ زندگی ہے۔ نہ تو نظریہ سائنسی ترقی سے متصادم ہے اور نہ عام اہل ایمان سے الگ تھلک  
پر وہنتوں کے کسی مخصوص طبقے کا تعلق ہے۔ بنا بریں ہمارا مذہب اس اُفت سے محفوظ ہے جس سے عیسائیت  
دوچار ہوئی۔ استدلال کا یہ انداز بظاہر بڑا خوش آئند اور طمانیت بخش ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک خطرناک  
خوش خیالی ہے۔ مسیحی عقائد اور ادارے، اسلام سے کتنے ہی متضاد سہی، ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ عیسائیت  
کے زوال کا سبب یہ عقائد اور ادارے نہ تھے۔ جب کیتھولک کلیسا زاتمہ احیاء کے لادینی ہیرو بازم اپرٹسٹ  
تحریک اصلاح اور انقلاب فرانس کے عقب میں آنے والے ملحد مادہ پرستی کے سیلاب سے دوچار ہوا



اُس نے خالص منفی طریقوں سے کام لے کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ اُس نے اپنی ساری قوت غیر مقلدین کو تعذیب و اذیت کا ہت بنانے، مگر اہوں کے منظم تعاقب، بدنام احتسابی عدالتوں کے انعقاد اور گراہ گن کتابوں کو نذرِ آتش کرنے پر صرف کر دی۔ اگر کیتھولک کلیسا مثبت طریقے اختیار کرتا۔ محض کفر و بدعت کے فتوے لگانے اور کتابوں کو ممنوع قرار دینے کے بجائے اپنے اجل فضلاء کو مادہ پرست فلسفیوں کے غلط نظریات کی موثر اور معقول دلائل سے تردید کے کام میں لگاتا تو وہ اپنے اثر و اقتدار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بد قسمتی سے اُس نے اپنے ارکان کے اذہان و قلوب سے اپیل کرنے اور ان کے دلوں میں عیسائیت کی محبت کی روح پھونکنے کے بجائے جبر و تشدد سے کام لیا۔ ان متشددانہ اقدامات نے نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکانے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اگر کلیسا کے نقطہ نظر کو مان لیا جائے کہ بدعتی اور زندقہ اسی سزا کے مستحق تھے جو انہیں ملی، تب بھی محض جبر و تشدد کے طریقے نہ صرف ظالمانہ اور انسانیت سوز بلکہ قطعاً غیر موثر اور خود اپنے مقصد کی مکمل شکست کے موجب ہوتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ اختلافِ رائے رکھنے والوں کو تعذیب و اذیت کا نشانہ بنانے کے واقعات سے بڑی حد تک پاک ہے، تاہم دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ ایسی ہی غلطی ہم سے بھی سرزد ہوتی ہے اگرچہ قدرے نرم انداز میں۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب کے سبز باغ پر جس طرح روز افزوں ریختے جارہے ہیں اُس کا مقابلہ ہم اس تہذیب کو "مادہ پرستانہ"، "بے خدا" اور "شیطان" قرار دینے سے (جو حقیقت کے اعتبار سے بالکل درست ہے) نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے تجدید پسندوں پر کفر کے فتوے لگا کر مغربی تہذیب کو اپنانے سے نہیں روک سکتے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کافر قرار دیئے جانے کے سزاوار ہیں یا نہیں۔ اغلباً وہ سزاوار ہیں، لیکن کیا اس طرح کے فتوے لگا کر ہم اپنے مقصد کے لیے کوئی تعمیری کام کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب زور دار "نہیں" میں ملے گا۔ آخری فیصلہ ہمارے نہیں خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنی انتہائی جدوجہد اسلام کی خاطر وقف کر دینی چاہیے اور یہ بات اللہ پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے ان لوگوں کو سزا دے۔

ہم مسلمان آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ کوئی نیا نہیں ہے۔ صدیوں پہلے ہم ایسے ہی

ستے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ جب لادینی یونانی ہیومنزم کی مقبولیت عام بڑھ رہی تھی جس کی نشر و اشاعت الکندی، ابن سینا، الفارابی اور ابن رشد ایسے معتزلہ فلسفی کر رہے تھے۔ ان سب سے بالکل ہمارے آج کے تجدید پسندوں کی طرح اسلام کا ایک نیپار کا تیار کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ”تہانت الفلاسفہ“ میں ان کے دلائل کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ان کے منطقی مغالطے اور فکری بددیانتی کو ایسے مؤثر انداز میں بے نقاب کیا کہ معتزلہ تحریک کی پیش قدمی رک گئی۔ امام ابن تیمیہؒ نے ان عقلیت پسندوں پر آخری ہلک ضرب لگائی۔ اس کے بعد یونانی ہیومنزم اپنا سارا اثر و نفوذ کھو بیٹھا اور معتزلہ فلسفی اسلامی دنیا کی نظر میں پھر کبھی عزت و احترام کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

آج عالم اسلام کو تمام باتوں سے زیادہ، ایک نئے غزالی اور نئے ابن تیمیہ کی ضرورت ہے۔ ان کے جانشینوں کا کام اتنا پیچیدہ نہیں ہو گا جتنا کہ پہلی نظر میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم یونان کا لادینی ہیومنزم عصر جدید کے مادہ پرستانہ فلسفے سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ مؤخر الذکر فلسفہ اول الذکر کی محض ایک مزید ارتقائی شکل ہے۔

ہمارے جدید ابن تیمیہ کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ ”ترقی کے غبار سے ہمیشہ کے لیے ہوا نکال دے۔ ہمارے دلوں میں ”تبدیلی“، ”ترقی“، ”وقت کے ساتھ ساتھ چلنے“، ”زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کرنے“ کا جو خیال بس گیا ہے وہ سوائے ایک تجدید پسندانہ عقیدے کے اور کچھ نہیں ہے جو داروں کے نظریہ ارتقاء سے ماخوذ ہے اور جسے کارل مارکس نے تاریخ کی مادی تعبیر کی حیثیت سے معاشرتی فلسفے میں سمجھ دیا تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی اپنے سامنے رکھنی چاہیے اور قرآن و سنت کی غیر مشروط اطاعت کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ ہم تہذیبی آزادی سے ہمکنار ہو گئے تو پھر ہمیں اسلامی اقدار و نظریات کے دائرے کے اندر خود بخود نظری انداز میں رہنا ہونے والے معاشرتی ارتقاء سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ جب تک ہم جدت پسندی کے غلام رہیں گے تبدیلی کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ ہم اسلامی اقدار کو چھوڑ کر مغربی طرز زندگی کو اپنائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں نہر تبدیلی اسلامی نقطہ نظر سے نقصان اور مضرت کے مترادف ہے۔

تہذیب جدید میں کوئی چیز جدید اور ترقی پسندانہ نہیں ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی اور اقتصادی ترقی کے علی الرغم مغربی تہذیب میں پیریکلز کے عہد سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

ابن تیمیہ کے نئے جانشینوں کو تجدید پسندوں کے ایک اور عقیدہ کو بھی بے نقاب کرنا ہوگا اور وہ ہے طلبہ اور اساتذہ کو تحقیق کی مکمل آزادی دینے کا عقیدہ، جو ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں باقاعدہ ایک ڈھونگ (Bogy) بن چکا ہے۔ "عقل" اور سائنٹفک تحقیق کی مکمل آزادی کا مطالبہ بھی تہذیب جدید کا ایک اذعان اصول ہے جو سقراط کے فلسفے سے جو اس کے شاگردان فلاطون نے مرتب کیا تھا، اخذ کیا گیا ہے اور آج تک "بروزم" کے بحس میں باقی ہے۔ اس نام نہاد آزادی فکر کا واحد مقصد مذہب کے بنیادی اصولوں کے بارے میں مشکوک و شبہات پیدا کرنا، اور خدا، اس کی وحی اور آخرت کا مضحکہ اڑانا ہے۔ اسے سوویٹ یونین کے ۱۹۳۲ء کے دستور میں قانونی شکل دے دی گئی ہے،

چنانچہ تمام روسی شہریوں کو مذہب دشمن پراپیگنڈے کی کھلی چھٹی ہے۔ آزادی حقیقی معنی میں ہر پہلو سے آزادی ہونی چاہیے، لیکن مغربی تہذیب کی سرپرستی میں نام نہاد "عقل" کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہمیشہ وحی والہام کے خلاف صفت اُزار ہے اور اس کی کبھی حمایت نہ کرے۔ لہذا اس نام نہاد "عقل" اور علمی تحقیق کو صرف ایک ہی سمت یعنی مادہ پرستی کی راہ پر بڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ روایاتی دینی تعلیم کو اس بنا پر برا بھلا کہتے نہیں تھکتے کہ اس میں تنقیدی، تخلیقی اور آزادانہ غور و فکر کا فقدان ہے، لیکن نہیں خود ان کے اپنے انداز غور و فکر میں بھی کوئی ایچ یا آزادی نظر نہیں آتی۔

ہمارے تجدید پسندوں کی ایک اور پسندیدہ تکنیک یہ ہے کہ وہ "روح" کا انقصاد اسلام کے ظاہری معنوں سے کر دیتے ہیں، گویا وہ دونوں ایک دوسرے سے منافی ہیں۔ تجدید پسند کہتے ہیں کہ ہماری شریعت کے ظاہری معنی اس کی روح کو قتل کر دیتے ہیں، چنانچہ مرحوم سید امیر علی اپنی مشہور کتاب "دی سپرٹ آف اسلام" میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ پردہ کے ظاہری احکام انتہائی غیر اسلامی ہیں، لیکن

۱۰ تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے قدیم ایتھنز کا ایک حکمران۔



مردوزن کے آزادانہ اختلاط کا مغربی تصور اور مردوزن کی مکمل مساوات اسلام کی سچی "روح" ہے۔ شریعت کے الفاظ تعدد و ازدواج کی اجازت دیتے ہیں، لیکن یک زوجگی (ایک ہی وقت میں ایک بیوی رکھنا)، جیسا کہ برہنہ عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن کی روح کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم کے سیدھے سادے واضح احکام مسلمانوں پر بار بار زور دیتے ہیں کہ وہ جاسم غیر مسلموں کی خلاف جہاد کریں، ان احکام کی رو سے جہاد مسلمانوں کا مقدس فریضہ ہے، لیکن سید امیر علی کہتے ہیں کہ اسلام، مذہب کے نام لڑی جانے والی تمام جنگوں کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر امن کو ترجیح دیتا ہے۔ اس فہرست میں غیر محدود اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ مغالطہ کہ "الفاظ ترقی کرتے ہیں اور روح" زندگی بخشی ہے۔ "خالص مسیحی تصور ہے جو عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کی کتاب (Epistles) سے لیا گیا ہے۔ عیسائی تعلیمات جو کچھ بھی کہتی ہیں، ہمیں مسلمان کی حیثیت سے اخلاقی دیانت سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ تصور اسلامی اقدار کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جس طرح کوئی مخلوق اپنے بیرونی قالب کے بغیر وجود نہیں رکھ سکتی اسی طرح انسانی معاشرے میں مختلف اداروں کے لیے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے کہ ہم مادی وجود کے بغیر محض روح کی حقیقت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر انسان کا جسم کسی دوسری مخلوق کے قالب میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ انسان نہیں رہے گا۔ بعینہ اسلام کی روح اور قالب کا معاملہ ہے۔ اسلام کی روح اپنے قالب کے ساتھ اور قالب روح کے ساتھ زندہ و برقرار رہ سکتا ہے۔ انہیں نہ تو تقسیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ایک دوسرے سے جدا۔

جدید ٹکنالوجی کا جب سے چلن ہوا تمام مذاہب کے ماننے والوں میں یہ لاقناہی اور لا حاصل بحث چھڑ گئی ہے کہ مذہب جدید سائنسی ترقی کیساتھ مطابقت رکھتا ہے یا عدم مطابقت۔ اگر سچائی ایک ہے تو صحیح اور دھوکا معنی میں کوئی سچا مذہب سچے علم کیساتھ کبھی متصادم نہیں ہو سکتا۔ یہ حوالی صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جدید سائنس اخلاقاً غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ اس کا ارتقاء مادہ پرستانہ فلسفے کے زیر اثر اور سرپرستی میں اس کے اہم ترین حاصل اور سب سے طاقتور ہتھیار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ عصر جدید کے مسلمان اہل علم کا ایک نہایت ضروری فرض یہ ہے کہ وہ حقیقی، مفید اور تعمیری علم کو فرضی علم، مادہ پرستانہ نظریے اور



قیاس سے الگ الگ کر کے بتائیں۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا مجتہد یا مہدی اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہم کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی فراست، سیاسی تدبیر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جھادے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا (ص ۵۲-۵۳)۔۔۔۔۔۔ میں نے یہ بات جو کہی ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈولے گا، کوٹ پتلون پہنے گا اور اپ ٹوڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانے میں بھی پیدا ہوگا اُس زمانے کے علوم سے، حالات سے اور ضروریات سے پوری طرح واقف ہوگا اور ان تمام آلات و وسائل سے کام لے گا جو اس کے دور میں سائنٹفک تحقیقات سے دریافت ہوتے ہوں۔ یہ تو ایک مرئی عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی جماعت کے حصول مقصد اور کسی تحریک کے غلبہ کا فطری راستہ ہی یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو قابو میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم و فنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے۔۔۔۔۔۔ (ص ۱۷۰-۱۷۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف ایک چارہ کار رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم اپنے دشمن سے دست و گریباں ہو جائیں اور اپنی ساری قوت سمیٹ کر اُس سے بھڑ جائیں۔ نیز یہ کہ ہمارے پاس اپنے دشمن سے جنگ لڑنے کے لیے مؤثر ہتھیار ہونے چاہئیں، لیکن ایک بات سے متنبہ رہنا چاہیے۔ جدیدیت کے ساتھ دست و گریباں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس سے لڑنا ہے مصالحت کرنا نہیں۔ اپنی اس نظریاتی و نفسیاتی جنگ کے دوران میں ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک بار اگر ہم نے کسی مصلحت کے تحت

۱۔ تجدید و احیائے دین۔ ۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

اپنے دشمن سے مصالحت کر لی اور اس کے ساتھ تشبہ اختیار کر لیا تو ہم ویسے ہی کافر ہو جائیں گے جیسے ہمارا دشمن ہے۔ پھر ہمارے لیے اپنی جہد و جدوجہد جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ رہے گا۔

• باخدا مسلک بے خدا قیادت کے تحت زندہ نہیں رہ سکتا۔ بنا بریں باخدا انسانوں پر واجب ہے کہ وہ دنیا میں باخدا قیادت قائم کریں۔۔۔۔۔ مسلمان مفاد پرستانہ مقاصد کے لیے قیادت نہیں چاہتے۔ مادہ پرستوں کے ساتھ ان کی لڑائی اس لیے نہیں ہے کہ وہ انہیں قیادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمان، اصولوں کی بنیاد پر دوبارہ قیادت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ مادہ پرست، دنیا کر بد اعمال اور اپنے خالق کی مخالفت کھلی بغاوت کی طرف لے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس بے خدا تہذیب و ثقافت کے ماحول میں زندگی کے باخدا نظریہ، اس کے مقاصد اور اصولوں کا لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس لیے کہ (جدید) زندگی کا سارا رجحان کیسے ان کی مخالفت ہے۔۔۔۔۔ مسلمان اس نظریہ اور عمل کے مخالف ہیں اور ایک ایسا باخدا گروہ ہیں جو اپنے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایمان مسلمانوں کو نہ صرف مغرب کے مادہ پرستانہ مسلک سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے بلکہ دنیا کو اس مراۃ مستقیم کے دکھانے کا فرض بھی عاید کرتا ہے جس پر وہ خود چل رہے ہیں۔ اس فرض کو مسلمان اُس وقت تک کامیابی سے ادا نہیں کر سکتے جب تک وہ دنیا کی قیادت کو مادہ پرستوں کے ہاتھ سے دوبارہ نہ چھین لیں۔

---

Islamic Ideology and its Impact on Our Times,  
Mahmud Brelvi, published by the author, Karachi,  
1967, pp. 14-15.



## زیر نامہ "نوائے وقت" درجہ

جمعرات ۲ نومبر ۱۹۶۷ء

### "پاسبانِ مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

زیر نظر کتاب "اسلام ان تصوری اینڈ پریکٹس" (اسلام ایک نظریہ - ایک تحریک) کی فاضل مولفہ پریمی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ ایک امریکی یہودی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ مطالعہ نے دل و دماغ کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔ اسلام قبول کر کے پاکستان تشریف لے آئیں اور اب اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں اسلام کی قلمی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہیں۔ زیر نظر کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہی "یہودیت سے اسلام تک" ہے۔ یہ ذہنی اور روحانی سفر کی مختصر لیکن خیال افروز داستان ہے۔ "اسلام ایک نظریہ - ایک تحریک" میں تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اپنے قبول اسلام کے ساتھ فاضل مولفہ نے مسیحی لادینیت کا اسلامی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور دنیائے اسلام کے بانیوں میں ان غلط فہمیوں اور کج بیانیوں پر بحث کی گئی ہے جو مغرب میں عام ہیں۔ دوسرے حصے میں صحبت و صفائی، آداب و اخلاق، عرب ثقافت، فنونِ لطیفہ، خواتین معاشرتی تقاضوں کے بائے میں اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ تیسرا حصہ عام اسلام کی ان سرکردہ شخصیات کے تذکرہ اور نقد و تبصرہ پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے مختلف ادوار میں عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ اس فہرست میں محمد بن عبد الوہاب، سنوسی تحریک، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، سعید حلیم پاشا، جمال الدین افغانی، سید محمد رشید رضا، شیخ حسن البنا، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت اسلامی مثال ہیں۔ اس حصے کے بعض مندرجات اور نتائج کے بعض یہودیوں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مصنفہ نے اپنی بات اخلاص اور پورے زور سے کہی ہے۔ کتاب بہ حثیت مجموعی تحقیقی اور خیال افروز ہے اور سرپرستی کی مستحق ہے۔

مندکورہ بالا تبصرے کے علاوہ اندرون ملک اور بیرون ملک کے ممتاز انگریزی

اور اردو روزناموں، ماہوار اور ہفتہ وار رسالوں میں اس کتاب پر بہترین تبصرے ہوئے ہیں۔

اسلام

ایک نظریہ — ایک تحریک

تصنیف

مریم حمید

مترجم

آباد شاہ پوری ایم اے

مکتبہ یوسفیہ

سنت نگر — لاہور